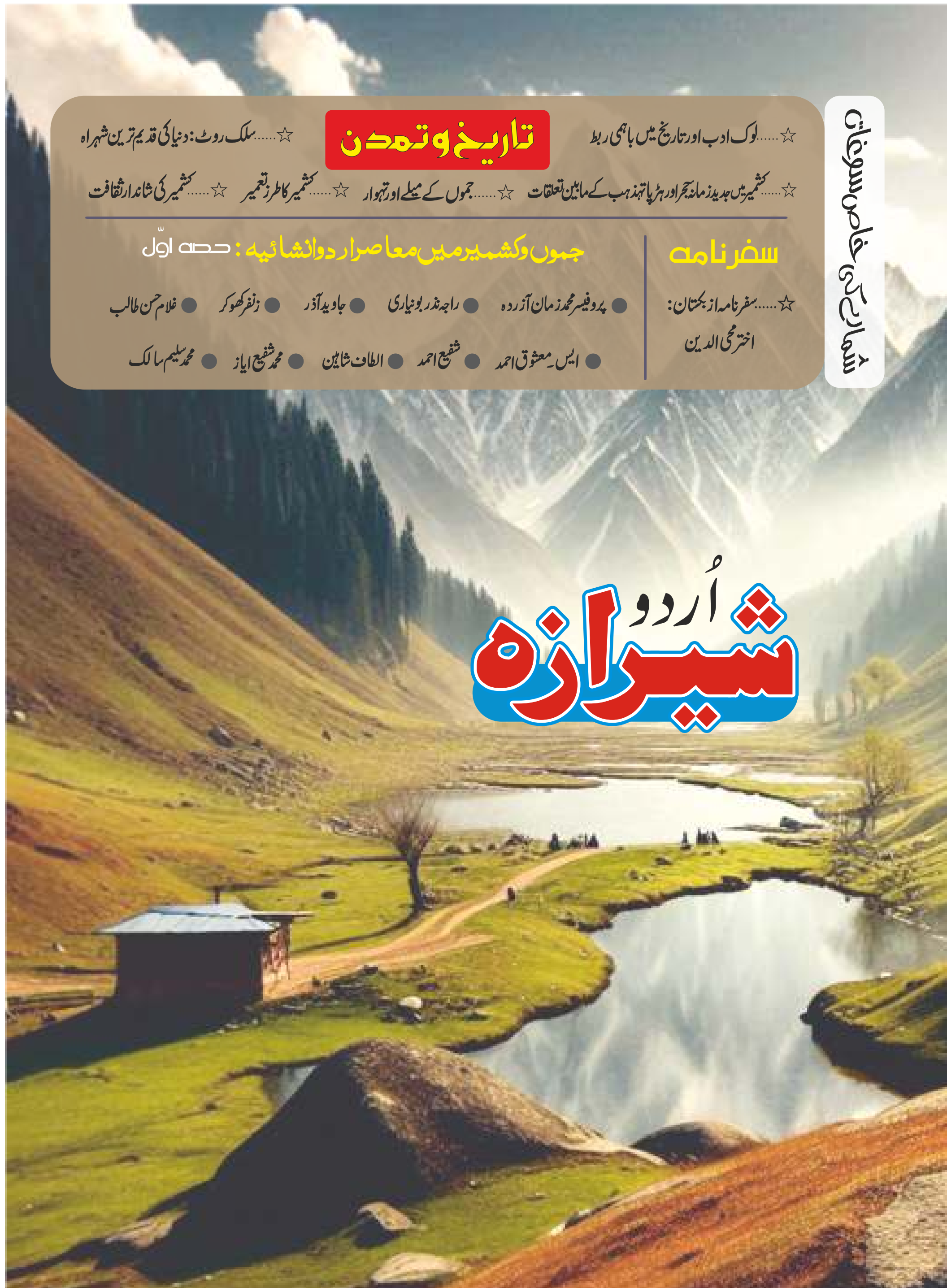


شمارے کی خاص سوغات

تاریخ وتمدن

☆......لوک ادب اور تاریخ میں باہمی ربط ☆......سلک روٹ: دنیا کی قدیم ترین شہراہ

☆......کشمیر میں جدید زمانہ حجر اور ہڑپا تہذہب کے مابین تعلقات ☆......جموں کے میلے اور تہوار ☆......کشمیر کا طرز تعمیر ☆......کشمیر کی شاندار ثقافت

سفرنامہ

☆......سفرنامہ از بلتستان: اختر محی الدین

جموں وکشمیر میں معاصر اردو انشائیہ: حصہ اوّل

● پروفیسر محمد زمان آزردہ ● راجہ نذر بونیاری ● جاوید آذر ● زنفر کھوکر ● غلام حسن طالب

● ایس۔ معشوق احمد ● شفیع احمد ● الطاف شاہین ● محمد شفیع ایاز ● محمد سلیم سالک

اُردو شیرازہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

شیرازہ اُردو

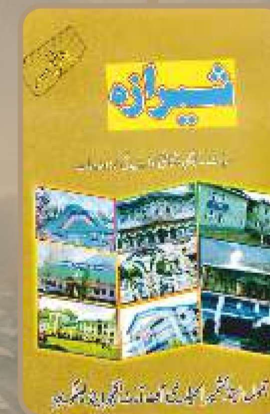
Volume: 62 Number: 5 - 6 (May - June, 2024)

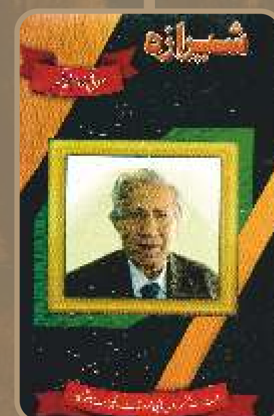
ISSN: 2277-9833

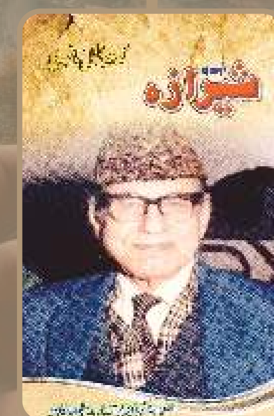
Urdu Sheeraza

Volume: 62
Number: 5 - 6
(May June, 2024)









Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نِگراں : بھرت سنگھ منہاس

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : ڈاکٹر محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق:......امتیاز احمد شرقی، محمد انور لولابی
پبلیکیشن آفیسر: ڈاکٹر شاذیہ بشیر، معاونین: شبیر احمد میر، طاہر سلطان
سال اشاعت: جلد؛ 62، شمارہ: 6-5 (مئی / جون 2024)
ISSN نمبر: 2277-9833
قیمت: 100 روپئے

''شیرازہ'' میں جو مواد شامل کیا جاتا ہے اُس میں ظاہر کی گئی آرا سے اکیڈمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔ (ادارہ)

●...... خط وکتابت کا پتہ:
مدیر ''شیرازہ'' اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر / جموں
ای میل: sherazaurdu@gmail.com

فہرست

●●●

گفتگو بند نہ ہو!

جب بھی اردو زبان وادب کے متعلق کوئی تذکرہ کیا جاتا ہے تو چند اصنافِ ادب کو ہی ملحوظِ نظر رکھا جاتا ہے۔ شاعری کے تناظر میں ''غزل اور نظم'' اور نثر کے حوالے سے ''افسانہ، ڈراما اور ناول'' قابلِ ذکر اصناف سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس غیر افسانوی ادب کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ غیر افسانوی ادب تخلیق کرنے والوں کے ساتھ ایک بڑی زیادتی ہے۔ ''غیر افسانوی ادب'' کی وسیع اصطلاح میں کئی اصنافِ ادب شامل ہیں جن میں انشائیہ، خاکہ، طنز و مزاح، کالم، سوانح نگاری اور سفرنامے شامل ہیں۔ غیر افسانوی ادب کو برابری کا درجہ دینے کی ایک کوشش کے طور، حال ہی میں کلچرل اکادمی نے شیرازہ اردو کے دو خصوصی شمارے ''سفرنامہ نمبر اوّل اور سفرنامہ نمبر دوئم'' شائع کئے جن میں جموں وکشمیر کے ادیبوں کے سفرنامے شامل ہیں جو انہوں نے بیرون ملک اسفار کرنے کے بعد تحریر کئے ہیں۔ قارئین نے اس سلسلے کو بہت پسند کیا اور ساتھ ہی دیگر غیر افسانوی اصناف پر بھی خصوصی نمبر شائع کرنے کی ترغیب دی۔ فی الحال سفرنامے کے بعد ''جموں وکشمیر میں معاصر اردو انشائیہ'' کے حوالے سے شیرازہ کے تازہ شمارے میں ایک خصوصی گوشہ ترتیب دیا گیا ہے جس میں جموں وکشمیر کے معاصر انشائیہ نگاروں کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ہماری کوشش رہے گی کہ مزید انشائیہ نگاروں کی تلاش جاری وساری رہے تاکہ آئندہ شمارے میں ان کو بھی اس سلسلے کے تحت مناسب جگہ دی جائے۔

انشائیہ نگاری کے فن پر انگریزی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جبکہ اردو میں

بھی کچھ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں اردو انشائیہ نگاری کے موضوع کو سمیٹتے ہوئے انشائیوں کے کئی انتخاب بھی منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ مزید براں کچھ ناقدینِ فن نے انشائیہ نگاری کے اصول وضوابط پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے صنفِ انشائیہ کے حدود اربعہ کا تعین کر کے اس صنف میں قلم آزمائی کرنے والوں کی راہیں استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشائیہ نگار کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ لفظ ومعنی کا نبض شناس ہو، موضوع کو برمحل ہدف بنانے کے ہنر سے واقف ہو اور اندرونِ ذات کی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحت بھی رکھتا ہو۔ یہ ضروری فنی اوصاف ہوں تو ایک کامیاب انشائیہ نگار بننے کی راہیں خود بخود روشن ہو جائیں گی۔ ایک انشائیہ نگار کی دیگر خوبیوں کی وضاحت نیاز فتح پوری کے اس اقتباس سے ہوتی ہے:

''اس فنِ لطیف کا تعلق صرف سلاستِ زبان سے نہیں بلکہ تخیلِ شاعرانہ اور شعورِ ناقدانہ سے ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی سے بھی، اس کے لئے نہ صرف اعلیٰ درجہ کی ژرف درکار ہے جو صرف وسیع مطالعے اور دقیق مشاہدے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے بلکہ فلسفیانہ اندازِ تفکر، جدت و اختراع یعنی Original Thinking بھی ضروری ہے جو ایک فطین وذہین دماغ، متوازن وسلیم طبیعت اور ایک کشادہ وپاکیزہ قلب ہی کو میسر آتی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ سادہ زبان اور شگفتہ ودل نشین اندازِ بیان ہو۔''

جہاں تک جموں وکشمیر میں معاصر انشائیہ نگاری کی تاریخ کا تعلق ہے، اس میں یہ بات دلچسپی سے تعلق رکھتی ہے کہ یہاں کے اکثر نثر نگاروں نے انشائیہ لکھے ہیں جو وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن بحیثیت انشائیہ نگار اردو حلقوں میں نام کمانے والی پہلی شخصیت پروفیسر محمد زمان آزردہ صاحب ہیں، جنہوں نے انشائیہ کے اسرار ورموز سمجھ کر اعلیٰ اور معیاری درجے کے انشائیے لکھے ہیں۔

موصوف کے انشائیوں کے کئی مجموعے اردو کے سنجیدہ حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے بعد کئی ایسے معتبر انشائیہ نگار سامنے آئے ہیں جنہوں نے اس میدان میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا ہے۔ حال ہی میں نامور کالم نویس، معروف افسانہ نگار اور معتبر انشائیہ نگار راجہ نذر بونیاری کا 20 فروری 2024 کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ انہوں نے وفات سے قبل ہمیں کئی انشائیے اشاعت کے لئے بھیجے تھے۔ شومئی قسمت کہ مرحوم زیر ترتیب شمارہ کی اشاعت نہ دیکھ سکے۔ مرحوم کو ممبئی میں آسودہ خاک کیا گیا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (آمین)

''تاریخ وتمدن'' کا سلسلے جاری رکھتے ہوئے تازہ شمارہ میں ''کشمیر میں جدید زمانہ حجر اور ہڑپا تہذیب کے مابین تعلقات: آثار قدیمہ کی ایک نئی دریافت'' شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا نادر و نایاب موضوع ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مذکورہ مضمون سے آثار قدیمہ کے تناظر میں کشمیر کی قدیم تاریخ سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ ہماری یہ کوشش رہتی ہے کہ اُن مضامین کو ترجیحی طور پر شامل کیا جائے جن سے کشمیر کی قدیم تاریخ کے پوشیدہ گوشے منظر عام پر آسکیں۔

ساتھ ہی تازہ شمارہ میں کشمیری زبان کے قدآور افسانہ نگار اختر محی الدین کے ''سفر نامۂ ازبکستان'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ امید ہے حسبِ سابق قارئین کرام اپنے زرین تاثرات سے ضرور نوازیں گے۔ یہ شمارہ ترتیب دینے میں سلیم ساغر (اسسٹنٹ ایڈیٹر)، ڈاکٹر محمد اقبال لون (ریسرچ اسسٹنٹ) اور امتیاز احمد شرقی (معاون) نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔

محمد سلیم سالک

مدیر ''شیرازہ اردو''

☆ ......پروفیسر غلام محمد شاؔد

لوک ادب اور تاریخ کا باہمی ربط

تاریخ قوموں کے سیاسی عروج و زوال، اقتصادی یا طبقاتی کش مکش اور مذہبی مناقشات کی داستان ہی نہیں بلکہ ان کی تہذیب و تمدن، معاشرت، قانون، سائنس، علوم و فنون، ادب اور آرٹ اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے احساسات، جذبات، خیالات، رجحانات گفتار اور کردار کی امانت دار اور آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ تاریخ تقریباً ہر ممکن حد تک اُس ہر چیز اور خیال کی ہو بہو عکاسی کرتی ہے جس سے انسان کسی بھی طرح بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوا ہے۔ تاریخ اس بات کی بھی جانچ اور اندازہ کرتی ہے کہ کسی قوم نے اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں اور مختلف شعبوں میں کب، کس طرح اور کس حد تک ترقی کی طرف پیش قدمی کی اور اپنی حاصل کردہ ترقی سے دوسری قوموں پر کیا اثرات مرتب کئے۔

ایک طویل زمانے تک مورخ تاریخ کی متذکرہ بالا تشریح سے ناواقف تھے ، اور وہ اس کو صرف سیاسی واقعات کی کھتونی تصور کرتے رہے۔ قدیم مورخ ہیرو ڈوٹس (ولادت 484ق م) نے تاریخ نویسی میں سماجی اور اقتصادی پہلو تقریباً نظر انداز ہی کئے۔ انیسویں صدی عیسوی کے ایک یورپی مورخ فری مین نے تاریخ کو سیاست ماضیہ کا نام دیا۔ کچھ لوگوں نے تاریخ کو افراد کے کارناموں کی داستان یا انسانی سماج کے داشت اور نداشت کے درمیان کش مکش کی کہانی تصور کیا۔ دنیا کے سب سے پہلے فلسفی مورخ عبدالرحمٰن ابن خلدون (1406-1332) نے ایسے تمام

خیالات کی سائیٹفک طور پر تردید کرتے ہوئے تاریخ کی جامع اور واضح تشریح دنیا کے سامنے پیش کردی۔ سب سے پہلے اس نے تاریخ کو سائینس کا نام دیا۔ اس کے مطابق:

''تاریخ ایک طرف ظاہر میں محض گذشتہ ایام اور سابق دولتوں (سیاسی نظاموں) کے حالات ہمارے سامنے لاتی ہے اور ہمیں یہ بتاتی ہے کہ بدلتے ہوئے حالاتِ زمانہ نے مخلوقات عالم کو کس طرح پیہم انقلاب اور ردو بدل میں رکھا اور کس طرح حکومتیں سیٹیں اور بڑھیں تو دوسری طرف باطن میں تاریخ اپنے اندر ایک وسیع ترین تحقیقی نظریہ بھی رکھتی ہے۔ یعنی کائنات کے علل اور ان کے دقیق مبادی کو سامنے لاتی ہے۔ واقعات کے اسلوب کا علم بخشتی ہے اور اُن کے گہرے اسباب اور وجوہات کو آشکار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنون وحکمت میں وہ بھی اپنا ایک مقام اور مرتبہ رکھتی ہے اور اس لائق ہے کہ سائنس کے علوم میں اس کا شمار ہو۔''

تاریخ کی یہ وضاحت ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اس بات کی طرف رجوع کریں گے کہ تاریخ کے ساتھ ''لوک ادب'' کا کیا رشتہ ہے۔ ہمارا موضوع ایک وسیع موضوع ہے اور اس مضمون میں ہم تاریخ اور لوک ادب کے باہمی رشتہ کا ایک جائزہ لیں گے اور اپنے خیالات کو کسی خاص ملک یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں رکھیں گے۔ اپنی جامعیت کے لحاظ سے موضوع کا ہم سے یہی تقاضا ہے۔ ورنہ ہم اپنے آپ کو صرف کشمیر تک ہی محدود رکھ سکتے تھے (اور وہ ہمارے لئے آسان بھی تھا)۔

تاریخ کے کچھ ماخذ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی ملک یا قوم کی تاریخ کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ ان ماخذ کو ہم خام مسالہ بھی کہہ سکتے ہیں جس کے بغیر کوئی بھی تاریخ مرتب نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ ابتدائی بنیادیں فرد اور مجموعی طور پر انسان اور دوسرے چند

امور فراہم کرتے ہیں۔ یہ بنیادیں بُعد زمانی کے باوجود یکساں بھی ہوسکتی ہیں اور مختلف بھی۔ اور ان میں ٹھوس حقائق کے ساتھ ساتھ فرضی کہانیاں، فوق الفطرت عناصر اور اشخاص کے مبالغہ آمیز قصے اور توہمات کے انبار بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ ہمیں تحریری، تصویری، تعمیری صورتوں میں اور زبانی روایات کی صورت میں بھی ملتی ہیں۔ باقی صورتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم زبانی روایات اور تحریری صورت ہی کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھیں گے کیونکہ ہمارے مضمون کا موضوع ان ہی تک محدود ہے اور عرف عام کی اصطلاح میں ان ہی دو صورتوں میں مختلف ملکوں کے ادبیات اور ادب پارے ہمارے پاس پہنچے ہیں۔

فنون لطیفہ کا ذوق انسان کی سرشت میں ہے اور انسان کو اس کا اصلی سرمایہ قدرت کی طرف سے ملا ہے۔ یہ ذوق اگرچہ بہت حد تک تہذیب کی پیدا کی ہوئی خصوصیت نہیں ہے۔ لیکن اس ذوق (فنون لطیفہ) کی تخلیق اور اس کی نشو ونما ایک سماج ہی میں سلجھے ہوئے حد تک ممکن ہے۔ سماج یا مہذب سماج کے لئے (مبادی حد تک) فطرت کا جنم، ادب وفن کی جان کاری ایک اخلاقی ضابطہ حیات، ایک سیاسی نظام اور کسی حد تک اقتصادی آسودگی اہم ضرورتیں ہیں کیونکہ تہذیب یا مہذب سماج کی بقا اور ترقی اسی صورت میں ممکن ہوئی ہوگی جب لاقانونیت کم ہوگئی ہو اور انسان کی جان اور مال کو مناسب حد تک تحفظ ملا ہوگا۔ جب انسان پر خوف کا غلبہ کم ہونے لگا ہو گا، تو قدرتی طور پر اس کا ذوق تجسس اور تو اس کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتیں اُجاگر ہونے لگی ہوں گی۔ اس کے ساتھ ہی منطقی طور پر انسان نے زندگی کو سمجھنے اور حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری فکری صلاحیتیں اور قوتیں لگا دیں۔ مختصر الفاظ میں تہذیب سے مراد ہے انسان کا اپنی اخلاقی اور ذہنی قوتوں کو تربیت دے کر انہیں بروئے کار لانا۔ لہذا جب تک کسی ملک یا قوم کی سیاست کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب کا بھی مطالعہ نہ کیا

جائے ،اس ملک یا قوم کی صحیح تاریخ مرتب نہیں ہوسکتی ہے۔انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا میں دنیا کی ہر قوم اپنا حصہ کم یا زیادہ ادا کرتی رہی ہے اوراس طرح انسانی تہذیب کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور رہے گا جس کا ثمر تہذیب کی اعلیٰ قدریں ہیں۔ یہ قدریں ختم یا فنا نہیں ہوسکتی ہیں اور نہ ہو جاتی ہیں بلکہ ان کے محافظ اور وارث بدلتے رہتے ہیں۔

علم وادب اور فن کی تخلیق کے ذریعہ سے تہذیب وتمدن کی تعمیر میں دنیا کی ہر قوم نے اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ یہ علوم وفنون، جونوع انسانی کے خیالات، جذبات اور رجحانات کے مخزن ہوتے ہیں، نہ صرف عقل ودانش ہی سے مالا مال ہیں بلکہ ان میں بے ہودگیاں اور حماقتیں بھی بھری ہوتی ہیں۔اس وجہ سے ان علوم وفنون سے فائدہ پہنچنا خود ان علوم وفنون پر منحصر نہیں ہوگا بلکہ اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ان پر ہوش مندی اور دانائی کے ساتھ غور وفکر ہو اور ان کا انتخاب صحیح ادراک سے کیا جائے۔ علوم وفنون کی ایک اہم شاخ شعروشاعری اور نثری تخلیقات ہیں۔عربوں نے، جوشعرو شاعری کو باعزت اور نہایت ہی شریف کلام مانتے تھے، اسے اپنے علوم وتاریخ کا سرچشمہ بنایا اور اپنی تاریخ کے نشیب وفراز کا معیار اسی کو قرار دیا۔اپنے علوم اور فلسفہ اور تاریخ سازی میں وہ اشعار ہی کا حوالہ دیتے ہیں اور انھیں کو اصل ٹھہراتے ہیں۔ علوم وفنون کی اصلی بنیاد تو ''لوک ادب'' ہی کے خام مسالے پر تعمیر ہو جاتی ہے۔اور یہی ''لوک ادب'' تاریخ سازی میں بھی بہت ہی اہم اور بڑا اور کارآمد ماخذ ہے۔

لوک ادب کسی قوم یا ملک کی ایک نسل یا طبقے کی تخلیق نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کسی خاص یا ایک دور میں وجود میں آجاتا ہے۔ ہر ایک قوم،ایک ملک کے مختلف ماحول اور زبانوں کی پیداوار اور میراث ہوتا ہے۔ادب کی اس ذیل میں، جو بہت حد تک غیر تحریری صورتوں میں کسی قوم میں موجود ہوتا ہے، اس قوم کے توہمات اور

خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات، ان کے رہن سہن کے طریقے اور ان کی خواہشات موجود ہوتی ہیں۔ انہیں مآخذ کو کنگالتے کنگالتے ہم کسی قوم کی ابتدائی تاریخ، اس کی ترقی، عروج اور زوال اور اس قوم کے اجتماعی شعور کا خاکہ مرتب کرتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس قسم کے ادبی خزانے کس طرح وجود میں آئے، کسی قوم کی رفتار، ترقی کے قدیم ابتدائی عہد میں اور اس سے قبل کہ وہ قوم فنِ تحریر سے واقف ہوئی ہو، اس کو ایسے سامان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو امن وصلح کے دنوں میں اس کے اوقاتِ فرصت کا مشغلہ وتفریح اور جنگ جدل کے ایام میں اس کی شجاعت اور بہادری میں جوش پیدا کرنے والا ہو۔ یہ سامان اس کے گیتوں کی ایجاد سے میسر ہو جاتا ہے اور یہی گیت وہ ہیں جو کُل علمِ تاریخی کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ انھیں عام طور سے وہ لوگ گاتے ہیں جو پہلے مشغلے کے طور پر اور مرورِ ایام کے ساتھ عقیدت کے طور پر اس قدیم خزانے کو محفوظ رکھتے ہیں۔ دنیا میں شاید ایسی کوئی قوم ہو گی جس میں ایسے لوگ موجود نہیں رہے ہوں۔ ایسے ہی لوگوں نے یورپ، چین، تبت، تاتار، برصغیرِ ہندوستان، مغربی ایشیا، جزائرِ بحرِ اسود، مصر، مغربی افریقہ، امریکہ، جزائر بحرالکاہل وغیرہ کے ہر دل عزیز اور مقبول افسانہ ہائے قدیم کو محفوظ رکھا۔

ان سب ممالک میں بہت طویل زمانے تک فنِ تحریر سے کوئی آشنا نہیں تھا۔ چونکہ ایسی حالت میں کسی قوم کے پاس اپنی روایاتِ پسندیدہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے زبانی داستان گوئی کے بغیر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، لہذا وہ ایسے طریقے منتخب کرتے ہیں جو ان کے حافظے کو سب سے بڑھ کر مدد پہنچانے والے ہوں۔ اور اکثر قوموں کے بارے میں ہمارا اندازہ ہے کہ علم وتاریخ کی بنیاد سب سے پہلے شاعری اور اکثر اوقات قافیہ بندی سے پڑتی ہے۔ الفاظ کا زیروبم اور (اس طرح) آواز کا ترنم انسانی

سماعت کے لئے سرور بخش اور خوش کن ہوتا ہے اور انسان اطمینان کے ساتھ اسی خزانے کو بغیر کسی تبدیلی کے اسی حالت میں بطور وراثت چھوڑ جاتا ہے جس میں اس نے انہیں پایا یا تخلیق کیا تھا۔ جو بتدریج قومی عادت کی شکل اختیار کر کے اور پختہ بن جاتا ہے اور اس طرح مختلف قوموں نے تہذیب کے ارتقا تک پہنچنے کے جدا جدا راستے اپنائے اور اپنے الگ الگ معیارہ قائم کئے۔ اس طرح سے آب و ہوا، رسم ورواج، جغرافیائی حالات، افتادطبائع اور میلانات امزجہ کے اختلاف کی وجہ یہ گیت اور کہانیاں مختلف صورتیں اختیار کر گئیں۔ کئی ملکوں میں ان کی ہیت اور وضع وقطع زیادہ تر ذوق وشوق اور نفسانی خواہشات کو ہیجان میں لانے والی ہے اور کئی ملکوں میں وہ زیادہ تر دردناکی اور جنگ جوئی کی شان کا پہلو لیے ہوئی ہے۔ لیکن اس سب اختلاف کے باوجود اس طرح کے تمام تخلیق شدہ ادب میں ایک ایسی بھی شان ہوتی ہے جو سب میں مشترک ہوتی ہے۔ اور یہ بات تو حیران کن ہے کہ لوک ادب کے سرمایہ میں بہت سی قوموں کا شعور ایک ہی سمت میں سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے اختلافات کے باوجود قوموں کے لوک ادب کی ارتقائی منزلیں ایک جیسی رہی ہیں؟

لوک ادب کی دنیا میں ایک عام آدمی دنیا کے سارے انسانی سماج کا فرد بن جاتا ہے۔ لوک ادب کے نمونے نہ صرف یہ کہ وہ سب سچائی پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ شاعرانہ رنگ آمیزی کو الگ کر ڈالنے پر وہ سب بالکل صحیح اور درست ثابت ہوتے ہیں۔ وہ لوگ، جو اِن گیتوں کو بار بار گاتے ہیں یا لوک کہانیاں بار بار دہراتے ہیں اور جنھیں بار بار سنا کرتے ہیں، ان کی صحبت و واقعیت کا خیال ان کے دل میں ہر وقت ہوتا ہے۔ لہذا ایسے معاملات میں ان سے غلطی کا بہت کم احتمال ہوتا ہے۔ جن متعدد مدارج میں سے تاریخ کو گزرنا ضروری ہے ان میں یہ سب سے بڑھ کر آسان اور سادہ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ سماج آگے بڑھتا ہے اور باقی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ایک خاص

تبدیلی، جو بہت ہی اہم ہوتی ہے وہ فنِ تحریر کا آغاز ہے۔اور یہ تبدیلی قومی حالت میں ایک مکمل انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔

اب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ کسی قوم کی تاریخ اور تہذیب وتمدن کا جائزہ لیتے وقت اس قوم کی ان داخلی اور خارجی اقدار کو جانچنا ضروری ہے جو اس کی تہذیب کا سرمایہ ہیں۔ان اقدار میں سے فنون لطیفہ اور ادب بہت ہی اہم ہیں۔اگر چہ یہ کسی تہذیب کے چند ہی رخ دکھا سکتے ہیں، لیکن بیشتر قدیم تہذیبیں ایسی ہیں کہ جن کے اکثر آثار نہیں ملتے ہیں (اور جن کے حال اور مستقبل کی پیچیدگیاں لوک ادب کے بغیر حل نہیں ہوسکتی ہیں) ہم اُن تہذیبوں کی خصوصیات کا اندازہ ادب اور لوک ادب ہی سے کر سکتے ہیں۔لہذا تاریخ تہذیب وتمدن کو سمجھنے کے لئے لوک ادب کے سرمایہ کا مطالعہ نہایت ہی اہم اور ناگزیر ہے۔

ادب کے دیگر شعبوں کی طرح لوک ادب بھی اپنے پورے نشو ونما میں مختلف مراحل سے گزر کر ہمارے پاس پہنچا ہے اور یہ سب مراحل اپنے اپنے زمانے کی تہذیب وتمدن اور مجموعی طور پر تاریخ کی نمایندگی کرتے ہیں۔تاریخ کی بلند و بالا عمارت اکثر مواقع پر ''لوک ادب'' کے مسالے اور گارے سے ہی تعمیر ہوئی ہے۔ان دونوں کے باہمی ربط وارتباط کی دنیا کے لوک ادب میں سے ہزاروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم سرسری طور پر دنیا کے لوک ادب سے کچھ مثالیں لے کر یہ بات واضح کریں گے کہ کس طرح لوک ادب نے تاریخ سازی میں اہم اور نمایاں فریضہ انجام دیا ہے۔

پہلے ہم اپنے ملک کی تاریخ اور لوک ادب کے رشتہ کے بارے میں کچھ باتیں کریں گے۔آریوں کا قدیم ادبی سرمایہ ''رگ وید'' قدیم ہندوستانی یا مستند آریائی لوک ادب کی بہترین مثال ہے۔رگ وید کسی خاص آدمی یا دو تین اشخاص کی تصنیف

نہیں ہے۔ اس کو مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں تخلیق کیا۔ آریوں کا سماج مہذب سماج تھا۔ اُن کے ہاں گیت کہنے کا سلسلہ قدیم زمانے سے جاری تھا۔ نئے ملک میں آباد ہونے کی وجہ سے نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے، اس لئے خطرہ تھا کہ لوگ ان کو بھول جاتے۔ لہذا شمال مغربی ہندوستان میں آباد ہونے کے ساتھ ساتھ ہی آریوں نے ان گیتوں کو یکجا کر دیا۔ اسی مجموعے کا نام رگ وید سمبتھا'' رکھا گیا۔ اس کے دس حصوں میں ایک ہزار سترہ گیت ہیں۔ قدیم آریوں کی سماجی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کے بارے میں ابتدائی تاریخ کا خاکہ اسی ''رگ وید'' سے مرتب کیا گیا اور اب بھی نئے نئے زاویوں سے ان گیتوں کی تشریح سے قدیم آرین تہذیب کے نئے گوشے بے نقاب ہو جو کر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ گویا لوک ادب کا یہ قدیم خزانہ دنیا کی ایک بہت بڑی اور عظیم قوم کی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں آریوں کے مذہبی خیالات، اُن کی جدوجہد کے زمانے کے رجحانات، قربانیاں اور تہوار، نوشانوش کی مجلسوں کے طرب انگیز واقعات کے علاوہ اور بھی بہت سی معلومات افزا باتیں ملتی ہیں۔ ایک گیت کے چند شلوکوں میں ایک وئید کو جڑی بوٹیوں سے گفتگو کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وئید، پرمات اور نجار (بڑھئی) لوگوں کی نکتہ چینی کی گئی ہے کہ وہ سرمایہ دار خریداروں کی تلاش کرتے رہتے ہیں اور ان کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ایک شلوک سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ قدیم آریہ، ذات پات سے بالکل بے خبر تھے۔ (اگرچہ رگ وید میں ''پُرش سوکت'' کے نام سے بھی ایک گیت موجود ہے جس سے ذات پات کو ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن محققوں نے اسے الحاقی قرار دیا ہے) وہ شلوک یوں ہے:۔

میں کوی ہوں، میرا پتا وئید ہے۔

اور میری ماتا (چکی پر) آٹا پیستی ہے اور ہم سب اپنی اِچھا کے انوسار

روزی کمانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں اور جانوروں کی طرح مساوی

طور پر سنکٹ اُٹھاتے ہیں۔"

قصے، کہانیاں اور لوک گیت:

ہندوستان میں عوامی کہانیوں، حکایتوں اور لوک گیتوں کا عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ اس معاملے میں ہمارا ملک دوسرے ممالک سے نسبتاً آگے ہے۔ عوام میں جو حکایتیں مقبول ہوگئیں ان میں مہا بھارتی اور رامائن کے علاوہ جاٹکوں کی کہانیاں، برہت کتھا، پنچ تنتر اور ہتو پدیش بہت مشہور ہیں۔ یہ کہانیاں اور گیت ہم عصر دور کی معاشرتی، اقتصادی اور سماجی حالات پر معلومات کا ایک بے کراں خزانہ ہیں۔ ان میں سے کچھ کہانیاں تو اتنی مشہور اور مقبول ہوگئیں کہ دنیا کی مختلف قوموں نے ان کو اپنے ادب اور تاریخ کا جز و بنا دیا۔ اور اس طرح سے یہ کہانیاں اور حکایات بین الاقوامی وراثت بن گئیں۔ داستان نویسی کی یہ روایت آنے والے زمانوں میں بھی جاری رہی۔ بودھوں اور ہندوؤں نے (اور مسلمانوں نے بھی) روایتوں کے ان ہی مشترکہ خزانوں سے فائدہ اُٹھایا بعد کے سنسکرت اور پراکرت زبانوں کے اکثر لوک گیت اور لوک قصے کے اسی بنیاد یا بنائے گئے۔

ہندوستان کے عام لوک ادب کا مفصل ذکر کرنے سے پہلے ہم ذرا مذہبی قسم کے لوک ادب کا ذکر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ یہ لوک ادب ہندوستان کی قدیم رزمیہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ ہیں مہا بھارت اور رامائن۔ جو آج ہندوؤں کی مذہبی کتا میں ہیں۔ ان کا اصلی مقصد لوگوں کو مذہبی ہدایات دینا نہیں تھا۔ یہ تو میدان جنگ میں ڈٹے ہوئے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے بیان کی جاتی تھیں۔ ان داستانوں کا کوئی ایک مصنف نہیں ہے نہ ہی یہ کسی ایک وقت میں مرتب ہوئیں۔ دونوں کہانیاں جنگی کارناموں کا مجموعہ ہیں۔ جو بھاٹ اور نقال لوگ شاہی

درباروں میں حرکات وسکنات کی پابندی کے ساتھ سُنایا کرتے تھے۔ مہابھارت مختلف دوروں کے عقائد اور خیالات کی کھچڑی ہے۔ اس کی ایک مثال درو پدری کا پانچوں پانڈو بھائیوں کی بیوی ہونا ہے۔ اگرچہ یہ رسم آریوں کے عقیدے کے خلاف تھی۔ رامائن اگرچہ ایک ہی کہانی ہے لیکن پھر بھی یہ ایک وقت پر نہیں لکھی گئی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں مذہبی کتابوں کی صورت میں مرتب ہو گئیں۔ اور مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا ذریعہ بن گئیں۔ اس طرح قصے، کہانی اور تاریخ کی مدد سے زندگی کا ایک دستور اور سانچہ تیار کیا گیا جس پر آنے والی نسلوں کی زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی۔ لوک ادب کا سماج پر اور تاریخ پر اس سے زیادہ مضبوط اور دیرپا اثر شاید ہی کہیں اور کسی ملک یا قوم پر ہوا ہو۔

جاتک کہانیاں:

گوتم بدھ نے جن کہانیوں کو اپنے وعظوں میں استعمال کیا، جاتک کہانیاں کہلاتی ہیں۔ یہ گوتم بدھ سے پہلے موجود تھیں۔ لیکن گوتم نے اپنے مقصد کو سمجھانے کے لئے ان کو استعمال کیا۔ ان کی تعداد ساڑھے پانچ سو کے قریب ہے۔ ہر کہانی پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ جو گوتم کی زندگی اور ان سے متعلق ہیں۔ گوتم کے زمانہ کی ایک کہانی اس طرح ہے:-

> ''چند نوجوان ایک دفعہ شہر سے باہر سیر وتفریح کی غرض سے گئے۔ ایک کے سوا سب کے ساتھ ان کی بیویاں تھیں۔ اکیلے دوست کے لئے شہر میں سے ایک طوائف کو کرایہ دے کر ساتھ لایا گیا۔ اتفاق سے یہ طوائف چور بھی تھی۔ جب یہ سب لوگ کھیل وتفریح میں مشغول ہو گئے تو طوائف ان کا سب سامان اڑا کر چمپت ہو گئی۔ پتہ لگ جانے پر سب نوجوان اس کی تلاش میں نکلے۔ ہر ایک سے برملا اپنی داستان بتا کر طوائف کے بارے

میں پوچھتے انھیں راستے میں گوتم بدھ بھی ملا۔اس سے بھی اُنھوں نے بغیر کسی تردد کے پوچھا۔''

یہ مختصرسی کہانی گوتم کے زمانے کے سماج کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ذرا دیکھئے کہ تاریخ کس طرح بنتی ہے۔

(۱)لوگ سیر وتفریح کے دلدادہ تھے۔

(۲)اپنے شہر سے باہر بھی جاتے تھے۔

(۳)سیر وتفریح کا ذوق اور شوق موجود تھا۔

(۴)لوگ پارٹی کے طور پر یک تیک منایا کرتے تھے۔

(۵)اپنی بیویاں ساتھ لیتے تھے۔

(۶)قدرتی امر ہے کہ پردے کا رواج نہیں رہا ہوگا؟

(۷)سماج میں طوائفیں بھی موجود تھیں۔

(۸)وہ''کال گرل'' کا کام بھی انجام دیتی تھیں۔

(۹)اُن سے ملنا جلنا یا اُنھیں ساتھ لے جانا معیوب نہیں تھا۔

(۱۰)سماج میں چوری،ٹھگی یا ڈکیتی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔

(۱۱)چور کبھی ہاتھ لگتا تھا اور اکثر ہمارے سماج کی طرح ہاتھ نہیں آتا تھا۔

دیکھئے کس طرح ایک سماج کی تصویر ہماری آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے اور کسی حد تک یہ ہمارے سماج سے مشابہ ہے۔جاتکوں کی کہانیوں میں اگر چہ کہیں بھی نسوانی کروپ میں نہیں دکھایا گیا ہے۔لیکن ان میں ایک وفادار عورت کی کہانی بھی ہے جس کا نام آمر تھا اور جس کا شوہر کہیں دور سفر پر گیا تھا۔شوہر کی غیر حاضری میں اوباش اور من چلے لوگوں نے آمر کو ستانا شروع کیا اواُسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہا لیکن اس نے بڑی چالاکی سے اُن کو ٹوکریوں میں بند کر کے راجا کے دربار میں لایا اور

راجا کے سامنے ان کو ایک ایک کر کے باہر نکالا۔ اس طرح سے اس نے اپنی عصمت بھی بچالی اور آوباشوں کو سرِ عام رسوا بھی کیا۔ یہ کہانی اپنے ہم عصر سماج کی کس حد تک عکاسی کرتی ہے، اس کا اندازہ آپ آسانی سے لگا سکتے ہیں۔

سنسکرت لوک ادب کے علاوہ دراوڑی زبانوں کا لوک ادب علاحدہ ہے۔ ان زبانوں میں تامل زبان بہت ہی قدیم ہے اور اس کا لوک ادب بھی قدیم ترین مانا جاتا ہے۔ اس کے لوک ادب کی سب سے قدیم دستاویزات ''تین سنگموں'' سے تعلق رکھتی ہیں۔ ''سنگم''، علمی اور ادبی مجلسوں کو کہتے تھے۔ ان کا زمانہ 500 ق م سے 500 عیسوی تک مانا جاتا ہے۔ ان میں شاعری کی مختلف بیاضیں ہیں، جو اپنے زمانہ کے ادب، سماج، اور سیاست پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کے کچھ حصے رزمیوں پر مشتمل ہیں جن ہیں ''سلپّاڈ کارَم'' اور ''منی میکھلئی" زیادہ مشہور ہیں، جو مہا بھارت اور رامائن کے ہم پلہ مانی جاتی ہیں۔ ''سلپّاڈ کارَم'' کے معنی ہیں، پائل یا پازیب! کہانی کا ہیرو ''کوولن'' ایک بیسوا مادھوی نامی کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنی ساری دولت اُڑاتا ہے۔ لیکن ہوش آنے پر وہ اپنی وفادار اور باعصمت بیوی، کنگی کے پاس واپس آتا ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں مدورا کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر کوولن اپنی کنگی کا آخری زیور پازیوں کی جوڑی فروخت کر کے کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک پازیب لے کر دور کے شاہی سنار کے پاس لے جاتا ہے۔ سنار نے اسی جیسا ایک پازیب راجا کا کبھی چرا رکھا ہے۔ اب یہ پازیب دیکھ کر سنار کوولن پر چوری کا الزام عائد کر کے اسے راجہ کے دربار سے بلا کسی تحقیقات کے سزائے موت دلواتا ہے۔ اس کی پریشان حال بیوی اپنے شوہر کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے دوسرا پازیب بادشاہ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ راجہ شرم وندامت کے احساس سے پریشان ہو کر خود کشی کرتا ہے۔ اس کے بعد کنگی مدورا شہر کے حق میں بددعا کرتی ہے جس کے نتیجے میں

سارا شہر عذاب خداوندی سے جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ کنگی آسمانوں پر جا کر اپنے خاوند سے مل جاتی ہے۔ کنگی کو عفت اور عصمت کی دیوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرا رزمیہ پہلے کا تتمہ ہے اور اسی زمانے کی تخلیق ہے۔ اس کی ہیروئن "منی میکھلئی" کوولن کی وہ لڑکی ہے جو مادھوی بیسوا کے بطن سے پیدا ہوئی۔ وہ کنگی سے سبق لیتی ہے اور بہت سی مصیبتیں جھیل کر آخر میں بدھ بھکشی بن جاتی ہے۔

قدیم تمدنی مرکز میسوپوٹامیہ (عراق)

حضرت عیسی علیہ السلام سے چار ہزار سال قبل سومیری (SUM) قوم کے تمدن کی ابتدا عراق کے جنوبی علاقے میں ہوئی۔ اس قوم کی اساطیر (یا لوک ادب) میں نباتات کے دیوتا، تاموز (TAMMUZ) کا قصہ بہت ہی مشہور تھا۔ جب تاموز وفات پا گیا۔ تو اس کی زوجہ (یامان؟) اشتار "(ISHTAR) بہت روئی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ مہابھارت میں درج ''ساوتری'' اور ''ستیہ وان'' کا قصہ بالکل ایسا ہی ہے جس میں ساوتری اپنے شوہر ستیہ وان کے مرنے کے بعد ''یم دیوتا'' کا تعاقب کرتی ہے اور آخر کار ''یم دیوتا'' تنگ آ کر ساوتری کو اس کے شوہر ستیہ وان کی روح واپس کرتا ہے اور اس طرح وہ زندہ ہوتا ہے۔ تاموز کا یہی قصہ دوسری قوموں میں مختلف ناموں سے پھیل گیا۔ ایشیائے کوچک میں سائبلی اور ایٹس ''CYBELE & AYTS'' کے نام سے، یونان میں ''دیمی تیر'' اور ''پرسی فون''، روم میں '' وینس اور اڈونس''، مصر میں ''اوسائیرس'' اور اُس کے بھائی ''سیت''۔ اوسائیرس کے بیٹے ''ہورس'' اور اوسائیرس کی بیوی ''آئی سس'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ رومی شاعر اووڑ (OVID) سے لے کر شیکسپئر تک بہت سے شاعروں نے اس لوک کہانی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

بابل کی تہذیب وتمدن کی تاریخ بھی بہت حد تک اساطیری (لوک) ادب

کی مرہونِ منت ہے۔ یہ اساطیر بہت بعد کے زمانے میں ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ بابل کے (فرضی) بادشاہ گلگا میش کا رزمیہ اس زمانے کے نظریہ حیات، سماجی اور مذہبی حالت کا اچھا مرقع ہے۔ بابل کی ایک ایسی ہی لوک کتھا میں دیوتاؤں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

''وہ سرمایہ داروں کے حامی ہیں اور غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔''

اپنی لوک کتھاؤں اور لوک گیتوں میں بابلی لوگوں نے جانوروں کو نیم انسانی کردار عطا کیا تھا۔ عقاب کو ظلم کا نشانہ، لومڑی کو چور اور بیل کو طاقت کی علامت مانا گیا تھا۔ اپنے لوک گیتوں میں انھوں نے دانائی اور نیکی کی باتیں ہی بیان کی ہیں۔ ایک گیت ملاحظہ ہو:

جہالت اور نفرت ترک کردو
عوام میں بولنے کے لئے جلد بازی نہ کرو
اپنے بزرگوں کے مفادات (شاید، بادشاہ اور حکمران طبقہ) کی حفاظت کرو
(دنیا میں) ایک بیماری ایسی بھی ہے جس کے لئے کوئی طبیب نہیں ہے وہ
ہے کھانے کے لئے کسی غذا کا نہ ہونا!

مصری تاریخ میں لوک ادب (اساطیری ادب) کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس کا معتد بہ حصہ مذہبی اور سکولر گیت ہیں جن کو ہم لوک گیت کہہ سکتے ہیں۔ ''رباب بجانے والے کا گیت'' (جس میں شراب کا ذکر پر لطف انداز میں دل کھول کر کیا گیا ہے) یا ''زندگی سے اکتائے ہوئے انسان'' اور اُس کی روح کے درمیان مکالمہ جیسے لوگ گیت بہت ہی اہم ہیں۔ جو مصری سماج، جذباتیت اور تخیل کی عکاسی کرتے ہیں۔ کئی گیتوں میں عقلیت کی تردید کی گئی ہے اور انسان کو ابدی زندگی اور بقائے دوام کے حصول کی ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے۔ ''سورج دیوتا'' کی تعریف کا گیت (جو

بادشاہ ''آمن ہوٹیپ'' چہارم کے زمانے کی یادگار ہے) بہت ہی سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصر زمانہ کے سماج کی بہت سی باتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس گیت میں ''آتون'' (سورج دیوتا۔ اس کا نام رَی، ہورَس اور رَا بھی تھا) کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

آسمان پر تمھار طلوع ہونا کتنا خوب صورت ہے!
اے زندہ و جاوید آتون! تو زندگی کی ابتدا ہے
جب تم مشرق سے طلوع ہوتے ہو
تو ہر ایک زمین کو اپنی خوب صورتی سے مالا مال کرتے ہو
تم خوب صورت ہو، عظیم ہو، تابندہ ہو، اور
ہر ایک زمین سے ارفع اور اعلیٰ ہو
تمہاری کرنیں تمام زمینوں کو ضیا بار کرتی ہیں
جن کو تم نے ہی وجود بخشا ہے
(تم تو رَی ہو) تم ان کو گرفتار کر کے لے جاتے ہو
محبت کی زنجیر میں باندھ کے
تم اگر چہ (ہم سے) بہت ددور اور بلند ہو، لیکن
تمہاری شعاعیں ہماری دھرتی پر ہیں
تمہارے قدم ہمارے دن ہیں
(تمہارے ہی دم سے) درخت اور پودے نشو ونما پاتے ہیں
پرندے مرغزاروں میں اور ندی نالوں کے کناروں پر لگے ہوئے درختوں
پر چہچہا رہے ہیں
وہ اپنے پروں کو (تمہارے حضور میں) ادب سے پھیلاتے ہیں

بھیڑوں کے ریوڑ اپنے قدموں کی تان پر
(تیرے ہی دم سے) ناچتے ہیں
سب، پر لگے ہوئے چیز (اجسام) اُڑتے ہیں (کیونکہ)
تم ہی انہیں حرارت بخشتے ہو
تمہاری کرنیں بحرِ خضر کے قلب کو گرماتی ہیں
سب دور ودراز ملکوں کو بھی
تم ہی زندگی بخشتے ہو
تمہاری مہربانیاں کتنی شان دار اور بے انتہا ہیں
اے حیات جاوید کے مالک! (آتون)
آسمان پر بھی اجنبی مسافروں کے لئے ایک نیل (دریا) ہے
اور اپنی ٹانگوں پر چلنے والے تمام مویشیوں کے لئے بھی
تمہاری شعاعیں ہر ایک باغ کو تازگی بخشتی ہیں
جب تم طلوع ہوتے ہو
تو وہ توانائی اور تر وتازگی حاصل کرتے ہیں
وہ سب تمہارے ہی دم سے زندہ ہیں
(اس گیت کا اگر گائیتری منتر سے موازنہ کیا جائے تو دونوں میں بہت ہی کم
فرق نظر آئے گا)۔

<u>ایک عشقیہ مصری لوک گیت بھی ملاحظہ ہو:</u>

جب میں تیرے کھلے ہونٹوں کو چومتا ہوں
میں (عجیب) سرور اور لذت پاتا ہوں۔ اگر چہ مجھے بیئر نہ بھی ملی ہو
اوہ کاش! میں اس حبشی خادمہ کی جگہ ہوتا

جواس کی خدمت پر مامور ہے۔تو

میں اس کے اعضا کی رنگینی میں کھوکر محو ہو جاتا!!

....

لوک گیتوں کے علاوہ مصری ادب میں لوک کتھائیں بھی ملتی ہیں۔مثلاً ''بدنصیب سے شہزادے کی کہانی''۔جس کی قسمت میں سانپ،مگر مچھ یا کتے کے حملے کی وجہ سے مرنا لکھا تھا۔یا''شکستہ جہاز کے جہاز ران کی کہانی''۔ایسے ہی لوک گیت اور کہانیاں مصری تاریخ کی اہم بنیادیں اور ماخذ فراہم کرتی ہیں۔

یونانی لوک ادب:

یونانیوں کے پاس''لوک ادب'' کا وافر سرایہ موجود تھا۔الیڈؔ اور اُڈیسی تو مشہور یونانی رزمیہ ہیں جن کے بارے میں فرض کیا گیا ہے کہ کسی ہومرؔ نے تخلیق کیے ہیں!لیکن آج تک تاریخ ایسی کسی شخصیت کو مصدقہ طور پر ثابت نہیں کرسکی ہے۔اس لحاظ سے یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ رزمیے ایک فرد کی تخلیقات ہیں یا بہت سے لوگوں کی۔بہر حال یہ رزمیے لوک ادب ہی میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے منظوم قصے اور کہانیاں ہیں۔مندرجہ بالا دو یونانی رزمیوں پر ایک بہت ہی طویل عرصہ تک اہل علم کوئی یقین نہیں رکھتے تھے اور ان کو محض فرضی داستان کہہ کر رد کر دیا گیا تھا۔لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں ایک جرمن نژاد امریکی تاجر ہنری شکلے ماںؔ اور سر آرتھر اوانیز کی کوششوں نے''لوک ادب'' کے ان منظوم قصوں کو ایک حقیقت بنا دیا۔ان ہی دو رزمیوں میں یونانی لوک ادب نے کریٹ جزیرے کی شان دار تاریخ کو محفوظ رکھا تھا۔اس معاملے میں تو محض لوک ادب ہی کی بنیاد پر ایک قوم اور ملک کی تاریخ ہمارے سامنے آئی۔ورنہ شاہ 1894 تک ساری دنیا اس شان دار تہذیب کی تاریخ سے بالکل بے خبر تھی!

یونان ہی کے شاعر پنڈآر نے لوک گیتوں کے طرز ہی کو اپنا کر شہرت عام حاصل کر لی تھی۔ سآفو یونان کی شاعرہ بھی اسی وجہ سے مشہور ہوگئی تھی۔ اسی طرح رومی لوک ادب کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کا تاریخ سازی میں اہم رول رہا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابیں (جو بہت سے آدمیوں کی تصنیفات ہیں) خصوصی طور پر ''عہد نامہ عتیق'' تو ادب اور لوک ادب کا ایک ذخیرہ ہے اور ساتھ تاریخ اور لوک ادب کے باہمی ربط ورشتے کی حسین مثال ہے۔ یہودیوں کی کتاب ''تال موذ'' جو مختلف ابتدائی دوروں میں مختلف ذہین یہودیوں کی تخلیقات پر مبنی ہے، بذاتہ ایک کتب خانہ ہے۔ اس میں یہودیوں کے تقریباً آٹھ سو سال کے لوک گیت، لوک ادب، قانون، مذہبی مباحث، اہم فیصلہ جات اور یہودیوں کا فلسفہ اور تصوف وغیرہ موجود ہیں۔ یہ کتابیں آج بھی یہودیوں کو طاقت، توانائی اور فیضان بخشتی ہیں۔

شمالی یورپ کی قوموں کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں بہت ہی کم براہ راست شہادتیں میسر ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے لوک گیت، جن میں سکینڈی نیویا ممالک کے اہم واقعات اور اہم لوگوں کے کارہائے نمایاں بیان کئے گئے ہیں، اب تک محفوظ ہیں۔ اگرچہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان لوک گیتوں میں بہت سے واقعات کی آمیزش ہوگئی ہے لیکن پھر بھی مورخوں کے سامنے یہ مسلمہ امر ہے کہ ان میں اصلی اور تاریخی واقعات مذکور ہیں۔ بعد میں 11 صدی عیسوی کے اختتام پر ایک عیسائی مشنری سائمنڈ سگفن نے ان گیتوں کو الڈرایڈا میں مرتب کیا۔ سگفن کے ایک سو سال بعد وہاں کی ملکی تاریخ کا ایک اور مجموعہ لوک گیتوں اور کہانیوں کی بنیاد پر مرتب کیا گیا جس کا نام ''نیگرایڈ'' ہے۔ لیکن اس میں یونانی، یہودی اور عیسائی حکایتیں اور کہانیاں درج ہیں جو اس ملک پر ان قوموں کے تسلط اور اثرات کی نشان دہی کرتی ہیں۔

جن قوموں نے اپنی بنیادی یادگاروں کی طرف خصوصاً زبانی روایات

(لوک ادب) سے غفلت برت لی ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی تاریخ کو مسخ کر دیا بلکہ بہت حد تک اس کی اہم کڑیوں کو بالکل ہی کھوڈالا۔ ملایا پولی نیشیا کی قوم جزائر کے ایک طویل سلسلے میں پھیلی ہوئی ہے۔ پندرہ ویں صدی عیسوی میں پولی نیشیا کی اکثر قوموں نے اسلام قبول کیا جس کا نتیجہ وہی ہوا جو یورپ کے اکثر ممالک میں عیسائیت کے فروغ سے ہوا۔ یعنی نئے مذہب نے قومی خیالات کے بہاؤ کا رخ بدل کر قومی روایات، ادب اور مجموعی طور پر تاریخ کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ اسی طرح جاوا کے لوگوں نے اپنے قدیم لوک ادب اور اساطیری مآخذ کو ضائع کر دیا۔ اور اصلی روایات کو (نئے مذہب کے جوش میں) بگاڑ کر اپنے ملک کے قدیم بادشاہوں کی فہرست میں مسلمان پیروں اور فقیروں کے نام شامل کر کے اس کا حلیہ ہی تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس کے برعکس جاوا کے نزدیک ہی بالی جزیرہ کے باشندوں نے اپنی قدیم روایات کو قدیم لوک داستانوں اور لوک نظموں کی صورت میں محفوظ کر کے رکھ دیا۔

عرب کے باشندوں نے، جن کے بارے میں پہلے کہیں ذکر آ چکا ہے، اپنی تاریخ اور روایات تو صرف لوک ادب کی بنیاد پر ہی استوار کر لیں۔ عرب کے لوگوں نے اپنی تاریخ کے ناقابل اعتنا اجزا کو بھی ادب اور لوک ادب کے ذریعہ محفوظ کر لیا۔ زبانی روایات کو نظم کی صورت میں حفظ کرنے میں عربوں کو ایک حیران کن ملکہ حاصل تھا۔ ان منظوم ادب پاروں میں، عرب اور اس کے اردگرد علاقے کا جغرافیہ، پیداوار، خیالات، سماج کے حالات، عقائد اور نظریاتِ زندگی بہت ہی اصلی محرک موجود ہیں۔ الف لیلہ تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ لیکن عرب کے لوک ادب کی اچھی مثال ہے اور بہت بڑا خزانہ ہے۔ کتاب الاغانی تو لوک ادب کا بہت ہی بڑا سرمایہ ہے۔ جس میں عربوں کے ادب، فلسفہ، جنگ و امن کے حالات، دانائی، بے وقوفی، اسماجی حالات، اقتصادی نظام، سیاسی ڈھانچے اور بہت سے دیگر اہم امور کے بارے میں مکمل اور

جیتے جاگتے مرقع نظر آتے ہیں۔ لیلیٰ اور قیس عامری (مجنوں) اور وامق عذرا کے قصے عرب کی سرزمین پر ہی واقع ہوئے تھے۔ اور یہ قصے تقریباً دنیا کی ہر بڑی قوم نے اپنی اپنی زبان میں ادب اور لوک ادب کی صورت میں اپنائے ہیں۔ اور یہی حال الف لیلیٰ کے اکثر قصوں کے ساتھ ہوا ہے۔ اس طرح عربوں کا لوک ادب بھی بین الاقوامی وراثت بن گیا ہے۔

ایرانیوں کے ساتھ وہی ہوا جس کی مثال ہم اوپر پولی نیشیا اور جاوا کی قوموں کے بارے میں دے چکے ہیں لیکن ایران پر اسلام کے غلبہ کے بعد ایرانیوں نے اپنے لوک ادب کی گمشدگی کی بہت حد تک تلافی کی۔ ''کلیلہ و دمنہ'' اگرچہ نوشیروان (570ء) کے عہد میں ترجمہ ہوئی تھی لیکن وہ ترجمہ گم ہو گیا تھا۔ (اس کا سُریانی میں ترجمہ ہوا تھا، جو عربی میں ترجمہ ہوا) اور اسی کی بنیاد پر بعد میں ملا حسین الواعظ کاشفی نے اس کا ترجمہ ''انوار سہیلی'' کے نام سے کیا اور اس پر اور بہت سی ایرانی لوک کہانیوں کا اضافہ کر کے اس کی اوریجنل پوزیشن کو مشتبہ بنا کر رکھ دیا۔

سعدی شیرازی کی گلستان (نثری لوک ادب) اور بوستان (منظوم لوک ادب) کی تدوین وترتیب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ کہانیاں ایرانی سماج میں پہلے سے گردش میں تھیں۔ سعدی شیرازی نے ان پر مذہبی اور ناصحانہ رنگ چڑھایا۔ اور انہیں اپنی ادیبانہ زبان میں مدون اور مرتب کیا۔ جامی کی بہارستان " اور بعد کی ''اخلاق محسنی''، وغیرہ ایرانی لوک ادب کی صناعانہ اور ادیبانہ تدوین وترتیب کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ ایران کا شیرین وخسرو کا قصہ تو اتنا عام ہو گیا کہ دنیا کی دوسری قوموں نے بھی اسے اپنے ادب اور لوک ادب کا جزو لاینفک بنا دیا۔ اسی طرح دوسرے قصے، جو پہلے سے ہی موجود تھے، معرض تحریر میں لائے گئے۔ لیکن پھر بھی ان میں لوک روایات کے عظیم ذخائر موجود ہیں۔ سکندر نامے، عشقیہ قصے اور خود ''شاہ نامہ فردوسی''

لوک ادب، لوک کتھاؤں اور روایات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے اور صرف اسی کی بنیاد پر بہت بڑی حد تک ایران کی مجموعی تاریخ مرتب ہوئی ہے۔ اس طرح سے ایرانؔ نے (اگر چہ اسلام کے تسلط کے بعد ہی) اپنی قومی روایات اور لوک ادب کو محفوظ کر دیا۔ اور اپنی مشتبہ اور گم شدہ تاریخ کو نئے سرے سے ترتیب دینے میں مورخوں کی بہت ہی گراں قدر مدد دی ہے۔

چین کے باشندوں نے جو قدیم زمانے سے ایک عظیم ملک کے وارث رہے ہیں، اپنی قدیم ترین روایت کا مکمل طور پر حفاظت کی۔ چین کا زیادہ تر ادب نظم کی صورت میں موجود ہے۔ اس کا بیشتر حصہ تو لوک ادب پر مشتمل ہے اور مجموعی طور پر معتد بہ حصہ کنفیوشسؔ نے مختلف صورتوں میں محفوظ اور مدون کیا۔ کنفیوشس نے اپنی پیدائش سے پہلے وجود میں آئے ہوئے لوک ادب کے بڑے حصے کو بھی مرتب کیا۔ اور اس سب کو ''شی چنگ'' (کتابِ منظومات) میں تحریری صورت میں تالیف کیا۔ یہ کتاب مختلف گم نام لکھنے والوں (عوام) کی تخلیقات کا مجموعہ ہے۔ اس میں 305 گیت ہیں جو مذہب، محبت، تاریخ، جنگ، شراب، مذہبی رسومات، سماجی بہبود، امن جیسے مضامین کے علاوہ چینی مابعد الطبعیات اور اس کی شرح جیسی تفصیلات سے مالا مال ہیں۔ ہم یہاں ایک قدیم چینی لوک گیت کے بعد ایک چینی شاعر کے چند شعر پیش کریں گے۔ دونوں اگر چہ مختلف زمانوں کی تخلیقات ہیں، لیکن دونوں اپنے ہم عصر سماج کی عکاسی کرنے میں ایک عجیب یکسانیت رکھتے ہیں۔ قدیم ترین چینی لوک گیت۔ دوتی (Wu-Ti) بادشاہ کے عہد (140-87 ق م) کی تخلیق ہے:

آسمانی بطخ اپنے پر پھڑ پھڑا کر
کتنی بے خوفی اور آزادی کے ساتھ فضا میں محو رواز ہیں۔
وہ سرسبز اور بلند و بال گھنے گھنے درختوں پر

(اپنی مرضی سے) جہاں چاہیں آرام کرتے ہیں
لیکن ہم رات دن محنت کرنے والے ذیکس) لوگ (جو)
بادشاہ کی ہمہ وقتی خدمت اور چاکری کرتے ہیں
اپنے لئے (مٹھی بھر) چاول اور باجرہ کی کاشت بھی نہیں کرسکتے ہیں
(افسوس) ہمارے والدین آخر کس سہارے جیئیں گے!
اے ہم سے بہت دور نیلے آسمان!
یہ سب (ناانصافی اور ظلم) کب ختم ہوجائے گا؟

اب آٹھویں صدی عیسوی کے چینی شاعر تو فو (720-712) جو نامور چینی شاعر تائی تی پو کا ہم عصر اور دوست تھا، کا یہ گیت ملاحظہ ہو:

کل برات کو حکومت نے ایک حکم نامہ جاری کیا
اٹھارہ سال کی عمر کے لڑکے بیگار کے لئے بھرتی ہوجائیں
دارالخلافہ کو (دشمن کے حملوں سے) بچانے کے لئے.
رے ماؤں! اے بچو! آنسو مت بہاؤ
رونے سے تمھیں اور زیادہ اذیت پہنچے گی!
(کیونکہ) جب آنسو خشک ہوجاتے ہیں تو انسان
ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے
پھر اس حالت میں
آسمان اور زمین،
دونوں انسان سے ہمدردی کرنا
بند کردیتے ہیں۔

طوالت کے خوف سے ہم نے اپنے اس مقالے میں صرف قدیم زمانے

کے لوک ادب سے مثالیں چن کر پیش کر کے تاریخ اور لوک ادب کے باہمی ربط وتعلق کی نوعیت اور اہمیت پر کسی حد تک وضاحت کے ساتھ قارئین کرام کو روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر ہم موجودہ دور کی بڑی اور چھوٹی زبانوں کی پیدائش کے بارے میں غور کریں گے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ لوک ادب نے نہ صرف یہ کہ ان کی پیدائش، نشو ونما اور ترقی کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس طرح لوک شاعری اور لوک ادب نے عوامی گیت کاروں، موسیقاروں، قصہ گویوں اور ناٹک کرنے والے بھاٹوں کے ذریعہ سے مختلف طریقوں سے کسی ملک کی قومی روایات اور تہذیب کے اہم کرداروں کی زندگی کے حالات کو محفوظ کر کے ان میں شان دار اضافوں کے ساتھ تاریخ کو معلومات کے خزانے دے کر مالا مال بھی کر دیا ہے۔

حروف تہجی الفاظ، زبان، تلمیحات، استعارے اور تشبیہات، ضرب الامثال (جغرافیائی، حیواناتی، نباتاتی، جماداتی اور عمرانی وغیرہ) قصے، گیت، حکایات۔ ان سب نے تاریخ کے قدیم ترین ابتدائی دور سے لے کر قرون وسطیٰ تک اور اس کے بعد بھی دنیا کے ملکوں میں (بغیر حکومتوں کی طرف سے اجرا شدہ پاسپورٹ اور ویزا کے) ہزاروں لاکھوں بار میزائیلی رفتار سے سفر کئے اور دنیا کی مختلف زبانیں (پھر لوک ادب۔ اور پھر تاریخ) وجود میں لائیں۔ اس طرح سے دنیا میں جہاں کہیں، جو بھی لوک ادب اور اس سے جو بھی تاریخ منصۂ شہود پر آئی ہے، وہ ساری دنیا کے انسانوں کی مشترکہ میراث ہے۔

●●●

کتابیات:

اردو کتب:

ا۔مقدمۂ تاریخ	ابن خلدون
۲۔ ہمارا قدیم سماج	سید سخی حسن نقوی
۳۔تاریخ تمدن ہند	محمد مجیب
۴۔قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب	گوری شنکر، ہیرا چند او جھا
۵۔مقالات (کشمیری)	پروفیسر محی الدین حاجنی

انگریزی کتب

1.History of Civilization ,Sir Henry Thomas Buckle ,Edition 1862 A.D (2 Vol)

2.The Culture & Civilization of Ancient India by DD Kosambi

3.History of Wastern Civilization By Brace Harcourt (2 Vol) 1935

4. The Great Cultural Traditions by R.E.Turner (2 vol) 1941

5.The Story of Civilization & Our Oriental Heritage by Will Durant 1935

6.The Literature of Ancient Egyptians (1927

7.A History of world Civilzation by Max Sevelle

8.A Survey of Western Civilization by H.E.Burnes

☆۔۔۔ڈاکٹر ناہید احمد
مترجم: ارشد حسین

کشمیر میں جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ تہذیب کے مابین تعلقات
(آثارِ قدیمہ کی ایک نئی دریافت)

''علم الآثار کا مطلب انسانی تاریخ اور ثقافت وتمدن کا مطالعہ ہے، جو آثارِ قدیمہ کی صورت میں کہیں کسی شکل میں محفوظ رہ جانے والے باقیات کی بازیافت جیسے دستاویزات، صنعی وقیعہ، حیاتی وقیعہ، قدیم عمارات وغیرہ سے سامنے آتا ہے۔ علم آثارِ قدیمہ ایک ایسا علم ہے جس میں انسانی ارتقاء سے لے کر تہذیبی ارتقا اور انسانی معاشرہ کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی تاریخ کی افہام وتفہیم شامل ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ پرانی دریافتوں کے مطالعہ سے نہ صرف یہ طے کرتے ہیں کہ یہ دریافتیں کس زمانے سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر وہ اُس دور کی تاریخ اور معاشرت کے بارے میں بھی معلومات اخذ کرتے ہیں۔ علم آثار قدیمہ کا اصل اور اولین مقصد آدم تا ایں دم معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی وتمدنی تاریخ کے اجزا جمع کرنا اور انہیں سلسلہ وار ترتیب دے کر ایک وحدت کی شکل دینا ہے۔ اس کے لئے ہر ملک میں الگ الگ محکمہ جات قائم ہیں جن کا کام آثار کی تلاش و جستجو اور نگہداشت کرنا ہے۔ آثار قدیمہ کی تلاش اور دریافت اور پھر ان

سے متعلق حقائق کی چھان پھٹک با قاعدہ ایک سائنسی علم ہے۔آثار قدیمہ سے دلچسپی کا آغاز سولہویں صدی کے اوائل میں ہوا۔مختلف افراد نے پہلے انفرادی طور پر نوادرات اکٹھے کرنا شروع کئے پھر خزانوں کی تلاش میں تباہ شدہ بستیوں کی کھدائی کی گئی۔وہاں سے کئی نادر اشیا برآمد ہوئیں تو بعد میں انہیں منظم طریقہ پر محفوظ رکھنے اور ماضی کے بارے میں جاننے کا خیال پیدا ہوا جس کے نتیجے میں عجائب گھر قائم ہوئے۔علم آثار قدیمہ کی بدولت جہاں ازمنہ رفتہ کی تاریخ سامنے آئی وہاں انسانی ارتقا کی سلسلہ وار کڑیاں بھی منضبط شکل میں جمع ہوئی ہیں۔یوں گزرے ہوئے زمانے اور مختلف ادوار اور خطوں میں انسان کی معاشرتی زندگی کی تصویر مرتب ہوئی۔قدیم تہذیبوں کے کوائف و حالات سے متعلق معلومات ہمیں علم آثار قدیمہ کے ذریعے سے ہی دستیاب ہوئی ہیں۔جتنا آثار قدیمہ کا شعبہ ترقی کرتا گیا اتنا ہی ہمیں قدیم انسانوں سے متعلق واقفیت حاصل ہوتی گئی۔جنوبی ایشا میں کئی ایک قدیم تہذیبوں کا سراغ آثار قدیمہ کی بدولت ہی منظر عام پر آیا۔ان ہی قدیم تاریخی تہذیبوں میں ہڑپہ تہذیب اور کشمیر کا پتھر عہد بھی شامل ہیں جن کے آثار برصغیر ہندو پاک میں کئی ایک جگہ پر پائے گئے ہیں۔وادیٔ کشمیر میں جدید زمانۂ حجر کے آثار کی کئی مقامات پر نشاندہی کی گئی ہے لیکن ان میں صرف تین برزہوم،غف کرال اور کانسپورہ مقامات پر محکمہ آثار قدیمہ نے کھدائی کا کام ہاتھ میں لیا ہے۔اسی طرح ہڑپہ تہذیب کے آثار والے کئی مقامات کی بھی محکمہ کی طرف سے کھدائی کی گئی ہے۔ان مقامات سے دریافت ہوئے آثار و باقیات کے مطالعہ سے پتہ چلا ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں ایک ہی دور کی رہی ہیں اور ان کے مابین

آپسی تعلقات بھی رہے ہیں۔اس مقالہ میں کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور
ہڑپہ تہذیب کے مابین تعلقات کا علم آثار قدیمہ کی وساطت سے ظاہر کئے
گئے معلومات کا جائزہ لے کر تعلقات کی نوعیت جاننے کی کوشش کی گئی ہے''۔

(مترجم)

کرۂ ارض پر انسانی آبادی کا اجتماعی طور رہن سہن کا آغاز کب ہوا، اس کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کا ماننا ہے کہ ماقبل تاریخ کے دور میں انسانوں کا گروہوں میں رہنے کی شروعات اور کسی مستقل جگہ قیام کرنے کا سلسلہ کب شروع ہوا اسکے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کشمیر میں پہلی مقیم اور مستقل آبادی کے آثار تین ہزار قبل مسیح جدید زمانہ حجر کے دوران ملتے ہیں۔اس سے پہلے انسان صحراؤں، جنگلوں و بیابانوں میں بغیر کسی مسکن کے رہنے کا عادی رہا ہے۔موسم کی شدت ، جنگلی جانوروں اور حشرات الارض کی ضرر رسانیوں سے اس کا سابقہ پڑتا رہا ہے۔امتداد زمانہ کے ساتھ انسان کو رہنے کے لئے مسکن کی ضرورت سمجھ آنے لگی۔ ارضی وسماوی ناسازگاریوں اور تبدیلیوں سے بچنے کے لئے ٹھکانوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ناسازگار موسم کی شدت سے تحفظ پانے کے لئے ،اس زمانے کے کاشتکاری سے وابستہ لوگوں نے غاروں اور زیر زمیں کھڈوں میں رہنے کا آغاز کیا تھا۔ان غار نما رہائشی کھڈوں کے داخلہ اور باہر نکلنے کی جگہ گول جھونپڑیوں کی صورت میں ہوتی تھی۔گزرتے وقت کے ساتھ انہوں نے چکور اور مستطیل، ٹھاٹر ولپائی شدہ گھروندوں اور کچی اینٹوں سے بنے گھروں میں رہنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مویشیوں جیسے بھیڑ بکریوں، گھوڑے، گائے، بھینس ،بیل وغیرہ مویشیوں کو پالنے کا آغاز ہوا۔ مال برداری کے لئے بھینس اور گدھے کا استعمال ہونے لگا۔زمین میں فصلیں اُگانے کی شروعات ہوئی۔گندم، جو،

السی وغیرہ کی کاشت کاری کا سلسلہ بھی پہلی بار شروع ہوا۔لوگوں نے دھاروالے پتھروں اورنوک دار ہڈیوں کے اوزاروں کے استعمال کا آغاز کیا۔اس زمانے کے لوگوں کوشمال مشرقی ہندوستان کے ساتھ قریبی تعلق رہاہےاوروہیں،وسطی ایشیااورچین کے ساتھ مسلسل روابط تھے۔جموں وکشمیر میں کم وبیش جدید زمانۂ حجر(Neolithic Sites)کے چالیس مقامات کے آثار پائے گئے ہیں جن میں سے صرف تین مقامات برزہوم(Burzahom)،غف کرال(Gufkral) اور کانس پورہ (Kanispur) کی کھدائی کی گئی ہے ۔ برزہوم کی کھدائی ٹی۔این۔خزانچی کی سربراہی میں 1960 سے لےکر 1971 تک سات بارعمل میں لائی گئی ہے ۔ غف کرال کی کھدائی 1980 سے لےکر 1982 تک اے۔کے۔شرما کی سربراہی میں دوبار کی گئی ہے اور کانس پورہ کی کھدائی بی ۔آر۔ مانی کی سربراہی میں 1998 سے لےکر 1999 تک فقط ایک بارعمل میں لائی گئی ہے۔

کشمیر کا جدید زمانۂ حجر(Kashmir Neolithic Period)اور ہڑپا تہذیب(Harappan Civilization)ہم زمانہ رہے ہیں۔کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے آثار قدیمہ کے تین مقامات برزہامہ،غف کرال اور کانس پورہ جموں وکشمیر کے تین اضلاع بالترتیب سرینگر، پلوامہ اور بارہمولہ میں پائے جاتے ہیں۔وہیں دوسری طرف ہڑپا تہذیب برصغیر ہند کے شمال مغربی علاقہ بشمول آج کے پاکستان اورشمال مغربی بھارت میں پائی جاتی تھی۔کشمیر کے قدیم ثقافتی عہد کے آثار سندھ اورسرسوتی دریاؤں کے کنارے موجود رہے ۔اس ثقافت کے منڈا مقام پر پائے جانے والے قدیم آثار کامحلِ وقوع بہت ہی دلچسپی کا حامل ہے۔

جموں وکشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے آثار''برزہامہ''میں پائے جاتے ہیں،جو شہر سرینگر کے شمال مشرق میں سولہ کلومیٹر کی دوری پرنسیم باغ شالیمار سڑک پر واقع

ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے 1800 میٹر کی بلندی پر قدیم وسط حیاتی زمانے کی جھیل کی طبق پر واقع ہے۔ یہ ایک بلند مہتابی قطعۂ ارض ہے جو دریائے جہلم کے سیلابی علاقہ میں واقع ہے جس کی بناوٹ کریوامٹی پر مبنی ہے۔ دو کلو میٹر کی دوری پر واقع برزہامہ سے مشہور و معروف ڈل جھیل کا بھرپور اور خوبصورت نظارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کشمیری زبان میں برزہوم کا مطلب ''برج'' کا ہوتا ہے۔ برج درختوں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو ہمالیائی علاقوں میں عموماً سطح سمندر سے تین ہزار (3000) سے لے کر چار ہزار دوسو (4200) میٹر کی بلندی پر اُگتا ہے۔ یہ درخت برزہوم میں کھدائی کے دوران مکانوں کی چھتوں کے لئے استعمال میں لایا ہوا ملا ہے، جو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ درختوں کی یہ قسم یہاں تک کہ زمانۂ حجر سے قبل بھی پائی جاتی تھی۔ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے برزہوم کے مقام پر کی گئی کھدائی سے تین ہزار قبل مسیح سے لے کر ایک ہزار قبل مسیح کے درمیان تمدنی اہمیت کے حامل چار ادوار کا انکشاف ہوا ہے۔ پہلا اور دوسرا دور جدید زمانۂ حجر (Neolithic Era) کی نشاندہی کرتا ہے۔ تیسرا دور بڑا زمانۂ حجر (Megalithic Era) سے متعلق ہے جب بڑے بڑے پتھروں کو تراش کر کے عمارات بنانے کے لئے استعمال کیا جانے لگا تھا اور چوتھا دور بڑا زمانۂ حجر (Post Megalithic Period) کے مابعد تاریخی عہد کے صدر اوّل سے متعلق ہے۔ کھدائی کے دوران دریافت شدہ ثقافتی و تمدنی مواد کے ذخائر سے متعلق منظّم ریکارڈ ما قبل تاریخ میں وادیٔ کشمیر کے اندر انسانی سرگرمیوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ یہ انکشافات مفصل جائزے کے بعد ریکارڈ میں لائے گئے ہیں، جو برزہوم میں کھدائی مقام کے تمام طبعی شواہد بشمول قدیم جمادات و نباتات کا احاطہ کرتے ہیں۔ کھدائی کے مقام سے بڑی تعداد اور وافر مقدار میں ہڈیوں اور پتھر سے بنے آلات و مصنوعات کی دریافت ہوئی ہے۔

''غف کرال'' دولفظوں کا مرکب ہے۔کشمیری زبان میں ''غف'' کالفظی معنی غاراور ''کرال'' کالفظی معنی کمہار ہوتا ہے۔غف کرال یعنی وہ جگہ جہاں کمہار آباد تھے جو کریوا علاقوں کو کھود کھود کر غاروں کوتعمیر کر کے ان کو اپنا مسکن بناتے تھے۔ ''غف کرال'' نامی اس جگہ کی کھدائی محکمہ آثار قدیمہ کی ماقبل تاریخ شعبہ نے 18 اگست سے 20 اکتوبر 1981 کے دوران کی تھی۔غف کرال شہر سرینگر سے 41 کلومیٹر کی دوری پر جنوبی کشمیر کے پلوامہ ضلع کے تحصیل ترال میں 33.54 ڈگری عرض البلد اور 75.60 ڈگری طول البلد پر واقع ہے۔یہ جگہ دریائے جہلم میں ضم ہونے والے دونالوں کے مابین ''بن میر'' گاؤں کے متصل ڈھلوان پر واقع ہے۔ اس ڈھلوان کے اوپر 400 میٹر لمبائی اور 75 میٹر چوڑائی والا ٹیلا پایا جاتا ہے۔آثار قدیمہ کے اس مقام پر کھدائی کے دوران ستونوں والی کئی غاریں دریافت ہوئی ہیں جن میں کئی غاریں ایک اور کئی ایک سے زیادہ کمروں پر مبنی پائی گئی ہیں۔مذکورہ جگہ کا جنوب مشرقی علاقہ رہائشی اور اسٹور کے لئے کمہاروں کے زیر تسلط رہا ہے۔یہ جگہ محکمہ آثار قدیمہ،حکومت ہند کے سرحدی حلقہ نے 1963-1962 میں دریافت کی ہے۔اس جگہ پر جدید زمانۂ حجر کے دوثقافتی ادوار کی تفصیل ملی ہے جسے کشمیر میں ماقبل تاریخ کے حجری زمانے میں رہنے والی انسانی آبادی اوران کے باہری دنیا سے روابط و تعلقات سے متعلق معتد بہ معلومات ملی ہیں۔

کانسپورہ سرینگر کے شمال مغرب میں 49 کلومیٹر کی دوری پر 34.13 ڈگری عرض البلد اور 74.24 ڈگری طول البلد پر واقع ہے۔کانس پورہ میں محکمہ آثار قدیمہ کو کھدائی کے دوران ماقبل تاریخ کے جدید حجری عہد کے دوادوار کے آثار ملے ہیں۔ کانسپورہ شمالی کشمیر کے ضلع بارہمولہ میں دریائے جہلم کے بائیں کنارے واقع ہے۔ اس جگہ کی کھدائی بی۔آر۔مانی کی سربراہی میں بالاختصار عمل میں لائی گئی اوراس جگہ

پر قدیم زمانے کے پانچ ثقافتی عہدوں کے شواہد پائے گئے ہیں۔ پہلا اور دوسرا دور جدید زمانۂ حجر سے متعلق پایا گیا جس میں پہلا دور بغیر کوزہ گری اور دوسرے دور میں کوزہ گری کے آثار ملے ہیں۔ باقی تین ادوار ''کشان عہد'' کے ابتدائی تاریخی دور کے صدر اوّل سے متعلق پائے گئے ہیں۔ کانسپورہ میں جو جدید حجری زمانے سے متعلق ثقافتی مواد ملا ہے وہ ''برزہوم'' اور ''غف کرال'' کے ثقافتی مواد سے مشابہت رکھتا ہے۔ کھدائی کے دوران وہاں دریافت ہوئے آثار سے قدیم عہد کے لوگوں کے پیشہ سے متعلق شواہد ملے ہیں۔ دیگر برآمد ہوئے آثار سے طرزِ تعمیر کے حوالہ سے مستطیل و چکور گھر، جن کے اندر، گول چوکی، چکردار چولہا وآتش دان پایا گیا ہے۔ بی۔آر۔ مانی کا ماننا ہے کہ کانسپورہ سے ملے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ جدید حجری زمانے میں وسطی ایشا سے لوگوں کی نقل حمل بارہمولہ سے ہوکر کشمیر کے دیگر علاقوں کی طرف ہوتی تھی۔ وہ اس بات کا دعویٰ وہاں ملے قدیم زمانے کے مخصوص قسم کے گندم کی دریافت کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کا گندم بنیادی طور مشرقی وسطیٰ کے خشک اور بنجر علاقوں میں پایا جاتا تھا جو بعد میں ایران اور افغانستان سے جنوب ایشا پہنچ کر بارہمولہ ضلع کی رابطہ سڑکوں کے ذریعے سے کشمیر پہنچ گیا۔ تیسرا اور چوتھا دور ابتدائی تاریخ کے صدر اوّل کے ''کشان عہد'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھدائی کا عمل انجام دینے والے ماہرین نے مٹی کے برتنوں کی وہ قسم بھی دریافت کی ہے جو پاکستان میں پائے جانے والے آثار قدیمہ کے مقامات سرکپ اور ٹیکسلا سے مشابہت رکھتے ہیں۔

غف کرال، برزہوم اور کانس پورہ مقامات پر کھدائی سے ملے آثار سے متعلق محکمہ آثار قدیمہ کے ریکارڈ اور دستاویزات سے واضح شواہد ملے ہیں کہ یہاں کے جدید زمانۂ حجر کے لوگوں کو ہڑپا تہذیب کے ساتھ ثقافتی اور تمدنی تعلقات اور روابط رہے ہیں۔ تمدنی وثقافتی ساز وسامان کی ایک بڑی کھیپ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر

کے مقامات کی کھدائی کے دوران برآمد ہوئے ہیں۔کھدائی کے دوران ملے آثار کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ کشمیر کا جدید زمانۂ حجر اور ہڑپا تہذیب ایک ہی زمانے میں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔

کانس پورہ سے برآمد اشیا کی ریڈیو کاربن ڈیٹنگ شواہد سے یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ 3000 قبل مسیح کے ابتدائی زمانہ کے برعکس وادیٔ کشمیر میں جدید زمانۂ حجر کا آغاز 4000ق م کے وسط اور کوزہ گری زمانۂ حجر کے شواہد 4000ق م کے اواخر میں ملتے ہیں۔جیسا کہ ماہرین آثار قدیمہ برزہوم اور غف کرال کے شواہد سے بالعموم سمجھتے ہیں۔کاربن ڈیٹنگ سے حاصل کی گئی تفاصیل کی تصدیق ٹاٹا انسٹی چیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ، بمبئی (Tata Institute of Fundamental Research, Mumbai) اور بیربل ساہانی انسٹی چیوٹ آف پالا بوٹانی، لکھنو (Birbal Sahni Institute of Palaeobotany, Lucknow) نے کی ہے۔ریڈیو کاربن شواہد سے وادیٔ کشمیر میں جدید زمانۂ حجر کی ثقافت (Neolithic Culture) کی نقل وحمل اور اس کی نشوونما وارتقا کا خلاصہ ملتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وسط ایشائی جدید زمانۂ حجر کی ثقافت وتمدن اور روایات وادیٔ کشمیر میں 4000ق م کی دوسری نصف میں داخل ہوئی ہے جب جدید زمانۂ حجر نو آبادی نے کانسپورہ کے اردگرد وادی کے مغربی علاقوں کو قبضہ میں لے کر وسطی کشمیر کی طرف پیش قدمی کا آغاز کیا ہے۔جدید زمانۂ حجر کے ''برزہوم'' آثار قدیمہ مقام کی کاربن ڈیٹنگ سے اس خطے کو زیر قبضہ لانے کا زمانہ 2881ق م سے پیش تر مانا جاتا ہے۔مزید برآں جدید زمانۂ حجر کی نو آبادی نے وادیٔ کشمیر میں جنوب مشرقی خطے کو ''غف کرال'' مقام کے اردگرد اپنے زیر قبضہ 2347ق م سے پیش تر لایا ہے۔یہی وہ زمانہ رہا ہے جب قدیم کانسے کا عہد (Chalcolithic) کے روابط اور تعلقات

وادیٔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کی آبادی کو شمال میں اور آسودہ حال وفربہ ابتدائی دور کی ہڑپہ تہذیب کا جنوب میں ہریانہ و پنجاب خطے میں استوار ہوئے ہوں گے جس کی نشاندہی ابتدائی ہڑپہ نو آبادی کے آثار کا جموں میں منڈ اکھنور کے مقام پر دریائے چناب کے دائیں کنارے اور ملپور میں ایک ساتھ پائے جانے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ کاربن ڈیٹنگ سائنسی تکنیک کے ذریعے سے کی گئی تحقیق سے اس بات کے واضح ثبوت سامنے آتے ہیں کہ دونوں ہڑپہ تہذیب اور کشمیر کا جدید زمانۂ حجر ایک ساتھ رہے ہیں۔

رہن سہن کے لئے تعمیر شدہ عمارتوں کا تقابلی مطالعہ:

کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ تہذیب کے رہن سہن میں نمایاں مماثلت پائی گئی ہے۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے لوگ زیر زمیں بڑی غار نما کھڈوں میں بودوباش کیا کرتے تھے۔ یہ غار نما کھڈیں میدانی علاقوں میں مستطیل، گول یا بیضوی ساخت کے بنے ہوتے تھے جن کا اوپری حصہ تنگ اور نچلا حصہ کشادہ ہوا کرتا تھا۔ برزہوم کے مقام پر ایسے سولہ غار نما رہائشی کھڈ پائے گئے ہیں جو براہ راست قدرتی اراضی کاٹ کاٹ کر تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی غار کا اوپری حصہ 2.74 میٹر، اونچائی 4.57 میٹر اور نچلی حصہ کی طرف گہرائی 3.96 میٹر پائی گئی ہے۔ برزہوم سے 886 عقیق احمر اور 87 سنگ سلیمانی کی مالائیں دریافت ہوئی ہیں۔ ان سے ملتی جلتی غار نما کھڈ طرز کے رہائشی عمارتوں کے آثار اوپری سرسوتی طاس میں ابتدائی ہڑپہ عہد کے آثار میں دیکھنے کو ملے ہیں۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ تہذیب کے رہائشی غار نما کھڈوں کے اردگرد کئی کھودے ہوئے گڑھے پائے گئے ہیں جسے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ وہاں لکڑی کے بنے ہوئے ڈھانچے رہے ہوں گے اور جن کی چھت گھاس سے ڈھکی رہتی ہوں گی۔ ابتدائی ہڑپہ عہد کے ان غار نما رہائشی

کھڈوں کا قطر 2 میٹر سے لے 3.4 میٹر اور زیادہ سے زیادہ گہرائی 1.10 میٹر پیمائش کی ناپی گئی ہے۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے سب سے بڑے غارنما رہائشی کھڈ کے اوپری حصہ کا قطر 2.74 میٹر اور نشیبی حصہ کا قطر 4.5 میٹر پیمائش کا ناپا گیا ہے۔ اس کے اندر سے برآمد ہوئے آتش دان، چولہوں، بوسیدہ ہڈیوں، اناج کا بھوسا، تانبے، برتن اور نوادرات و دیگر اشیا سے اس بات کی نشاندہی ہوجاتی ہے کہ یہ غارنما رہائشی کھڈے ایک ساتھ کئی مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے غارنما رہائشی کھڈ کئی کمروں پر مشتمل پائے گئے ہیں جو کھانے پینے، قیام، اسٹور، صنعت کاری اور فضلات جمع کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ابتدائی ہڑپہ تہذیب کی دریافت شدہ ایک رہائشی غارنما عمارت کوئی کمروں پر مشتمل پایا گیا ہے جو کثیر المقاصد اغراض جیسے سکونت، باورچی خانہ، اسٹور، صنعتی آلات کی تیاری کا کارخانہ، ہتھیار اور فضلات جمع رکھنے کے لئے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ برزہوم کے بعد کے زمانے کی مٹی اور کچی مٹی کے اینٹوں سے تعمیر شدہ ڈھانچوں کے آثار بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ ابتدائی ہڑپہ زمانے میں ہکرا دور (Hakra Phase) کے دوران غارنما رہائشی مکانات کی تعمیر کا تسلسل پایا جاتا ہے جس میں مٹی کی اینٹوں کے استعمال کا آغاز ہوا ہے۔ مٹی کی اینٹوں کا ان غارنما رہاشی مسکنوں کی تعمیر میں اندر اور باہر استعمال کیا جانے لگا۔ سوتھی۔سسوال کے دور کے لوگوں نے پہلی بار مٹی کی اینٹوں سے رہاشی مکانات بالائی سرسوتی علاقہ میں تعمیر کر کے ان کے اندر رہنے کا آغاز کیا ہے۔ اس طرح سے غارنما رہاشی تعمیرات، لکڑی کے ستونوں سے بنے گھروندے، چھت دار مکانات اور تعمیرات میں اینٹوں کا استعمال وغیرہ میں بڑی حد تک مشابہت سے جدید کشمیر کے زمانۂ حجر اور ابتدائی ہڑپہ ثقافت کے رہائشی طرز تعمیر کی عکاسی کرتا ہے۔

کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور ابتدائی ہڑپہ ثقافت کے مجموعہ کوزہ گری کا تقابلی مطالعہ:

کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے مجموعہ کوزہ گری کو سرخ، بھورے، زرد اور کالے ظروف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سرخ ظروف اور بھورے ظروف کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے کوزہ گری صنعت کے بنیادی اور عام استعمال کے ظروف رہے ہیں۔ سرخ زمرے کے ظروف میں ہلکے سرخ، مائل سرخ، سیاہی ملا سفید اور کنکریلے سرخ ظروف بڑی تعداد میں پائے گئے ہیں۔ بھورے زمرے کے ظروف میں اکثر چمکیلے بھورے ظروف پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ عام بھورے ظروف، بھورے لوہے کے ظروف، گھڑے بھورے ظروف بھی کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے ظروف پائے گئے ہیں۔ زرد رنگ کے ظروف، کالے ظروف اور چمکیلے کالے ظروف بھی کھدائی کے دوران ملے ہیں۔

ہڑپہ تہذیب کی دریافت شدہ اکثر مجموعہ کوزہ گری کی اشیا سرخ ظروف پر مشتمل پائی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں کم وقلیل تعداد میں زرد ظروف اور سیاہی ملا سفید ظروف بھی دریافت ہوئے ہیں۔ سرخ صنعتی ظروف کے اندر، عام سرخ ظروف، مائل سرخ ظروف، سیاہی ملے سرخ ظروف اور کنکریلے سرخ ظروف ہڑپہ تہذیب کے اکثر مقامات سے ملے ہیں۔ بھورے ظروف، ان گھڑے بھورے ظروف اور گھڑے بھورے ظروف بھی اچھی تعداد میں پائے گئے ہیں۔ اس طرح سے دونوں تہذیبوں کے مجموعہ کوزہ گری اقسام اور شکل و ہیئت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔ دونوں تہذیبوں کے ظروف کی شکل وصورت اسٹینڈ والے ظروف، گلدان نما کاسہ، پلیٹ، چلمچی، ابھرا ہوا کٹورا، کھانا پکانے کے برتن عمومی طور پر مشتمل پائے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے ظروف کی نمایاں خصوصیات ہڑپہ تہذیب کے ظروف سے بالکل

مختلف ہے۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے مجموعہ کوزہ گری کے اکثر ظروف ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں جب کہ ہڑپہ تہذیب کی کوزہ گری خوب پکی اور تپائی ہوئی، پہیے پر بنی ہوئی اور کبھی کبھار ہاتھ سے بنی ہوئی ملی ہے۔ ہڑپہ تہذیب کی کوزہ گری پر عمومی طور نقش و نگاری نہیں ملتی ہے۔ زرد چمکیلے ظروف اور سیاہ چمکیلے ظروف جدید زمانۂ حجر کی ثقافت کے نمایاں خصوصیات میں سے ہے۔ ہڑپہ تہذیب کے مقامات سے ایسی کوزہ گری شاذ و نادر ہی ملی ہے۔ اس طرح دو مختلف قسم کی کوزہ گری کے مراکز کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ ثقافت کے خطوں میں پائے گئے ہیں۔ تاہم ہڑپہ تہذیب کے طرز اور شکل وصورت والے ظروف کی وادیٔ کشمیر میں موجودگی اور چمکیلے سیاہ ظروف کو وادی سرسوتی میں پایا گیا ہے۔ ایک گول مٹکا، جس پر سینگوں والے دیوتا کی تصویر بنی ہوئی ہے، کو کشمیر کے جدید زمانۂ حجر مقام پر پایا گیا ہے۔ یہ تمام شواہد اس بات کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں کہ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ تہذیب کے مابین کوزہ گری کے خاصے روابط رہے ہیں۔

<u>دھات کی اشیا کا تقابلی مطالعہ:۔</u>

ہڑپہ عہد کے لوگ بیشتر سونا، چاندی، تانبا، سیسہ اور کانسی کو بطور زیورات، آلات واوزار اور ہتھیار کے استعمال کرتے تھے۔ کشمیر میں جدید زمانۂ حجر کے دوران صرف تانبے سے بنی اشیا، آلات واوزار کے استعمال ہونے کے شواہد ملے ہیں۔ ان کے زیورات جیسے چوڑیاں، انگوٹھیاں، سرمہ دانی، سوئیاں، برچھیاں، چھینیاں اور دیگر آلات اور ہتھیار تانبے کے بنے ہوئے ملے ہیں۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے دریافت شدہ تانبے سے بنے ہوئے زیورات، آلات اور ہتھیار سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ ہڑپہ تہذیب اور جدید زمانۂ حجر کے مابین گہرے ثقافتی وتمدنی تعلقات وروابط رہے ہیں۔ تانبے کا استعمال اور اس سے مصنوعات کی تیاری کا چلن ہڑپہ تہذیب

کے دوران عام ہو گیا تھا۔ دھات کو پگھلانے کے لئے استعمال ہونے والی بھٹیوں کی دریافت سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ہڑپہ عہد کے لوگ تانبے کو پگھلا کر اسے آلات، اوزار اور ہتھیار اور آرائش و زیبائش کے لئے زیورات تیار کر کے استعمال میں لاتے تھے۔ کھدائی کے دوران ہڑپہ عہد سے متعلق مقامات سے وافر مقدار میں خام تانبے کی دریافت اس بات کا بین ثبوت پیش کرتا ہے۔ خام تانبے کا یہ مال ہڑپہ تہذیب کی آراوالی پہاڑیوں پر آباد بستیوں سے دریافت ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے تانبے کے استعمال کے شواہد کھتری، سگہانا، گنیشور، تیجانوالی اور کہلرا پہاڑیوں سے ملے ہیں، جسے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہڑپہ تہذیب کے دوران تانبے کا استعمال بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ دوسری طرف کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے دوران بھی تانبے سے بنے زیورات، آلات اور ہتھیار کے استعمال کے ثبوت بھی ملے ہیں جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ دونوں تہذیبوں اور ثقافتوں میں دھات سے بنی اشیا کا استعمال ہوتا تھا اور عین ممکن ہے کہ ہڑپا کے لوگ تانبے سے بنی اشیا کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے لوگوں کو سپلائی کر کے اس کا کاروبار کرتے ہوں۔

<u>ہڈیوں سے بنی اشیا کا تقابلی مطالعہ:۔</u>

ہڑپہ تہذیب اور کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے مقامات کی محکمہ آثار قدیمہ حکومت ہند کی طرف سے عمل میں لائی گئی کھدائی کے دوران ہڈیوں کے بنے ہوئے آلات، ہتھیار اور زیورات کی دریافت ہوئی ہے۔ ہڈی ایک عمومی چیز ہے جو دونوں ثقافتوں کے کھدائی کے مقامات سے بڑی آسانی کے ساتھ ملی ہے۔ ہڑپہ تہذیب کے مقابلے میں جدید زمانۂ حجر کے دوران ہڈیوں سے بنی اشیا زیادہ عام رہی ہیں۔ ان اشیا کی ایک بڑی کھیپ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے مقامات سے برآمد ہوئی ہیں جن میں نیزے، سوئیاں، برچھیاں، جھمکے، لٹکن، مالائیں، تسبیح دانے اور منکے شامل ہیں۔ کم

وبیش اسی طرح کی اشیا ہڑپہ تہذیب کے مقامات کی کھدائی کے دوران بھی ملی ہیں۔

پتھر سے بنی اشیاء کا تقابلی مطالعہ:

کھدائی کے دوران ہڑپہ تہذیب کے مقامات سے کئی پتھر سے بنی اشیا ومصنوعات جیسے مجسمے، ستون، دائرے، انگوٹھیاں، تسبیح کے دانے، مالا، تول، ہاتھ چکیاں، موسل، برمے، کاٹنے وتراشنے کے آلات وغیرہ دریافت ہوئے ہیں۔ چقماق ہڑپا تہذیب کی مشہور ایجاد ہے جو اس زمانے میں پتھر سازی کی صنعت میں کلیدی اہمیت کی حامل تھی۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کی اشیا کی ایک بڑی تعداد جیسے پتھر کے بنے دائرے، انگوٹھیاں، ہاتھ چکیاں، موسل، ہاون، برمے، رانپی، کھرپی، کلہاڑی، چقماق پتھر، بیلچے، چاقو، چھینی، دودھار سنان، فصل کاٹنے والے پھوڑے، برچھی وغیرہ برآمد ہوئے ہیں۔ جدید زمانۂ حجر کے پتھر کے آلات ومصنوعات کی خصوصیات ہڑپہ تہذیب کے پتھر کے آلات ومصنوعات سے بالکل مختلف دیکھنے میں آئے ہیں۔ جدید زمانۂ حجر کی اکثر اشیا تراشی ہوئی پیر پنجال ساخت کی بنی ہوئی ملی ہیں۔ پتھر کے آلات کا استعمال بیشتر جدید زمانۂ حجر کے دوران بڑے پیمانے پر پایا گیا ہے۔ ہاتھ چکیاں، برمے، برچھیاں، موسل اور کاٹنے کے آلات کا استعمال دونوں تہذیبوں میں عام پائے جاتے تھے۔

جمادات (مال مویشیوں) کا تقابلی مطالعہ:

کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ تہذیب کے لوگ جانوروں کا شکار اور پشو پالن کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ جدید زمانۂ حجر کے دریافت شدہ اکثر ہڈیوں پر چھید دار کاٹ اور پوست کے نشانات پائے گئے ہیں جسے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ ان جانوروں کو خوراک اور غذائی ضروریات کے لئے ذبح کیا جاتا رہا ہوگا۔ دریافت شدہ ہڈیوں کی پیمائش سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہڈیاں جنگلی مویشیوں کی رہی ہیں جو ہیئت و

جسامت کے لحاظ سے پالتو مویشیوں کی نسبت بڑے اور بھاری بھرکم رہے ہیں۔ جنگلی اور پالتو مویشیوں کی ہڈیوں کا ایک ساتھ پایا جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور اس کے بعد کے لوگ جنگلی جانوروں کا شکار اور پشو پالن دونوں کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ ہڑپہ دور کے پالتو جانوروں میں مویشی اور بھینس زیادہ پائے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بھیڑ اور بکریوں کے آثار بھی بڑی مقدار میں پائے گئے ہیں۔ کئی جنگلی جانوروں اور کچھ پرندوں کی باقیات کی بھی کھدائی کے دوران نشاندہی ہوئی ہے۔ اس دور کے جنگلی جانوروں جیسے ہمالیائی بکرا، بھیڑ، سوٗر، بھیڑیا، لال ہرن، نیلی گائے، چوہے، خرگوش وغیرہ کے شواہد بھی ملے ہیں۔ جب کہ جدید زمانۂ حجر کے اہم اور خصوصی پالتو جانور مویشی، کتا، سوٗر، کشمیری بارہ سنگا، خمیدہ پُشت والے مویشی، بھینس، مرغا وغیرہ رہے ہیں۔ اسی طرح مختلف اقسام کے جنگلی جانوروں کے شواہد بھی ہڑپہ دور کے دوران جیسے ہرن، سور، نیلی گائے، سینگ والے مرگ، گھونس اور ہندوستانی خرگوش ملے ہیں۔ اس کے علاوہ ہڑپہ تہذیب کے مقامات سے کھدائی کے دوران اس بات کے شواہد ہاتھ آئے ہیں جسے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عہد میں مویشی، بھینس، بھیڑ، بکری، کتا اور سوٗر کچھ اہم پالتو جانور رہے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ تہذیب کے دوران پائے گئے جانوروں اور جمادات کے حوالہ سے بڑی مماثلت و یکسانیت رہی ہے۔

<u>نباتات (پیڑ پودوں) کا تقابلی مطالعہ:</u>

زمین و زراعت اور کاشت کاری جدید زمانۂ حجر اور ہڑپہ تہذیب کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کے حامل رہے ہیں۔ وادیٔ کشمیر اور سندھ سرسوتی طاس قدیم زمانے سے ہی زرعی پیداوار کے لئے بہت زرخیز رہے ہیں۔ آثار قدیمہ کی

جانب سے کی گئی کھدائی کے دوران ایسے شواہد ملے ہیں کہ ان خطوں کے لوگ گندم، باجرہ، جواور چاول کی کاشتکاری کرتے تھے۔ جسے نہ صرف ان لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی تھیں بلکہ اضافی پیداوار بھی حاصل ہوتی تھی۔ مستقل اور دائمی آبی وسائل جیسے دریا، جھیل اور سالانہ سیلابوں کی وساطت سے ہر موسم کے دوران آبپاشی دستیاب ہونے سے زمین زرخیز ہوکر وہاں لہلاتی فصلوں کی کاشت ہوتی تھی۔ کھدائی کے مقامات سے نباتاتی باقیات کی دریافت سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ ان کے ہاں وسیع ومبسوط زرعی منصوبہ بندی رہی ہے اور وہ مختلف اقسام کی فصلوں، سبزیوں، اناج، میوہ جات وغیرہ کی کاشتکاری کرتے تھے۔ ''غف کرال'' اور ''برزہوم'' کے مقامات پر کھدائی کے دوران وافر مقدار میں نباتاتی باقیات کی دریافت ہوئی ہے جس میں گندم، جو، باجرہ، چاول، گیہوں، مٹر، مکی، دالیں، اناج وغیرہ شامل ہیں۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے لوگ ابتدائی زمانے میں خودرو جو اور گیہوں کو کھانے کے لئے استعمال میں لاتے تھے۔ بعدازاں انہوں نے گیہوں، جو اور چاول کی کاشت کا آغاز کیا۔

برزہوم کے مقام پر Triticumsphearococum اور Triticumcompactum نامی دوقسم کے گیہوں کی باقیات کی دریافت ہوئی ہے۔ کانسپورہ کے جدید زمانۂ حجر کے مقام پر Triticumdicocum نامی گیہوں کے قسم کی دریافت ہوئی ہے۔ Triticumsphearococum اور Triticumdicoccum اقسام کے گیہوں کی کاشت ہڑپا تہذیبی خطوں میں وسیع پیمانے پر کی جاتی تھی۔ برزہوم کے مقام پر صرف چھلکے دار جو کی باقیات کی نشاندہی ہوئی ہے جب کہ ہڑپہ مقامات پر جو کی دو اقسام چھلکے دار اور بغیر چھلکے کے پائی گئیں ہیں۔ کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے مقامات پر خودرو چاول اور کاشت کئے ہوئے چاول کی کئی اقسام دریافت ہوئی ہیں۔ خودرو اور کاشت ہوئے چاول اور جو کی

باقیات کی موجودگی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں خود رو اناج کے بعد باضابطہ طور پھر چاول اور جو کی کاشتکاری کا آغاز ہوا ہے اور اس کی کاشت کاری پیشہ کے طور شروع ہوگئی ہے۔ ہڑپہ تہذیب کے مقامات سے نباتاتی باقیات کی وافر مقدار دریافت ہوئی ہے جس میں چھلکے دار جو، بغیر چھلکے کا جو، گندم کی کئی اقسام، چاول، خودرو چنا، سبز چنا، خودرو مٹر، مٹر کی کئی اقسام لہسن، کھجور، انگور، آم وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح سے ہمیں یہ شواہد بہم ہوئے ہیں کہ دونوں ثقافتوں میں ایک ہی طرح کی فصلوں کی کاشت ہوتی تھی اور ایک ہی قسم کے اناج اور دیگر نباتات پائے جاتے تھے۔

تجہیز و تدفین کے عمل کا تقابلی مطالعہ:

کھدائی کے دوران دریافت شدہ آثار سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ دونوں ثقافتوں میں پائے جانے والا تجہیز و تدفین کا عمل مشابہ اور تقریباً ایک جیسا رہا ہے۔ کھدائی کے دوران کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے مقام سے لمبائی میں پھیلے ہوئے انسانی جسم کی قبر کے اندر تدفین کی گئی ہے۔ کئی قبروں کے اندر پیلی مٹی کے چراغ دان پائے گئے ہیں۔ کشمیر کے قدیم عہد کے مقام سے کھدائی کے دوران انسانی جسم کے ساتھ قبر میں مجموعہ ظروف، تانبے کے دانے اور پتھر کے برتن دفن کئے ہوئے ملے ہیں۔ تجہیز و تدفین کا اسی طرح کا طرز عمل ہڑپا عہد کے دوران بھی پایا گیا ہے۔ برزہوم کے مقام پر کھدائی کے دوران اسی شکل و صورت کی طویل قبروں کی دریافت ہوئی ہے جو ہڑپہ تہذیب کے قبرستان کی قبروں کے ہو بہو پائی گئی ہیں۔ مماثلت اور مشابہت قبروں کی لمبائی، چوڑائی، اونچائی، سر کی چوڑائی، ارضی احاطہ، دائرے کی چوڑائی وغیرہ سے مزید نمایاں اور واضح ہو جاتی ہے۔ دیگر پیمائشی خصوصیات اور علامتوں سے برزہوم کے مقام پر دریافت ہوئی عورتوں کی قبروں کو ہڑپا تہذیب کی قبروں سے تقریباً ہو بہو اور ہم شکل پایا گیا ہے۔

کشمیر کی معتدل آب وہوا اور ساز گار ماحولیاتی صورت حال کا ابتدائی خانہ بدوش آبادی اور کاشت کاری کرنے والے لوگوں کا یہاں مستقل طور پر آباد ہونے اور رہائش اختیار کرنے میں اہم کردار رہا ہے۔اس خطے میں آبائی وسائل اور موافق زرعی مواقع کی فروانی دستیاب رہی ہے جس کے سبب یہاں قدیم انسانی آبادی مقیم ہوکر مستقل طور رہنے لگی۔ یہاں پائے جانے والے دریاؤں،چشموں، ندی نالوں، آبشاروں اور بڑی جھیلوں کی صورت میں پانی کے ذخائر سے جہاں انسانی زندگی کا گزر بسر کرنا ممکن ہوا ہے وہیں کاشت کاری کے لئے زرخیز اراضی اور آبپاشی کے وسائل اور ذرائع کی دستیابی کا بھی لازمی طور کلیدی کردار رہا ہے۔ یہاں موجود فطری جمادات ونباتات کی متنوع اقسام بھی نسل انسانی کی افزائش ونشوونما اور آبادی کے مستقل قیام کے لئے معاون رہا ہے۔قدرت نے اس خطے کو ہر رنگ سے مالا مال کر رکھا ہے۔قدرتی وسائل جیسے جنگلات، پانی،معدنیات،زرخیز اراضی،آبپاشی کے ذرائع،موافق ماحولیات وغیرہ اس خطے کی امتیازی خصوصیت اور شان ہے۔ان ہی ساز گار ماحولیاتی مواقع کے سبب اس خطے میں جدید زمانۂ حجر کی انسانی آبادی نے یہاں ایک سماج کی صورت اختیار کی اور پھر ترقی پا کر باضابطہ ایک منظّم ثقافت کی صورت میں پروان چڑھی۔قدیم عہد کی یہ ثقافت یہاں مستقل طور آباد ہوکر باقاعدہ اپنی روایات،رسوم ورواج کو آگے بڑھاتی گئی۔انہوں نے دنیاداری کے لئے کامیاب تجارتی نظام تشکیل دے کر معاصر ثقافتوں کے ساتھ کاروبار اور تجارت کا آغاز کیا۔ کھدائی کے دوران کشمیر کے جدید زمانۂ حجر کے مقامات پر ہڑپہ تہذیب کی چیزیں جیسے آتش دان، چولہے، چھید والے مٹکے،لمبی گردن والی ہانڈیاں، تانبے اور پتھر کی اشیا، زیورات، برتن وغیرہ پائے گئے ہیں جو اس کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے کہ دونوں قدیم ثقافتیں ایک دوسرے کی معاصر رہی ہیں وہیں دونوں کے مابین گہرے سماجی،تجارتی

اور دیگر روابط رہے ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے کی تہذیب وتمدن پر اثرات بھی مرتب کئے ہیں۔

ہڑپہ تہذیب اور کشمیر کے جدید عہد کے آثار قدیمہ کے مختلف مقامات کی کھدائی کے دوران برآمد شدہ مختلف اشیا و باقیات وغیرہ کی فہرست کے جائزے سے یہ بات صراحت کے ساتھ عیاں ہو جاتی ہے کہ دونوں قدیم معاصر تہذیبوں کے درمیان چار ہزار سال قبل مسیح سے نزدیکی ثقافتی وتمدنی تعلقات اور روابط رہے ہیں۔ وہ چاہے کوزہ گری سے متعلق دریافت شدہ آثار اور اشیا ہوں یا رہن سہن اور بود و باش سے متعلق غار نما رہائشی مسکن و تعمیرات کا انداز ہو یا پتھر، ہڈیوں، دھات اور تانبے سے بنے زیورات، آلات، ساز و سامان ہوں، کاشت کاری، زرعی سرگرمیوں کے لئے استعمال میں لائے جانے والے اوزار اور ہتھیار ہو یا جمادات و مویشی پالن و نباتات کا استعمال اور یہاں تک کہ انسان کو آخری سفر پر روانہ کرنے کا عمل یعنی تجہیز و تدفین کا طریقہ کار ہو دونوں ثقافتوں کے درمیان ایک طویل باہمی میل جول، ہم آہنگی، یکسانیت، مشابہت و مطابقت اور تال میل کی نشاندہی کرتا ہے۔ دریافت شدہ جماداتی ونباتاتی باقیات کے مطالعہ سے تخمینے اور اندازے ثقہ معلومات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شائبہ نہیں ہے کہ یہ دونوں معاصر ثقافتیں رہی ہیں اور آپس میں تجارتی درآمد و برآمد کے روابط کے ساتھ بھی منسلک رہے ہیں۔ ان کے تعلقات کی کئی جہتیں رہی ہیں جس کے نتیجے میں ایک دوسری کی ثقافت وتمدن سے اثر انداز بھی رہے ہیں۔ کشمیر میں جدید زمانۂ حجر سے متعلق جانکاری و معلومات تین مشہور آثار قدیمہ کے مقامات برزہوم، غف کرال اور کانسپورہ کی کھدائی کے دوران ملے آثار اور باقیات سے ملی ہیں۔ حالانکہ یہاں کشمیر میں کئی اور جدید زمانۂ حجر کے مقامات موجود ہیں جہاں ہنوز کھدائی ہونا باقی ہے۔ ان مقامات کی کھدائی کرنے سے دونوں

تہذیبوں کے باہمی ثقافتی وتمدنی روابط اور تجارتی و دیگر تعلقات سے متعلق مزید اور مفصل جانکاری اور معلومات فراہم ہوسکتی ہیں۔ ●●●

کتابیات

(1) Agrawal, D. P., 2007, The Indus Civilization: An Interdisciplinary Perspective, New Delhi: Aryan Books International.

(2) Fonia: Burzahom Excavation Report, 1960-71.

(3) Khatri, J. S and M. Acharya,1997, Kunal: The Earliest Pre-Harappan Settlement, In facets of Indian Civilization, Recent Perspectives-Essay in Honor of B.B Lal (ed.) J.P. Joshi, New Delhi: Aryan Books International.

(4) IAR: Archaeological A review, 1961-62; 1980-81.

(5) Archaeological A review, 2004-05.

(6) Mani, B.R., 2000, Excavations at Kanispur: 1998-99 (District Baramulla Kashmir), Journal of Interdisciplinary Studies in History and Archaeology 10.

(7) Mani, B.R., 2006, Kashmir Neolithic and Early Harappan : A Linkage, Prgadhara 18.

(8) Sharma, A.K., 2000, Early Man in Jammu Kashmir and Ladakh, New Delhi: Agam Kala Prakashan.

(9) Shinde, Vasant, P. B. S. Senger, Nilesh Jadhav, Aftab Hussain, Narender Parmar, Kanti Pawar, P. D. Sable and Nilanshu Kaushik, 2011-12, The Late Harappan Culture at Karsola in the Ghaggar Basin, Bulletin of Deccan College Post Graduate and Reserach Institute.

(10) Mcintosh, J. R., 2008, The Ancient Indus Valley: New Perspectives, California: ABCCLIO.

☆......عبدالغنی شیخ

سلک روٹ: دنیا کی قدیم ترین شہراہ

سلک روٹ یا شاہراہ ابریشم قدیم دُنیا کی سب سے مشہور، لمبی اور پُر اسرار شاہراہ ہے جو روئے زمین پر انتہائی دشوار گزار خطوں سے گزرتی تھی۔ یہ چین سے ہوتی ہوئی یورپ میں قدیم سلطنتِ روما تک جاتی تھی۔ چین کے شہر گوانگ زہو سے بحر روم کی بندرگاہ تک اس کی لمبائی تقریباً پندرہ ہزار کلومیٹر تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک مال واسباب کی نقل وحمل میں ایک سال کا عرصہ لگتا تھا۔ شاہراہ پر بہت سارے شہر، قصبے اور بستیاں آباد تھیں۔ مسافروں اور تاجروں کی رہائش کے لئے جابجا سرائیں بنی تھیں اور مال کی نمائش اور خرید وفروخت کے لئے ایمپوریم بنے تھے۔ چینی ترکستان (موجودہ شین جیانگ) کا شہر کاشغر سلک روٹ کے تقریباً مرکز میں تھا۔

تجارت کی وجہ سے ان شہروں اور قصبوں کو بڑا فائدہ پہنچتا تھا اور لوگ بڑے خوش حال تھے۔ اس شاہراہ سے صدیوں تک تاجر، مبلغ، یاتری، فوجی اور مسافر ہو کر گزرے ہیں۔ جہاں جہاں سے لوگ گزرتے تھے وہاں وہ اپنی تہذیب کی چھاپ اور نشان چھوڑتے تھے۔

سلک روٹ ریگستانوں سے گزرتا تھا۔ جہاں دریا بہتے تھے اور جابجا چشمے پھوٹتے تھے۔ جہاں جہاں پانی تھا، وہاں نخلستان تھے اور انسانوں کی آبادی تھی۔

اس شاہراہ اور اس سے منسلک دوسری شاخوں کی شاہراؤں پر مختلف اقسام کے مال واسباب سے لدے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں باندھے اونٹوں، گھوڑوں اور

دوسرے بار بردار جانوروں کی لمبی قطاریں گزرتی تھیں۔تصور کی آنکھوں کے سامنے جب وہ نقشہ آتا ہے تو ذہن پر عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

جرمنی کے ایک محقق اور جغرافیہ دان Baron Von Richthofen نے ریشم کی مناسبت سے اس شاہراہ کا نام سلک روٹ رکھا۔ ریشم رومن شہریوں میں بڑا مقبول تھا۔ وہ اسے اپنا مخصوص لباس بنا کر پہنتے تھے جو ٹو گلاس کہلاتا تھا۔ چوتھی صدی میں سرکاری سطح پر ریشم کی درآمدات میں اتنا اضافہ ہوا کہ بازنطین حکومت (مشرقی روم کی حکومت کا خزانہ خالی ہو گیا۔

اس خطے میں ایشیا کی چار اہم تہذیبی اکائیاں چین، برصغیر ہندوستان، سنٹرل ایشیا اور ایران شامل ہیں، جن کو ایک جغرافیہ دان نے ٹرانس ہمالین کا نام دیا ہے۔ پامیر، گلگت، بلتستان، لداخ، مغربی تبت اور ہماچل پردیش کے متصلہ علاقوں کو مغربی ٹرانس ہمالین کہا جاتا ہے۔ان علاقوں سے سلک روٹ کی تین اہم شاخیں گزرتی تھیں۔

یہ خطہ، خاص کر سنٹرل ایشیا، محققوق اور سائنس دانوں کے لئے ہمیشہ سے باعث کشش اور پُر اسرار رہا ہے اور دنیا اس سے متعلق زیادہ جانکاری حاصل کرنا چاہتی ہے۔ دنیا کے بہت سارے ملکوں میں سنٹرل ایشیا سے متعلق تعلیمی اور تحقیقی ادارے ہیں۔ ان میں امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، چین، ہندوستان اور جاپان شامل ہیں۔

سلک روٹ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کم از کم دو سو سال پرانا ہے اور یہ چین اور رومن حکومتوں کے مابین تجارت کے لئے بنایا گیا۔ تجارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے چین کے شہنشاہ کے قاصد ژانگ قیان نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ملکوں کے ساتھ بھی تجارتی راہیں کھلیں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے۔

چین سے ریشم، کاغذ، چھپائی کا سامان، بلوریں برتن اور ہارڈ وڈ برآمد ہوتے

تھے۔ وسط ایشیا سے گھوڑے، عطریات، نیل کے بنے رنگ، ناشپاتی اوراخروٹ وغیرہ برآمد کئے جاتے تھے۔ ہندوستان کی برآمدات میں کپاس ، کالی مرچ اور صندل کی معطرلکڑی شامل تھی۔ مغرب سے شیشے اور شیشے کے آرائشی سامان مشرقی ممالک برآمد کئے جاتے تھے۔ مغرب سے انگور کی بیلیں بھی آئیں اور مشرق نے شراب کشید کرنا سیکھا۔

تجارت کے فروغ کے ساتھ ان خطوں کی مصنوعات کی درآمدات اور برآمدات میں اضافہ ہوتا گیا اور تجارت کے لئے مال پر محصولات لئے جاتے تھے۔ لیکن سلک روٹ صرف تجارت کا نام نہیں ہے، مادی ترقی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک تہذیب، تمدن اور ثقافت کا نام ہے۔ سلک روٹ اوراس کی شاخوں کے راستوں سے دنیا کے بڑے مذاہب کشمیر تک پہنچے۔ سلک روٹ نے ایک دوسرے کو اپنی تہذیب، کلچر، علم وعرفان اور فنونِ لطیفہ سے روشناس کیا جن کی وجہ سے مشرق اور مغرب پر دُوررس اثرات پڑے۔ یہی خصوصیات سلک روٹ کی تاریخی اہمیت کو بڑھاتی ہیں اور عالموں اور محققوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

اس شاہراہ نے ہندوستان سے بدھ مت، مشرقی روم سے نسطوری عیسائیت NESTORIANISM ایران سے مانی کے ازم (MANICHAEISM) اور پارسی مذہب اور عرب سے اسلام لایا۔ سلک روٹ چینی ترکستان کے ریگستان تکلا مکان سے گزرتی تھی۔ تکلا مکان کا مطلب ''اوگیور ترکوں کی زبان میں اندر جاؤ گے تو واپس نہیں آؤ گے'' ہے۔ کیونکہ کئی دفعہ یہاں کارواں راستے سے بھٹک جاتا اور ریت کے ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں غائب ہوجاتا تھا۔ پھر اُن کی صرف ہڈیاں ہی ملتی۔

تکلا مکان کا رقبہ تین لاکھ پچاس ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ یہاں رنگ برنگے پتھر پائے جاتے ہیں۔ تیز آندھیاں چلتی ہیں اور ریت کے بگولے اٹھتے ہیں۔ چین نے تکلا مکان کے ''لوب نور'' کے مقام پر اپنے نیوکلائی تجربے کئے ہیں۔

ایک مغربی مشاہد نے لکھا ہے کہ ختن اور شین جیا نگ کی راجدھانی ارومچی کے درمیان ہوائی اُڑان کے دوران تکلا مکان کا منظر بڑا خوبصورت اور دلکش لگتا ہے۔ سلک روٹ پر تجارت کے عروج کے دوران ریگستان میں بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ایک محقق نے لکھا ہے کہ ان بستیوں کی تعداد ڈھائی سو سے تین سو کے درمیان تھی۔ سنٹرل ایشیا میں بودھ مذہب کے دور میں ان بستیوں سے ناقوس، سنکھ، ڈھول، جھانجھ، اور تر ہی کی آوازیں گونجتی تھیں اور جب اسلام آیا تو مسجد کے میناروں سے اذان کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

جغرافیائی محرکات اور آب و ہوا کے تغیر و تبدل کی وجہ سے یہاں بستیاں اور انسانوں کی آبادی ختم ہوئی۔ دریاؤں کا رُخ بدل گیا یا اُن میں پانی گھٹ گیا۔ چشمے سوکھ گئے۔ ریت کے بگولے اُٹھنے لگے۔ نخلستان ریگستان میں جذب ہونے لگے اور بستیاں زیرِ زمین دب گئیں۔

مغربی سیاح مارکو پولو نے اپنے سفر نامہ میں ریگستانی حصے کی سلک روٹ پر اپنے مصائب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سفر کے پہلے دن مشکل ترین تھے۔ اس دوران ایک دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد پانی ملتا تھا۔

ریگستان میں عجیب و غریب آوازوں کے آنے کا تذکرہ ہے۔ جیسے موسیقی کے بہت سارے آلات بجائے جا رہے ہوں۔ خاص طور پر ڈھولوں، دماموں اور ہتھیاروں کے ٹکراؤ کا گماں ہوتا تھا۔ ہوائیں چلنے سے آوازیں زیادہ آتی تھیں۔ پہلے ان آوازوں کو بھوت پریت کا کام سمجھا جاتا تھا یا ان مقامات پر مرنے والے مسافروں کی بدروحوں کی کارستانی بتائی جاتی تھیں۔ ایک جگہ سے متعلق یہ روایت ہے کہ وہاں ایک ہزار سال پہلے دو برسرِ پیکار فوجیں ریگستانی طوفان کے دوران ریت کے نیچے دب گئی تھیں۔

سلک روٹ ایک جگہ منحنی سا دائرہ بناتا تھا۔شمال کی جانب یہ ترپان قصبے کی طرف جاتا تھا۔ یہ راستہ نخلستانی قصبوں سے گزرتا تھا اور آمد ورفت کے لئے بہتر تھا۔ دوسرا راستہ مغربی لولن کی طرف جاتا تھا جہاں سے جنوب مغرب کی طرف ختن سمیت کئی نخلستانی قصبوں سے ہوتا ہوا کاشغر میں شمالی راستہ سے ملتا تھا۔

سلک روٹ سے کئی شاخیں نکلتی ہیں اور مختلف خطوں سے ان کا رابطہ ہوتا ہے۔ایک اہم شاخ کاشغر سے ہوتے ہوئے پاکستان کے زیریں شمالی علاقہ میں داخل ہوتی تھی اور شمالی ہندوستان جاتی تھی۔دوسری اہم شاخ کاشغر،قراقرم،لیہہ کا تجارتی راستہ تھا جو لیہہ سے سرینگر جاتا ہے۔اس راستے کو Treaty Road بھی کہا جاتا ہے۔اس راستے پر چینی ترکستان کا شہر یارقند نہایت ہی اہم تجارتی مرکز تھا۔ سلک روٹ سے ایک اور راستہ پاکستان کے شمالی علاقہ میں آتا تھا۔بہترہ اس راستے پر پڑتا تھا۔اس راستے کو جبین روڈ کا نام دیا گیا۔

سلک روٹ کے عروج کے زمانے میں پامیر کی بڑی اہمیت تھی۔نویں اور دسویں صدیوں میں سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے سلک روٹ کی تجارت کو دھکا لگا اور تجارتی قافلوں کی آمد ورفت میں بڑی کمی آئی جس کے نتیجے میں سنٹرل ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تجارت پامیر سے شمالی قراقرم کے دروں سے گزرنے والے راستوں پر منتقل ہوئی۔دسویں صدی کی ایک تاریخی تصنیف ''حدود عالم'' میں لکھا ہے کہ کاشغر لیہہ شاہراہ پر ان دنوں اچھی تجارت ہوتی تھی۔ کاشغر،لیہہ شاہراہ سے سرینگر کے علاوہ لیہہ سے ہماچل پردیش اور تبت کے لئے تجارتی راستے بنے تھے جن پر تجارتی قافلوں اور مسافروں کی آمد ورفت تھی۔

سنٹرل ایشیا میں بدھ مت ایک صدی قبل مسیح پھیلا۔شمالی ہند سے آئے ہوئے آریائی نسل کے بودھ تاجروں، پروہتوں اور سنتوں نے یہاں ریگستانوں

میں ساتھ ساتھ مٹھ، محلات اور رہائشی عمارتیں تعمیر کیں۔ شاہکار تصویریں بنائیں۔ چٹانوں پر تحریریں اور تصویریں تراشیں۔ مدتوں پہلے یہ شہر اور قصبے اگر چہ ریت کے نذر ہو گئے تاہم آثار باقی ہیں۔ اُن کے تخلیق کردہ آرٹ کے خوبصورت نمونے دنیا کو آج بھی ورطۂ حیرت میں ڈالتے ہیں۔

کنشک کے دور حکومت میں سلک روٹ کے شمالی علاقے سے گزرنے والے ذیلی راستے سے چین اور ہندوستان کے درمیان براہ راست آمد و رفت قائم ہوئی اور چین اور کشان خاندان کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ تیسری صدی میں سنٹرل ایشیا میں بودھ مٹھ اور ستوپا تعمیر ہوئے جن کا چٹانوں پر کھدی تحریروں میں ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھی اور ساتویں صدی کے درمیان ہندوستان سے متعدد عالموں کو بودھوں کی کتب کے ترجمے اور توجیہات کے لئے سنٹرل ایشیا اور چین مدعو کیا گیا جن میں کمارجیوا جیسے مشہور عالم شامل تھے۔ ساتویں صدی میں کاشغر میں کئی سو بودھ خانقاہیں تھیں جن میں دس ہزار بھکشو تھے۔ ختن اور کوچا کے شہروں میں تقریباً پانچ ہزار بھکشو تھے۔ گلگت اور بلتستان میں بھی بدھ مت کا غلبہ تھا جس کا ذکر فاہیان اور ہیون سانگ نے بھی کیا ہے۔

سوات نے سنٹرل ایشیا کو وجرا یوگنی کا فلسفہ دیا اور ختن سے کالا چکرا آیا۔ آج کل دلائی لاما وقتاً فوقتاً کالا چکرا کے فلسفہ پر اپدیش دیتے ہیں جنہیں سننے کے لیے خاص طور پر تبتی اور لداخی بودھ بڑی تعداد میں حاضری دیتے ہیں۔

سنٹرل ایشیا کا شہر ختن بودھوں کا روایتی مقدس روحانی شہر شمبھالا سمجھا جاتا ہے۔ بدھ مت کے بعد مانی کے ازم MANICHAEISM اور نسطوری عیسائیت سنٹرل ایشیا پہنچی اور بدھ مت کے ساتھ ساتھ ان مذاہب کی اشاعت ہونے لگی۔ ان

بدھ مت کے پیروکاروں نے عبادت گاہیں اور رہائشی مراکز تعمیر کئے۔

مانی کے ازم کا بانی مانی تھا، جس نے تیسری صدی میں ایران میں اس فرقے کی بنیاد ڈالی تھی۔ مانی نے پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ اس مذہب کے پیروکا مسئلہ تاریخ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ گوشت نہیں کھاتے اور دن میں کئی دفعہ عبادت کرتے تھے۔ برت رکھنا اور دان دینا اس فرقے کے عقائد میں داخل تھا۔

مانی کے ازم عیسائی کلیسا کے خلاف ایک حریف کی حیثیت سے ابھرا۔ موخر الذکر نے اس کی تعلیمات کو الحاد قرار دیا۔ راسخ الاعتقاد زرتشتیوں کی ایما پر اس فرقے کے پجاریوں نے مانی کو ہلاک کیا۔ یہ فرقہ مصر، شمالی افریقہ اور رومی مملکت کے راستے مغرب میں پہنچا۔ چھٹی صدی میں مذہبی تشدد کا شکار ہونے کی وجہ سے یہ فرقہ مٹ گیا۔ مشرق کی جانب یہ چینی ترکستان (موجودہ شین جیانگ) پہنچا جہاں دسویں صدی تک اس کے ماننے والے موجود تھے۔

NESTORIANISM نسطوری عیسائیت کے بانی قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کے بشپ سیٹن مینو پال نسطوری تھے۔ انہوں نے پانچویں صدی میں ایک نیا مکتبۂ خیال پیش کیا جس کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اقدس انسانی اور روحانی دو ہستیوں کا مجموعہ قرار دی گئی جب کہ عیسائیوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک روحانی ہستی تھے جنہوں نے انسانی روپ اور فطرت اختیار کی تھی۔ پرانے عقائد کے ماننے والوں نے نسطوری عقیدے کی سخت مذمت اور مخالفت کی۔ نسطوریوں کے مذہبی ادارے کو بند کیا اور جو تھوڑے نسطوری ان سے بچ گئے، وہ ایران چلے گئے۔ ساتویں صدی کی پہلی نصف صدی کے دوران ایران پر عربوں کا تسلط ہوا اور نسطوری عیسائیت کو ایک مذہبی فرقے کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ آج کل اس فرقے کے پیروکار ایران کے علاوہ عراق اور شام میں آباد ہیں۔

ساتویں صدی میں تبت ٹرانس ہمالیائی خطے میں ایک اہم سیاسی طاقت کی حیثیت سے ابھرا اور اس صدی کے آخری ربع میں تبّتی فوجیں لداخ اور بلتستان کے راستے سنٹرل ایشیا میں داخل ہوئیں۔ سلک روٹ پر واقع شہر ختن، کوچا اور دونگ ہانگ فتح کئے۔ ان فتوحات کی وجہ سے تبت کو نہ صرف مادی طور فائدہ ہوا بلکہ یہ ثقافتی لحاظ سے بھی مستفید ہوا۔ سنٹرل ایشیا پر تبت کے بدھ مت کا اثر پڑا بلتستان اور لداخ نے تبّتی زبان اور کلچر اختیار کیا۔

آٹھویں صدی کے دوران یہ خطہ کئی طاقتوں کی کشمکش کی آماجگاہ بنا۔ اس وقت کے حکمران للتادتیہ نے سنٹرل ایشیا میں اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ پھر عرب اس خطے میں داخل ہوئے۔ چینی حکمران اور للتادتیہ نے تبت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور تبتیوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ۷۵۱ء میں عربوں نے وادی تلاس میں چین کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کشمکش میں عربوں کا پلہ بھاری رہا اور سنٹرل ایشیا پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح آٹھویں صدی میں سنٹرل ایشیا میں اسلام نے جڑ پکڑ لی اور اگلی دو یا ڈھائی صدیوں میں سنٹرل ایشیا کے لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

عربی کے دو کتبوں کے مطابق خلیفہ المامون (۸۳۳ء-۸۱۳ء) کے دور حکومت میں بلتستان اور تبت تک اسلام کی اشاعت ہوئی۔ تاہم تاریخی طور اس کی توثیق نہیں ہوتی ہے۔ بلتستان اور لداخ میں اسلام کا وروداس کے کئی صدیوں بعد ہوا۔ سنٹرل ایشیا کے انمول ورثہ سے متعلق دنیا کو جانکاری بیسویں صدی کے آغاز میں آثار قدیمہ کی کھدائی اور کھوج کے دوران ہوئی۔ کئی ملکوں کے ماہرین نے اس سلسلے میں کام کیا۔ اس میں اہم نام جرمن کے سرارل سٹین (SIR ARALSTEIN)، البرٹ دون لے کوگ (Albert von le cog)، فرانس کے رائل پیلیوٹ (Ranal Pelliot)، سویڈن کے سون ہیڈین (Seven Hedin)

، امریکہ کے لنگ ڈون ورنر (Langdon Warner)، جاپان کے کاؤنٹ اوٹانی (Count Otani) اور روس کے اولڈن برگ (Olden burg) اور کوزلوف (Kozlov) شامل ہیں۔

سلک روٹ پر متعدد مقامات پر ایک ہزار غار دریافت ہوئے۔ان میں چند مقامات سے جی شان، بینگ میلیسی ،موگاؤ، بے زیک لیگ اور قیز یل ہیں جن میں بدھ کی خوبصورت تصویریں بنائی گئی ہیں اور جن کے حسن، نفاست اور نزاکت کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ان تصویروں کی وجہ سے ان غاروں کو ریگستان میں آرٹ کے شاہ پاروں کی گیلری کہا گیا ہے۔بودھ آرٹ سنٹرل ایشیا میں لگ بھگ دوسری صدی میں آیا۔کئی غاروں میں سنسکرت، چینی، برہمی ، کھر دشتی، شاردا، سریانی اور دوسری زبانوں کے متعدد مخطوطات ملے۔ایک خود ساختہ نگران راہب نے بہت سارے مخطوطات غیر ملکی ماہرین کو فروخت کئے۔

ماہرین کے مطابق غاروں کی دیواری تصاویر اور مورتیاں گندھارا آرٹ کے اعلیٰ نمونے ہیں جن پر یونانی، ایرانی، چینی اور ہندوستانی آرٹ کے مختلف اسکولوں کے اثرات نظر صاف آتے ہیں۔

دسویں صدی کے لداخ کے اچھی وہار اور ہماچل پردیش میں سپیتی کے تابوکنہ پر بھی اس مخلوط آرٹ کی نمایاں چھاپ ہے۔دون ہانگ کے موگاؤ غاروں کی تصاویر پر گندھارا آرٹ کا نمایاں اثر بتایا گیا ہے۔ان کی فنی غنائیت اور پختگی کے لئے مطالعات دون ہانگ DUNHAUNGOLOGY کے شعبے کے قیام کی بین الاقوامی سطح پر تحریک چلی ہے تا کہ اس کی تصاویر مخطوطات اور سنگ تراشی کے کام کی تحقیق ہو اور انہیں منظر عام پر لایا جائے۔اِن دیواری تصاویر کی وجہ سے آج دون ہانگ سیاحت کا ایک اہم مرکز بنا ہے۔چین کی حکومت نے تمام غاروں کو سیاحوں کے

لئے نہیں کھولا ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق تین سو غار بند رکھے گئے ہیں۔

دون ہانگ میں ایک خوبصورت جھیل ہے جو ہلالی جھیل کے نام سے مشہور ہے۔اس سے متعلق ایک مقولہ ہے کہ:

''انسان کی صلاحیت نے ہزار بدھ والا غار بنایا اور قدرت نے ہلالی جھیل بنائی۔''

سفر کے دوران بحفاظت پہنچنے پر شکرانے کے طور پر ان غاروں میں تصویریں بنانے کے لئے مسافر اور تاجر چندہ دیتے تھے اور منتیں مانگتے تھے کہ صحیح و سلامت اپنے گھروں کو پہنچیں۔مقامی روسا اور امرا ان کا حسن بڑھانے اور ان کے تحفظ کے لئے مالی امداد فراہم کرتے تھے۔

سلک روٹ پر تجارت کی سرگرمیوں کے زمانے میں دون ہانگ میں تاجر اونٹوں سے گھوڑوں کا تبادلہ کرتے تھے کیونکہ یہاں سے آگے تکلا مکان کا ریگستان آتا تھا۔ریگستانی سفر میں ریگستان کا جہاز 'اونٹ' کارآمد رہتا تھا۔

غیر ملکی ماہرین جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بہت سارے مخطوطات اور آرٹ کے نمونے اپنے ممالک لے گئے اور وہاں انہیں عجائب گھروں کی زینت بنایا۔

ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ تکلا مکان سے لائے گئے آرٹ کے نمونے اور نوادرات لیہ کے راستے برٹش میوزیم لے جائے گئے۔لندن، پیرس، ماسکو، ٹوکیو، لینن گراڈ، برلن اور دنیا کے کئی شہروں کے عجائب گھروں میں سنٹرل ایشیا کے نوادرات رکھے گئے ہیں۔دہلی کے نیشنل میوزیم میں بھی سنٹرل ایشیا کے آرٹ کے چند شاہ پارے موجود ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے دارالخلافہ برلن میں اتحادیوں کی بمباری کی وجہ سے آرٹ کے ان نمونوں کو جزوی طور نقصان پہنچا۔یہ برلن میوزیم میں رکھے گئے تھے۔

چین کی کمیونسٹ حکومت نے ان غیر ملکی ماہرین کو'' نوادرات کے

لٹیرے'' کہا ہے جنہوں نے اُن کے ملک کے گراں مایہ ثقافتی ورثے کو اپنے ملکوں میں پہنچا دیا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن دنوں آثارِ قدیمہ کے تحفظ کا کوئی انتظام نہیں تھا اور آرٹ کے شاہ پارے اور نوادرات غلط ہاتھوں میں پہنچ رہے تھے۔ کئی تصاویر کو سنٹرل ایشیا کے کچھ مسلمانوں نے غیر اسلامی قرار دے کر نقصان پہنچایا۔ ان ماہرین نے ان کو مزید نقصان پہنچنے سے بچایا۔

سلک روٹ اور اس کی شاخوں کی گزرگاہوں، خاص کر شاہراہِ قراقرم اور لیہہ سرینگر Treaty Road معاہداتی سڑک پر بہت سی چٹانوں پر تصویریں اور تحریریں کندہ کی گئی ہیں۔ یہ تحریریں سنسکرت، عربی، چینی، کھروشتی، براہمی، شاردا، تبتّی، سریانی، سوقدانی جو سمرقند رسم الخط سے جانا جاتا تھا وغیرہ میں ہیں اور اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہیں کہ یہ خطہ مختلف قوموں کا گہوارہ رہا ہے۔ ان میں سے بہت سی تحریریں ضائع ہو چکی ہیں۔

کاشغر، لیہہ، مغربی تبت کے تجارتی راستے پر ٹانکچھ کے مقام پر ایک سریانی تحریر چٹان پر تراشی گئی ہے جو نسطوری عیسائیوں کا کام بتایا جاتا ہے۔

حال میں ٹانکچھ اور اس کے آس پاس عربی تحریریں اور نام ملے ہیں۔ ایک محقق روہیت ووہرا نے انہیں اُن عرب کمانڈروں سے منسوب کیا ہے جنہوں نے چین کے خلاف ایک جنگ میں حصہ لیا تھا۔ یہ جنگ آٹھویں صدی میں لڑی گئی تھی۔ ایک مرحلے پر عربوں اور تبتیوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا، جس کے تحت دونوں چین سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

غالباً یہ عرب کمانڈر اسی راستے سے تبت گئے تھے۔ اُن دنوں لداخ کے اس خطے میں فوجوں کی نقل و حرکت رہتی تھی۔ کئی چینی عالم اور سیاح سلک روٹ سے شمالی علاقے میں گزرنے والے راستے سے ہندوستان آئے۔ ان میں شروع میں آنے والا

ایک اہم سیاح فاہیان تھا۔ وہ ۳۹۹ء میں چین سے سفر پر نکلا اور پندرہ سال بعد وطن واپس لوٹا۔ سون یونگ ۵۱۸ میں چین سے سوات اور گندھار آیا اور ۵۲۲ء میں واپس چین پہنچا۔ ہیون سانگ نے ۶۲۹ء میں اپنا سفر شروع کیا اور ایک لمبی مدت ہندوستان میں رہنے کے بعد ۶۴۵ء میں واپس چین گیا۔ وہ کشمیر میں بھی رہا۔

ایک کوریائی ہوئی چاؤ ۷۲۳ء میں چین کے راستے سفر ہندوستان پر نکلا اور ہندوستان میں تین سال سے زیادہ مدت گزار کر واپس لوٹا۔ کچھ لوگوں نے ہوئی جاؤ کو چینی بتایا ہے۔ ایک اور چینی اوکونگ ۷۵۹ء میں سلک روٹ کے اس ذیلی راستے سے سفر کر کے ہندوستان آیا۔ وہ تقریباً چار سال گزار کر واپس وطن لوٹا۔ ان کے سفر ناموں خاص کر فاہیان، ہیون سانگ اور اوکونگ کی تحریروں سے اس دور کے ہندوستان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے گمنام مسافر ہوں گے جو ان راستوں سے گزرے ہوں گے۔لق و دق ریگستان سے گزرنے والے سلک روٹ پر رہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ ہیون سانگ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ تاہم تجارت یہاں بہت منافع بخش تھی، اس لئے تاجر یہ خطرہ مول لیتے تھے۔

مارکو پولو لکھتا ہے کہ کئی دفعہ ریگستان میں سفر کرتے ہوئے قافلے کے افراد مختلف سمت سے آنے والے آدمیوں کے گروہ کو ڈاکو سمجھتے اور فرار ہو جاتے، پھر اصلی راستہ ملنے میں انہیں دِقت پیش آتی تھی۔

انیسویں اور بیسویں صدیوں میں ایک دفعہ پھر ٹرانس ہمالیائی خطہ رُوس، برطانوی ہند، چین اور افغانستان کے درمیان سیاسی کشمکش کی آماجگاہ بنا جسے Great Game کا نام دیا گیا۔ روس کی حکومت نے سنٹرل ایشیا کے کئی آزاد ملکوں کو اپنے قبضے میں لے لیا اور ہندوستان کی سرحد تک روسی فوج آ پہنچی۔ لداخ، ہنزہ، گلگت اور

چترال کی علاقائی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا۔ روسی پیش قدمی کو روکنے کے لئے برطانوی ہند نے فوجی اور سیاسی سطحوں پر اقدام کئے۔ سلک روٹ اور اس کی ذیلی شاہراؤں پر جہاں تجارتی قافلوں اور کاروانوں کی چہل پہل اور ریل پیل رہتی تھی، جاسوسوں اور محققوں کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔

کاشغر رُوس، برطانوی ہند اور چین کی سیاسی اور سفارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ جہاں روس اور برطانوی ہند نے قونصل خانے کھولے تھے۔ دونوں طاقتوں نے پورے خطے میں اپنی جاسوسی کا جال بچھا رکھا تھا۔ کمیونسٹ حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد قونصل خانے بند ہوئے اور ان کی عمارتیں ہوٹلوں میں تبدیل کر دی گئیں۔

سلک روٹ کے زمانے کے بہت سارے تاریخی شہر آج بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شہر اب بہت بدلے ہیں۔ ماضی میں XIAN سلک روٹ پر ایک اہم شہر تھا اور قدیم سلطنت کا دارالخلافہ بھی رہا۔ تب یہ ''چانگن'' کہلاتا تھا۔ آج یہ شانکسی صوبے کی راجدھانی ہے۔

مغرب کے ایک مشاہد نے اس شہر سے متعلق لکھا ہے:

> ''آج زیان ایک جدید شہر ہے۔ اس کی شہرت اس کے ماضی سے ہے جس کے شاندار آثار فصیلوں، مندروں اور پگوڈوں کی صورت میں موجود ہیں۔ تانگ خاندان کے دورِ حکومت (۹۰۷ء-۶۱۸ء) میں یہ شہر ترقی کی معراج پر تھا۔ اُس دور میں اس کے محلات سنٹرل ایشیا کے کوچا شہر کی موسیقی اور سمرقند اور تاشقند کے رقاصوں کے رقص کی تھرک سے گونجتے تھے۔ اس کے بازار غیر ملکی تاجروں سے بھرے رہتے تھے اور درآمدی تعیش اور آرائشی اشیا سے اس کی منڈیاں بھری رہتی تھیں۔ اس کی خانقاہوں میں عالم بھکشو سنسکرت میں لکھے بودھوں کے صحیفوں کا ترجمہ کرنے میں منہمک

رہتے تھے۔اس شہر میں تیسری صدی قبل مسیح کے قدیم شہنشاہ قینشی ونگدی
کے دور کے زیرِ زمین قبرستان سے نکلے ہوئے ٹیرا کوٹا کے بنے جنگجو آج
کی مہذب دنیا کے لئے ایک عجوبہ ہیں۔شہنشاہ نے چین کو متحد کیا تھا۔''

گانسو صوبے میں لن زہو سے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ سرحدی قصبہ جیسا لگتا ہے۔اگر چہ چینیوں کی آبادی ۹۷ فیصد ہے تاہم یہاں بعض مسلمان بھی آباد ہیں۔ان کے ناک نقشے عربی ہیں جو اِن کے اصلی وطن اور تاریخ کی نشان دہی کرتے ہیں۔اس شہر کی بھیڑ بھاڑ میں ترک ہمتی اور منگول چہرے پہچانے جاسکتے ہیں۔

شہر کے اوپر تلے پن بجلی کے بندھ دریا میں پانی کے بہاؤ روکتے ہیں یہاں کبھی پانی سے سفر کرنے کے لئے ہوا بھری جانوروں کی کھال کی کشتی استعمال ہوتی تھی۔

لنز وھو کے شمال مغرب میں چھوٹا سا قصبہ آنکسی ہے۔چند جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ سلک روٹ کی تجارت کے عروج کے دور میں یہ ایشیا کے مرکز میں واقع تھا۔آج بھی آنکسی وسط ایشیا کی اہم تجارتی شاہراہ کے سنگم پر واقع ہے۔آج بس میں سفر کرنے والے مسافر یہاں پہنچ کر کھانے کے لئے رُکتے ہیں۔

سلک روٹ کے تجارتی دور میں گانسو کی گزرگاہ Corridor کے کنارے پر واقع قصبے بڑے خوش حال تھے۔ یہاں بہت ساری کارواں سرائیں تھیں۔ جہاں مشرق اور مغرب تجارت پر جانے والے تاجر قیام پذیر ہوتے تھے۔گانسو کی گزرگاہ میں چین کی سرکاری چراگاہیں تھیں جہاں ریشم اور چائے کے عوض گھوڑوں کا تبادلہ کیا جاتا تھا۔

سلک روٹ پر جب کارواں رواں دواں تھے تو شین جیانگ (چینی ترکستان) کی بڑی اہمیت تھی۔اس کے شہر اروچی کی خاص حیثیت نہیں تھی۔ یہاں

چینی فوج کی چھاؤنی تھی۔ ارومچی آج شین جیا نگ کا دارالخلافہ ہے اور ایک جدید شہر ہے۔

سلک روٹ سے متعلق حال ہی میں چھپی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اُرومچی اور کاشغر کے درمیان شاہراہ پر واقع خوابیدہ قصبے آج بھی زمانہ وسطیٰ کی یاد دلاتے ہیں۔ ہفتے میں ایک روز یہاں بازار لگتے ہیں۔ اوگیورتر کی گدھے گاڑیوں پر چیزیں بیچنے کے لئے لاتے ہیں۔ ان اشیا میں خوبانی، انجیر، انگور، ٹوپیاں، جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ دوائیاں، بھیڑ کی کھالیں، جوتے، خورجین، نمدے، اُون، کھیتی باڑی کے سامان، پنگوڑے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ گلیوں اور کوچوں میں اپنے سامان لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور پکار پکار کر گاہکوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ چیزیں بیچنے والوں میں بہت سی عورتیں ہوتی ہیں، جن میں کئی برقعہ پوش ہوتی ہیں۔

کھانے میں یہاں بھیڑ کی اُبلی ہوئی سری، پلاؤ، دہی اور مختلف قسموں کی روٹیاں اور کئی پکوان ملتے ہیں۔ مشروبات میں چائے، انار اور شہتوت کے رس بکتے ہیں۔

جمعہ کے روز کاشغر میں بازار لگتا ہے۔ شہر کے گردونواح سے ہزاروں لوگ یہاں جمعہ کی نماز پڑھنے آتے ہیں۔ اُس روز مال مویشیوں کی منڈی میں اُونٹ، گدھے اور بھیڑ بکریاں فروخت کی جاتی ہیں۔ کرغیز شاہ سوار گھوڑوں پر حیرت انگیز کرتب دکھاتے ہیں۔

شین جیا نگ کا رقبہ ساڑھے سولہ لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اس خطے میں تیرہ قومیتوں کے لوگ آباد ہیں جن میں اُوگیورترکوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ تاہم کئی علاقوں میں اُوگیور اقلیت میں بدل گئے ہیں۔ اُوگیور روس کی جھیل بیکال کے جنوب میں رہنے والے ترک قبیلوں کی اولاد ہیں اور نویں صدی میں شین جیا نگ کے آس پاس آباد ہوئے تھے۔ پہلے پہل اُنہوں نے بدھ مت اور مانی کے ازم اختیار کئے۔ سنٹرل ایشیا میں جب عربوں کا پرچم بلند ہوا تو انہوں نے عرب مبلغوں کے

ہاتھوں اسلام قبول کیا۔

آج بھی یہ لوگ ریشم سازی اور قالین بافی میں پیش پیش ہیں۔ یہ ریشم کی غیر معمولی مقبولیت کا کرشمہ ہے کہ قدیم دنیا کی سب سے مشہور اور الف لیلوی داستان جیسی جادوئی اور دلچسپ شاہراہ کا نام ریشم پر رکھا گیا ہے۔

●●●

☆......منشور بانہالی

جموں کے میلےاور تہوار

میلےاور تہوار، روحانی مسرت، جذبۂ انبساط اور اعتقادات کا ایک مہذب ذریعۂ اظہار ہیں۔کسی بھی ملک میں رہنے والے لوگوں کی طرزِ معاشرت ،سماجی روایات ورسومات اور اعتقادات کے آئینے میں اُس ملک کی تہذیبی جھلکیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ روایات اور اعتقادات جس قدر جاندار ہوں گی اُسی قدر اُن لوگوں کے فکری رجحانات کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ میلےاور تہوار ہمارے کلچر کا ایک اہم حصّہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں ایک دوسرے کے جذبات اور اعتقادات کو سمجھنے کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے سماجی رشتوں کو استوار کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ دنیا کے لگ بھگ ہر ملک میں میلے اور تہوار وغیرہ منائے جانے کی روایات ہیں۔ ان روایات کے پس منظر میں اکثر وبیشتر اخلاقی اور معیاری تفریحی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ یہ تقریبات تہذیبی ورثے کا ایک حصہ ہوتی ہیں اور اسلاف کی شاندار روایات کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ بھی۔ میلےاور تہوار سماجی زندگی میں ایک نئی جان اور شان پیدا کرتے ہیں اور لوگوں کو ذوق وشوق سے زندگی گزارنے کی تحریک بھی بخشتے ہیں۔

صوبہ جموں، جسے ڈُگر دیش بھی کہا جاسکتا ہے، ملک کے دوسرے حصوں کی طرح اس خطہ میں رہنے والے لوگ بھی مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بدھ اور جین

مذہب سے تعلق رکھنے والے بھی کچھ گنتی کے لوگ شامل ہیں۔ان تمام لوگوں کے اپنے اپنے سماجی رسومات اور مذہبی اعتقادات ہیں جن کا اظہار وہ مختلف موقعوں پر منائی جانے والی تقریبات کی شکل میں کرتے ہیں۔ ان تقریبات کا بیشتر حصّہ ہمارے سامنے میلوں اورتہواروں کی شکل میں آ جاتا ہے۔ یہ میلے اورتہوار اہم تاریخی واقعات، اوتاروں، مذہبی پیشواؤں، مہاپرشوں، اولیائے کرام، ستیہ ویروں اور دیوی دیوتاؤں کی حیات اور کارناموں کے ساتھ منسوب ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف موسموں کی آمد اوراختتام کے موقعوں پر بھی کچھ میلے اورتہوار منائے جاتے ہیں۔ نیز کچھ سماجی قسم کے تہوار بھی ہیں جن کا رواج یہاں صدیوں پرانا ہے۔ان تقریبات کے موقعوں پر جہاں ظاہری نفاست اور عمدگی کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں اُن اعلیٰ قدروں کو بھی فراموش نہیں کیا جاتا جو آپسی بھائی چارے، میل، ملاپ اور باہمی رواداری کے رشتوں کو مضبوط سے مضبوط تر بناتی ہیں۔

یوں تو اس خطہ میں وہ تمام معروفِ عام میلے اورتہوار اُسی شان اورعقیدت کے ساتھ منائے جاتے ہیں جس طرح مُلکی سطح پر اور بیرون ملک منائے جاتے ہیں۔ ان میں بیساکھی، دیوالی، ہولی، جنم اشٹمی، رکھشا بندھن، دسہرہ، نوراترے، سنگھ سنکرات، لوڑی، گُر پرب، محرم، عید، شب قدر اور شب معراج جیسے مقدس تہوار شامل ہیں لیکن ان معروفِ عام تہواروں کے علاوہ کچھ ایسے میلے، تہوار اورعُرس وغیرہ بھی یہاں منائے جاتے ہیں جن کی ایک خاص مقامی حیثیت ہے۔ان میلوں اورتہواروں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ان میں تو ایک خالص دھارمِک اور مذہبی قسم کے میلے اورتہوار ہیں جو لوگوں کے مذہبی اعتقادات اورنظریات کی عکاسی کرتے ہیں اور دوسرے وہ میلے اورتہوار ہیں، جو یہاں کے سماجی ماحول اورموسمی حالات کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں اورانہیں سماجی اورموسمی میلوں کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ہندو مذہب میں جگت امبا(Mother Godess) کی پرستش کا رواج صدیوں پُرانا ہے۔ جگت امبا جسے پرماتما کی تمام تر شکتی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اس کی مختلف طاقتوں اور شکتی کا اظہار کرنے کے لیے اسے لکشمی، سرسوتی اور مہا کالی وغیرہ جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جموں خطے میں شاید ہی کوئی ایسا قصبہ ہو جہاں پر اس قسم کے شکتی مندر موجود نہ ہوں۔ ان مندروں میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی گئی ہیں جہاں لوگ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق ان کی پرستش کرتے ہیں اور اپنی حاجت روائی کے لیے پرارتھنا کرتے ہیں۔ ان پوتر تیرتھوں میں وہ گپھے اور تالاب وغیرہ بھی شامل ہیں جو مختلف دیوی دیوتاؤں کے ساتھ منسوب ہیں اور لوگوں کی عقیدت اور روحانی تسکین کا مرکز ہیں۔ یوں تو ان تیرتھوں اور استھانوں میں ہر روز پوجا پاٹھ کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن سال کے مختلف موقعوں اور تہواروں پر بالخصوص نوراتروں کے دوران ان مقامات پر بھاری پیمانے پر میلے لگتے ہیں جن میں لوگ اپنے جذبات اور اعتقادات کا اظہار کرتے ہیں۔ اِن میلوں اور تہواروں کے پس منظر میں قدیم روایات اور دلچسپ واقعات کا اس قدر وافر ذخیرہ موجود ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اُن کا بالتفصیل احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ان میلوں اور تہواروں سے متعلق تقریبات اور مقامات کے بارے میں، مختصر تعارفی خاکوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

ویشنو دیوی یاترا:

ویشنو دیوی گپھا، تقریباً سو فٹ لمبی ایک قدرتی گُپھا ہے۔ ساخت اور اہمیت کے اعتبار سے یہ ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کی واحد گُپھا ہے۔ یہ گُپھا جموں شہر سے شمال کی طرف تقریباً ۶۳ کلومیٹر دور اور کٹڑہ (اُدہم پور) سے لگ بھگ ۱۴ کلومیٹر اوپر ترکوٹا پہاڑی کی آغوش میں، سطح سمندر سے ۵۲۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اسے بعض اوقات ترکوٹا دیوی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ گُپھا کے اندر ایک

اُبھری ہوئی چٹان پر مہا سرسوتی، مہا کالی، اور مہالکشمی کی تین چھوٹی مورتیاں ہیں، جو بھگوان کی تعمیری، تخریبی اور تحفظ کی شکتی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ماتا کے دربار تک پہنچنے کے لیے تنگ گپھا میں جھک کر چلنا پڑتا ہے اور دربار کی جگہ پر تقریباً درجن بھر آدمی اکٹھے بیٹھ سکتے ہیں۔ گپھا کے اندر چٹان میں سے ایک ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ بہتا ہے جسے چرن گنگا کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چشمہ دیوی کے کنول جیسے پاؤں کو دھونے کی خاطر بہہ رہا ہے۔ یاتریوں کو ماتا کے دربار تک پہنچنے کے لیے جھک کر بالترتیب داخل ہونا پڑتا ہے اور بالترتیب ہی واپس آنا پڑتا ہے، البتہ دربار کی جگہ پر پہنچ کر وہ اچھی طرح کھڑے رہ سکتے ہیں۔ گپھا میں آمدورفت کے دوران یاتری چرن گنگا کے پانی میں سے گزرتے ہیں۔ کٹرہ سے ویشنو دیوی کے دربار تک پہنچنے کے لیے یاتریوں کو مختلف مقامات سے ہو گزرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اَدھ کنواری کے مقام پر پہنچتے ہیں جو کٹرہ سے تقریباً دو میل اوپر پہاڑی پر واقع ہے۔ اس جگہ پر یاتریوں کی رہائش اور کھانے وغیرہ کے لیے پورا انتظام ہے۔ لوک روایت کے مطابق، ماتا دیوی پہلے ادھ کنواری کے مقام پر ہی تپسیا کرتی تھی اور بعد میں اُس نے بھیروں نامی راکھشس کے ستانے پر نقلِ مکانی کر کے اوپر گھُپا میں پناہ لی اور راکھشس کو چٹان کی شکل میں تبدیل کیا۔

اَدھ کنواری کے مقام پر یاتریوں کو ایک قوس نما سوراخ والی چٹان کے بیچ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سوراخ کو ''گرب یونی'' کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ سوراخ تنگ ہے۔ اس لیے یاتری جسم کو سمٹا کر اس کے بیچ سے گزرتے ہیں۔ اس رسم کے پس پردہ یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ اس سوراخ میں سے گزرنے والے کے سارے گُناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ موٹی جسامت والے یاتریوں کو اس سوراخ میں سے گزرنے میں قدرے دِقت پیش آجاتی ہے۔ ادھ کنواری سے اوپر جو دوسرا مقام آتا ہے اس کا

نام ہاتھی ماتھا ہے۔ یہاں پر یاتریوں کو دیگر سہولیات کے علاوہ پینے کے لیے ٹھنڈا پانی بھی ملتا ہے۔ ہاتھی ماتھا سے اوپر سانجی چھت سے سوا میل کے قریب نیچے کی طرف چل کر یاتری بھیروں گھاٹی کے مقام پر پہنچتے ہیں۔ یہاں پر راکھش بھیروں کا چھوٹا سا مندر ہے اور عقیدے کے مطابق دیوی کے درشن کرنے کے بعد ہی اس مندر کو دیکھا جاسکتا ہے۔اس مندر کو دیکھے بغیر یاترا نامکمل سمجھی جاتی ہے۔بھیروں گھاٹی سے تقریباً ڈیڑھ میل آگے کی طرف چل کر ماتا کا دربار آتا ہے۔ دربار میں داخل ہونے سے پہلے یاتری گپھا کے باہر پانی سے اشنان کرتے ہیں اور پھر ویشنو دیوی کے دربار میں داخل ہوتے ہیں۔

ماضی میں دیوی کے درشنوں کے لیےیاتری یہاں عموماً اسوج مہینے کے نوراتروں کے دوران آتے تھےلیکن جب سے اسے شمالی ہندوستان کےایک مشہوراور اہم تیرتھ استھان کے طورشہرت حاصل ہوئی تب سے سارا سال یہاں پر یاتریوں کی زبردست بھیڑ رہنے لگی ہے ۔اب تو یہاں غیر مما لک سے بھی یاتری آتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب ویشنو دیوی شرائن بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو یہاں کے نظم ونسق میں بھی کافی سدھار پیدا ہوااور بہتر انتظامات کی وجہ سے یاتریوں کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو۔چنانچہ ایک اندازے کے مطابق اب یہاں ہرسال لگ بھگ ایک کروڑ یاتری آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سکھ مذہب کے بانی گورونانک دیو جی اور مہاراشٹر کے ایک سنت نام دیو نے بھی ماتا کے درشن کیے ہیں۔ڈوگرہ خاندان کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کو بھی اس تیرتھ کے ساتھ بڑی عقیدت رہی ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ یہاں سال بھر یاتریوں کا جم غفیر رہتا ہے لیکن نوراتروں کے ایام میں یہاں حد سے زیادہ رونق ہوتی ہے۔ یاتری کیرتن اور بھجن

گاتے ہیں اور ساری فضا ''جے ماتا دیوی'' اور ''شیراں والی ماتا تیری سداہی جے'' جیسے نعروں سے گونج اُٹھتی ہے۔ویشنو ماتا کے اس دربار میں عقیدت مند قیمتی زیورات، مالائیں اور نقدی کی صورت میں نذرانے پیش کرتے ہیں۔اب ویشنو دیوی کے نام پر ککڑیال کے مقام پر ایک یونی ورسٹی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے جہاں اعلیٰ تکنیکی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایسے کئی دوسرے ادارے بھی وجود میں آرہے ہیں جو عوام کی فلاح و بہبود کی جانب گام زن ہیں۔

سرتھل دیوی کا میلہ:

سَرتھل دیوی کا اصلی نام شارِکا بھگوتی ہے جو ایک روایت کے مطابق کشمیر کے ہاری پربت قلعہ پر رہا کرتی تھی۔سرتھل پہاڑی پر دیوی کا مندر واقع ہونے کے سبب اسے سرتھل دیوی کہا جانے لگا۔سرتھل پہاڑی کشتواڑ اور بھدرواہ کے درمیان واقع ہے اور سطح سمندر سے تقریباً ۷ ہزار فٹ بلند ہے۔اس پہاڑی پر دیوی کا ایک مندر ہے جس میں سنگ سیاہ کی بنی ہوئی دیوی کی اٹھارہ بازو والی مورتی ہے جو آرٹ کا ایک بے نظیر نمونہ ہے۔کشتواڑی اور بھدرواہی لوگ اسے اپنی زبان میں اشٹھ دَش بوجا دیوی (یعنی اٹھارہ بازو والی دیوی) کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ کشتواڑ اور بھدرواہ دونوں جگہوں پر اشٹھ دَش بوجا دیوی کے نام کے مندر موجود ہیں۔

بھادوں مہینے میں پنچمی کے تہوار کے موقعہ پر سرتھل دیوی کے استھاپن پر ایک تین روزہ میلہ لگتا ہے جس میں ضلع بھر کے یاتریوں کے علاوہ دوسری ریاستوں سے بھی یاتری آکر شمولیت کرتے ہیں۔اس میلے میں بھیڑ بکریوں کا گوشت بھی بطور پرشاد تقسیم کیا جاتا ہے۔ میلے میں شادی شدہ جوڑوں کی بھی کافی تعداد شرکت کرتی ہے۔ اس دیوی کے بارے میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اس کے درشن کرنے والوں کے من کی مرادیں پوری ہوجاتی ہیں، خاص طور پر بے اولاد جوڑوں کو اولاد

نصیب ہوتی ہے۔ سرتھل دیوی کے مندر کے قریب اور بھی دو مندر ہیں۔ان میں ایک مندر شیتل دیوی (چیچک کی بیماری کو دور کرنے والی دیوی) کا ہے اور دوسرا شیو مندر ہے۔ شیتل مندر میں اماوس کو میلہ لگتا ہے جس میں لوگ آگ جلا کر رات بھر ڈھول اور شہنائیاں بجاتے ہیں جبکہ شیو مندر میں شیوراتری کے روز میلہ لگتا ہے۔

ایک دلچسپ لوک روایت کے مطابق شارکا بھگوتی (جو سرینگر کے ہاری پربت قلعہ میں رہا کرتی تھی) نے ایک دن ایک لڑکی کا روپ اختیار کیا۔اس کے بعد ایک نوجوان گڈریے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اُسے چلنے کا حکم دیا۔نوجوان گڈریے نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے ساتھ ہی وہ دیوی کے سمیت ہوا میں اُڑنے لگا اور وہ آ کر سرتھل کے مقام پر پہنچا۔ یہاں پر اُس نے جوں ہی لڑکی کو اپنی پیٹھ سے اُتارا تو وہ فوراً ایک پتھر کی شکل میں تبدیلی ہوگئی اور اس کے پاؤں کے نیچے سے پانی کا میٹھا چشمہ بہنے لگا۔ یہ اطلاع عام ہونے پر یہاں کے مقامی راجا اوگر دیو نے اس مورتی کے لیے مندر تعمیر کیا۔ایک خیال کے مطابق یہ مندر گلاب سنگھ کے فوجی جنرل زور آور سنگھ نے تعمیر کیا ہے۔

محولہ بالا روایت سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس مورتی کو دیوی کے عقیدتمندوں نے تقریباً ساڑے پانچ سو سال قبل وادیِ کشمیر سے سرتھل لایا اور یہاں اس کے نام کا مندر تعمیر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان سکندر کشمیر کا حکمران تھا اور کشمیر میں اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا۔

سرتھل دیوی یاترا جانے کے لیے یاتریوں کو بٹوت سے ڈوڈہ اور ڈوڈہ سے ٹھاٹھری کے راستے سے کاندنی کے مقام پر جانا پڑتا ہے۔ یہ سارا سفر بٹوت سے کاندنی تک ۵۳ میل کا ہے اور سڑک پختہ ہے۔ کاندنی سے تقریباً ساڑھے چار میل اوپر پہاڑی پر جا کر سرتھل دیوی کا استھاپن ہے۔ کشتواڑ سے یہ استھاپن تقریباً ۱۱ میل دُور

ہےاوراس راستے سے یہ سفر بہت آسان ہے۔

سُکرالا دیوی کا میلہ:

شارکا دیوی کی طرح سُکرالا (بلاور) میں راجا راجیشوری ماتا مال دیوی کا استھاپن ہے۔سُکرالا گاؤں میں تیرتھ کے واقع ہونے کی وجہ سے اِسے سُکرالا دیوی کا تیرتھ بھی کہتے ہیں۔دراصل سُکرالہ نام لفظِ ''شارکا یالیہ'' سے مشتق ہے۔شارکا یالیہ کا مطلب،شارکا کے رہنے کی جگہ ہے۔'شارِکا' شاردا کا دوسرا نام ہے۔

سُکرالہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو بلاور قصبہ کے شمال مشرق میں تقریباً چھ میل دور ایک پہاڑی پر ہے۔کٹھوعہ سے بلاور تک ۶۰ میل لمبی پختہ سڑک جاتی ہے۔
اس تیرتھ کے ساتھ ایک دلچسپ لوگ روایت وابستہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ بسوہلی تحصیل میں ایک بہت بڑا سنت رہا کرتا تھا جو شارکا دیوی کا زبردست معتقد تھا اور کئی بار کشمیر میں دیوی کے درشن کرنے کے لیے گیا تھا۔ایک دن جب دیوی نے اس سے پوچھا کہ اسے کس چیز کی تمنّا ہے تو اس پر سنت نے استدعا کی کہ وہ چاہتا ہے کہ دیوی اُس کے آبائی گاؤں تشریف لائے تا کہ دوسرے لوگ بھی دیوی کے درشن کرسکیں۔دیوی نے اُس کی یہ استدعا اس شرط پر قبول کی کہ وہ اُس کے پوتوں کے وقت میں اُس کے آبائی گاؤں میں جلوہ گر ہوگی۔سنت کے انتقال کے بہت عرصہ بعد اُس کا ایک پوتا شیو نندن نامی سکرالہ میں منتقل ہوا اور وہیں سکونت کرنے لگا۔اسی دوران جب ایک شِلا (سلیب نما چٹان) سُکرالہ کے ایک چشمے میں سے آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی تو لوگوں کو سنت کی پیشگوئی کا خیال آیا اور وہ اُسے پوجنے لگے۔کہا جاتا ہے کہ بعد میں چمبہ کے شہزادہ مادھوسنگھ نے دیوی کے کمالات سے متاثر ہوکر اس جگہ پر ایک مندر تعمیر کروایا۔ بعد میں راجہ برج راج کے وقت میں اس میں مہیش سُر مردُنی کی مورتی بھی نصب کی گئی۔اس مندر میں دیوی کی شِلا ہے جو طلائی سر والے براس کے ایک شیر پر بیٹھی

ہے۔ اس کے پیچھے مہیش سُر مُر دنی کی مورتی ہے جو مہیش سُر کے جسم پر کھڑی ہے۔ دیوی چتر بوجا (یعنی چار بازو والی) ہے۔ دیوی کے بارے میں لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ یہاں یاتریوں کو ہر قسم کی مُرادیں حاصل ہوتی ہیں۔

سر تھل دیوی کی طرح یہاں بھی ایک بڑا میلہ لگتا ہے جس میں لوگ بھجن اور شبد گاتے ہیں اور دیوی کے سامنے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں یہاں اتوار اور منگلوار کے دنوں میں بھیڑوں اور بکریوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں لیکن اب یہ رسم لوگوں کو زیادہ فائدہ نہیں دے رہی ہے۔ اس کے برعکس اب یاتری پُجاریوں سے کم قیمت پر بھیڑ یا بکری خریدتے ہیں اور دیوی کو نذرانے کے طور پر پیش کر پھر اُسے زندہ ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے ایک جانور کئی بار خریدا اور دیوی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا زیادہ تر فائدہ پجاریوں کو ہوتا ہے کیوں کہ ایک جانور کئی بار خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ یہ رسم اُس وقت انجام دی جاتی ہے جب کسی یاتری کی حاجت پوری ہو جاتی ہے یا پھر کسی کو اور کوئی مقصد پورا کرنے کی تلاش ہوتی ہے۔

سُدھ مہادیو کا میلہ:

سُدھ مہادیو میں بھگوان شیو کا ایک پراچین مندر ہے۔ یہ مندر سدھ مہادیو کی ایک خوبصورت پہاڑی کے دامن میں سطح سمندر سے تقریباً ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ سدھ مہادیو جموں سے شمال کی طرف تقریباً ۱۲۲ کلومیٹر دور ضلع اُدھم پور میں ہے۔ یہ جگہ چنہنی سے تقریباً ۲۰ کلومیٹر کے بعد آتی ہے۔

سُدھ مہادیو کے اس پراچین پوترا استھان پر ایک مندر ہے جس میں سوئمبھو شیولنگم، ناندی پر بیٹھے ہوئے شیو پاروتی کی مورتیاں اور صحن میں شیو کا لوہے کا ایک بڑا ترشول ہے جو ۱۲ فٹ لمبا اور تقریباً ایک فٹ موٹا ہے۔

یہ تیرتھ بہت قدیم ہے اور بتایا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً ۵۵۰ سال قبل

چنہنی کے راجہ نے یہاں سب سے پہلے مندر تعمیر کیا ہے۔ اس مندر میں ایک دھونی (جلتی ہوئی مشعل) بھی ہے جو بابا روپ ناتھ کے روحانی اِکتساب کی نمائندگی کرتی ہے۔ بابا روپ ناتھ نے اس مندر کے تعمیر ہونے کے بعد ہی اس میں سکونت اختیار کی تھی اور اُس کے مرنے کے بعد مندر میں ہی اُس کی سمادھی بنائی گئی۔

ماہ جیٹھ کی پورنماشی کو یہاں پر ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے جو تین دن تک جاری رہتا ہے۔ اس میلے میں جموں، کشمیر، ہریانہ اور پنجاب سے بھی لوگ آ کر شرکت کرتے ہیں۔ درشن کرنے سے پہلے یاتری دیویکا جل میں اشنان کرتے ہیں اور پھر نئے کپڑے پہن کر بھجن اور شبد گاتے ہیں۔ لِنگم اور مورتی کے سامنے خوشبو جلائی جاتی ہے اور گُلباری کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ نقد اور جنس کی صورت میں نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس میلہ کے علاوہ چتر چودش، شیوراتری اور بیساکھی کے موقعوں پر بھی لوگ بھاری تعداد میں یہاں آتے ہیں اور درشن کرتے ہیں۔

سُدھ مہادیو جموں خطے کا اہم تیرتھ مانا جاتا ہے۔ اس مندر کی وجہ سے گردونواح کے علاقوں میں بھی اور کئی مندر وجود میں آئے ہیں۔ سدھ مہادیو سے تقریباً تین میل دور جنوب مشرق کی طرف مان تلائی کے مقام پر ایک مندر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شیو اور پاروتی نے شادی کے بعد اُسی مقام پر سکونت اختیار کی تھی۔ دوسرا شیو مندر، بنی سنگ کے مقام پر ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پر شیو اور پاروتی نے شادی کی رسم سرانجام دی تھی۔ پوتر تیرتھ سے تقریباً دو میل دور مغرب کی طرف گوری کُنڈ کا مقام ہے۔ یہاں پر بھی ایک مندر ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں پر پاروتی دیوی تپسیا کے دوران اشنان کیا کرتی تھی اور بھگوان شیو کی رضامندی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پاروتی دیوی کے اس مندر کے علاوہ یہاں پر پتھروں کا بنا ہوا ایک شیو مندر بھی ہے جس میں شیر پر بیٹھی ہوئی ایک شیو پاروتی کی مورتی بھی ہے۔

سدھ مہادیو کا یہ شیو مندر دومنزلہ اور پختہ ہے۔ پہلی منزل میں سنگ مرمر کی مورتی اور لنگم ہے۔ نچلی منزل میں بابا روپ ناتھ کی سمادھی ہے جب کہ ترشول مندر کے صحن میں پیوست ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مندر میں رکھے ہوئے لنگم کی سُدھت پوجا کیا کرتا تھا اور سیاہ سنگ مرمر کے بنے ہوئے بھگوان جوڑے کی مورتی کو کسی زمیندار نے اپنے کھیت جوتنے کے دوران دریافت کیا تھا۔

ایک لوک روایت کے مطابق یہ استھان بھگوان شیو کے ایک عقیدتمند سُدھت کے نام سے منسوب ہے۔ سُدھت کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ پہلے جنم میں راکھشس تھا اور پاروتی کو تپسیا کے دوران اذیت پہنچاتا تھا۔ ایک دن پاروتی کے منہ سے خوف کی وجہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اور اُس نے بھگوان شیو کو مدد کے لیے پُکارا۔ بھگوان شیو جو ایک اونچی پہاڑی پر رہتا تھا، نے اپنا ترشول راکھشس کی طرف پھینکا اور راکھشس ہلاک ہوگیا۔ مرتے وقت راکھشس اپنی زبان سے بھگوان شیو کا نام دُہرا رہا تھا۔ حقیقت میں وہ بھی بھگوان شیو کا ہی بھگت تھا۔ جب بھگوان شیو کو اس بات کا علم ہوا تو اُس نے سُدھت کو یقین دلایا کہ اُس کا نام ہمیشہ شیو کے نام سے پہلے یاد کیا جائے گا۔ اس طرح سُدھ (سُدھت) اور مہادیو کے ترکیبی کلمات سے یہ استھاپن سُدھ مہادیو مشہور ہوگیا۔

<u>ایرواں کا میلہ:</u>

ایرواں کا میلہ بیساکھی اور شیوراتری کے دنوں میں ایرواں (کٹھوعہ) کے مقام پر لگتا ہے۔ ان دونوں میلوں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میلے کے دوران یہاں پر ایک اچھا خاصا بازار سجایا جاتا ہے اور ساری فضا چہل پہل سے رونق افروز ہوجاتی ہے۔ اس میلے کے دوران سنگیت اور رقص کا خوب اہتمام ہوتا ہے جس میں اگرچہ صرف مرد ہی شرکت کرتے ہیں لیکن عورتوں کو بھی تماشا دیکھنے کا

موقع ملتا ہے۔ ایرواں ضلع کٹھوعہ میں پیرول کے نزدیک ایک قصبہ ہے جہاں ایک مشہور اور پراچین شیومندر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس مندر کو بادشاہ وِکرمادتیہ نے ۴۰۰ عیسوی میں تعمیر کیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق ایرواں کا قصبہ کسی مقامی سردار نے اپنی بیوی ایرا کے نام پر بسایا تھا اور بعد میں یہاں پر مندر تعمیر ہوا۔ لیکن عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ قصبہ دریائے راوی، جسے پرانے زمانے ایراوتی کہا جاتا ہے، کے نام سے بسایا گیا ہے کیونکہ ایراوتی دریا کو مخصوص، مذہبی اہمیت حاصل تھی اور اس کے جل کو پوتر سمجھا جاتا تھا۔

مہابلوا کیشور کا میلہ:

بسوہلی سے ۲۲ کلومیٹر دور مغرب کی طرف بلاور کے مقام پر ایک مشہور شیومندر ہے۔ اسے پہلے ہری ہر کا مندر کہتے تھے لیکن اب اسے بھگوان شیو کے ساتھ ہی معنون کیا جاتا ہے۔ یہ مندر بلوا درختوں کے درمیان واقع ہے جس کی وجہ سے اسے مہابلوا کیشور مندر کہتے ہیں۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بلوا درختوں کے پتوں اور پھولوں کے نذرانوں کو بھگوان بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ مندر ایک مربع چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا ہے۔ اس مندر میں مورتیوں کی کافی تعداد موجود ہے جن میں برہما، ویشنو، شیو، گنیش اور بھیروں کی مورتیاں شامل ہیں۔ مندر کے ارد گرد پانی کے بہت سے کنویں ہیں لیکن ان میں زیادہ تر شکستہ حالت میں ہیں۔

شیوراتری اور بیساکھی کے دنوں میں یہاں پر ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں نواحی علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میلے کے دوران یہاں پر پانی سے بھرے ہوئے برتن رکھے جاتے ہیں اور یاتری یہ پانی مندر کے اندر موجود لنگم پر چڑھاتے ہیں۔ اس میلے میں بھجن اور شبد بھی گائے جاتے ہیں۔ اس میلے میں مرد اور عورتیں دونوں شرکت کرتے ہیں۔ یہ میلہ تین دن تک جاری رہتا

ہے اور لوگ اس میں بڑی گرم جوشی اور عقیدت سے شرکت کرتے ہیں۔

بالا جی سندری کا میلہ:

یہ میلہ نوراتروں کے آخری تین دنوں میں نگری (کٹھوعہ) میں بالا جی سندری کے مندر پر لگتا ہے۔ اس میلہ میں زیادہ تر نواحی علاقوں کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میلے میں مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ یہ میلہ تین دن تک انتہائی جوش وخروش سے جاری رہنے کے بعد ہون اور یاجنا کی رسومات کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ یہ مندر آم کے گھنیرے درختوں کے درمیان ایک پُرسکون جگہ پر واقع ہے۔

اس تیرتھ سے وابستہ ایک لوک روایت ہے کہ کسی زمانے میں یہاں پر ایک برہمن گھاس کاٹ رہا تھا کہ اُس کی درانتی ایک پتھر کے ساتھ ٹکرا گئی اور پتھر سے اچانک خون بہنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اُسی رات کو اُس برہمن نے ایک سپنا دیکھا جس میں دیوی نے اُسے ہدایت کی کہ اُس پتھر کو ایک آم کے درخت کے نیچے رکھا جائے۔ اس واقع کے بعد لوگوں کی اس دیوی کے ساتھ اتنی عقیدت ہوگئی کہ انہوں نے وہاں پر ایک مندر تعمیر کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی مغل شہزادہ نے جب اس دیوی کے تقدس کے بارے میں کچھ شکوک کا اظہار کیا تو اُسے اچانک ایک سانپ نے ڈس لیا لیکن جب اُس نے دیوی کی بڑائی کا اعتراف کیا تو وہ صحت مند ہوگیا۔

چیچی دیوی کا میلہ:

یہ میلہ نوراتروں میں چیچی دیوی کے مندر میں لگتا ہے۔ یہ مندر سانبہ سے تقریباً دو کلومیٹر دور دریائے بسنتر کے کنارے پر واقع ہے۔ اشٹمی کے تہوار پر یہاں پر یاتریوں کی کافی تعداد موجود ہوتی ہے۔ یہ تیرتھ مہاجن ذات کے ہندو لوگوں سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ یہ لوگ اپنے نوزائیدہ بچوں کا مُنڈن (پہلی بار بال منڈوانے کی

رسم) اسی تیرتھ پر جا کر انجام دیتے ہیں۔اس دیوی کے بارے میں یہ اعتقاد بھی پایا جاتا ہے کہ یہاں پر مختلف قسم کی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ سانبہ کا راجا جو کوڑھ کی بیماری میں مبتلا تھا وہ اسی دیوی کی وساطت سے شفایاب ہوا۔

نومی اور اشٹمی کے دنوں میں بھی یہاں پر بہت بڑے پیمانے پر میلے لگتے ہیں جن میں عورتیں اور مرد دونوں شرکت کرتے ہیں۔ان میلوں میں کیرتن اور بھجن کے علاوہ یا جنا اور ہون وغیرہ بھی کیا جاتا ہے۔یہاں کے میلوں کی چہل پہل اور رونق قابلِ دید ہوتی ہے۔

<u>میلہ قلعہ باہو:</u>

یہ میلہ سال میں دوبار، نوراتروں کے دنوں میں، قلعہ باہو کے اندر موجود مہا کالی دیوی کے مندر پر لگتا ہے۔اس میلہ کے دوران یہاں پر طرح طرح کی دُکانیں سجائی جاتی ہیں۔میلے میں یاتریوں کی ایک کثیر تعداد شرکت کرتی ہے اور ساری فضا شبدوں اور بھجنوں سے گونج اٹھتی ہے۔اپنی حاجت روائی کے لیے یاتری دیوی کے سامنے پھول اور نذرانے پیش کرتے ہیں۔اس موقع پر حلوا وغیرہ بطورِ پرشاد بانٹا جاتا ہے۔پرانے زمانے میں یہاں بھیڑ بکریوں وغیرہ کی قربانی بھی دی جاتی تھی۔یہ رسم اگرچہ اب متروک ہوگئی ہے لیکن زندہ جانوروں کا نذرانہ ابھی بھی پیش کیا جاتا ہے اور یہ جانور مندر کی ملکیت میں رہتے ہیں۔اُنہیں کوئی دوسرا ضرورت مند شخص خرید کر دوبارہ نذرانے کے طور پر پیش کرتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

قلعہ باہو جموں شہر کے مشرق میں دریائے توی کو پار کر کے سُروئیں سر جانے والی سڑک پر واقع ہے۔قلعہ کے اندر موجود مہا کالی دیوی کا مندر جموں شہر کے مشہور شکتی مندروں میں شمار کیا جاتا ہے۔یہ ایک چھوٹا سا مندر ہے جو ایک اُبھرے ہوئے پلیٹ فارم پر بنایا گیا ہے۔مندر کے اندر بیک وقت دس بارہ آدمی سما سکتے ہیں۔

اس مندر میں سنگِ سیاہ کی بنی ہوئی مہا کالی دیوی کی مورتی ہے۔ اس مندر کے گردونواح میں اور بھی مندروں کی ایک بڑی تعداد ہے۔لوک روایات کے مطابق یہ مندر باہولوچن نے تعمیر کیا ہے۔ باہولوچن، راجہ جامبولوچن کا بھائی اور جانشین مانا جاتا ہے۔مخصوص میلوں کی تقریبات کے علاوہ یہاں پر ہراتواراور منگلوارکولوگ بڑی تعداد میں درشن کے لیے آتے ہیں۔ باہوقلعہ کے اس تیرتھ کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ قلعہ کے احاطہ میں بندروں کی ایک بہت بڑی فوج موجود رہتی ہے۔ یہ بندر بہت ہی دلیر اور چالاک ہیں اور ذراسی غفلت برتنے پر آدمی کے ہاتھ سے کھانے پینے کی چیزوں کوفوراً چھین لیتے ہیں۔

مانسا دیوی کا میلہ:

یہ تیرتھ رام نگر قصبہ سے تقریباً بارہ میل دور مانسا نالہ پرواقع ہے۔اس دیوی کو ماگھوں کی دیوی بھی کہا جاتا ہے۔ چتر چودش (چیت کی ۱۴رتاریخ) کو یہاں پر ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔اس میلہ میں زیادہ تر عورتیں شمولیت کرتی ہیں۔

پنگلہ دیوی میلہ:

یہ تیرتھ رام نگر میں ہے جو بسوہلی اور بھدرواہ کے وسط میں واقع ہے۔ یہ گپھا تیرتھ ہے جو رام نگر قصبہ سے تقریباً ۲۲رکلومیٹر دور ایک پہاڑی پر واقع ہے اور سطح سمندر سے ۳۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ یہ ایک تنگ گُپھا ہے جس میں دیوی کی پنڈی ہے۔ گُپھا تک راستہ پہاڑی اور کٹھن ہونے کے باوجود بھی نوراتروں کے دنوں میں یہاں پر یاتریوں کا بہت بڑا قافلہ درشن کرنے کے لیے آتا ہے۔اس گُپھا کی چھت سے پانی ٹپکتا رہتا ہے جو پنڈی کے اوپر گرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن کچھ لوگ ایک شیر کا شکار کرنے کی غرض سے اس کا پیچھا کر رہے تھے کہ شیر نے اس گپھا میں پناہ لی۔اس کے بعد گپھا کے اوپر چٹان میں ایک شگاف پڑ گیا جہاں سے شیر بھاگ گیا۔

لوگوں نے اسے دیوی کے چمتکار سے تعبیر کیا اوراُس کی نسبت ان کا اور بھی زیادہ اعتقاد بڑھ گیا۔

ناگ پوجا:

ہندوستان میں دوسرے کئی ملکوں کی طرح سانپوں اور ناگوں کی پرستش کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ویسے بھی سانپ کو ہر مذہب میں ایک پُراسرار حیثیت حاصل ہے، خاص کر ہندو مذہب میں رامائن اورمہابھارت میں بھی سانپوں کے حوالے ملتے ہیں۔ بھگوان شیو کی گردن میں کوبرا سانپ ایک مالا کی طرح لٹکتا رہتا تھا۔ سانپ کو واسکی بھی کہا جاتا ہے۔ بھگوان شیو کو کئی ہزار سروں والے شیش ناگ پر آرام کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات کی طرح جموں خطہ میں بھی ناگوں کے پوتر تیرتھ ہیں جہاں ناگ پنچمی جیسے تہواروں کے موقع پر ناگوں کی پوجا کی جاتی ہے اورانہیں دودھ،لسی اورپھلوں کی صورت میں نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ کچھ اہم ناگ تیرتھ درج ذیل ہیں:

میلہ واسک ناگ:

بھدرواہ میں ناگ راجہ، یا واسک ناگ کے نام پر جومندر موجود ہیں ان میں قدیم ترین گاٹھا اورنگری (بھدرواہ) کے مقام پر ہیں۔نگری کے واسک ناگ میں ناگ راجہ اور جاموٴن کی ٦ فٹ لمبی مورتیاں ہیں۔ بھدرواہ کے اکثر ناگ مندرلکڑی کے بنے ہوئے ہیں اورلکڑی کے تختوں پرناگوں کی تصویریں کھدی ہوئی ہیں۔ واسک ناگ کے علاوہ اس ضلع میں اوربھی ناگ تیرتھ ہیں۔ ان میں محل ناگ (بھلیسہ) سبُہاردھارناگ (چنتا) اور بہوردھار ناگ قابل ذکر ہیں۔ ان مندروں پر منعقد ہونے والے میلوں کے موقعوں پر بھدرواہی لوک ناچ 'کوڈ' اور 'ڈِھکو' وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں۔ان تیرتھوں کے علاوہ اس خطہ میں اوربھی کچھ اہم ناگ تیرتھ ہیں جہاں

بیساکھی اور ناگ پنچمی کے موقعوں پر میلے منعقد ہوتے ہیں۔

میلہ ناگ بنی تیرتھ:

یہ تیرتھ جموں سے مغرب کی طرف ۸؍میل کے فاصلے پر ہے۔ بیساکھی کے پہلے دن یہاں پر ایک میلہ لگتا ہے۔

میلہ سرگل باوا تیرتھ:

یہ تیرتھ کٹھوعہ میں ہے۔ اسے سانپوں کا گھر بھی کہا جاتا ہے یہاں پنچمی کو ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔

میلہ کھارسار دیوتا:

یہ تیرتھ رام نگر سے ۵؍میل دور کھارسار گاؤں میں ہے۔ عموماً ہر اتوار کو لوگ یہاں پوجا کرتے ہیں۔

میلہ رام کُنڈ:

یہ تیرتھ ضلع پونچھ میں رام کُنڈ کے مقام پر ہے۔ یہاں پانی کے تین چشمے ہیں۔ اس تیرتھ پر چیت مہینے کے پہلے پندرواڑے میں ایک میلہ لگتا ہے اور ان چشموں میں لوگ اشنان وغیرہ کرتے ہیں۔

مانسر کا میلہ:

سانبہ سے ۲۴؍کلومیٹر دور ایک میٹھے پانی کی جھیل ہے جس کا نام مانسر ہے۔ یہ تقریباً ۵۸ فٹ گہری ایک خوبصورت جھیل ہے۔ جھیل کے کنارے پر اُوما پتی مہادیو اور نرسیہما دیو کے ناگ مندر ہیں۔ لوگ چتر چودش، بیساکھی اور شیوراتری کے دنوں میں اس جھیل میں اشنان کرنے کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔ جیٹھ مہینے کی ساتویں اور آٹھویں تاریخ کو یہاں پر ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس میلے میں رنگارنگ موسیقی اور گانے بجانے کے پروگراموں کے علاوہ کُشتی وغیرہ جیسے مشغلوں کا بھی اہتمام کیا

جاتا ہے۔ بہت سے ہندو لوگ اس جھیل پر اپنے نوزائید بچوں کا مُنڈن بھی سرانجام دیتے ہیں۔ نئے شادی شدہ جوڑے اس جھیل کے اردگرد تین چکر کاٹتے ہیں جسے وہ اپنے عقیدہ کے مطابق فائدہ بخش سمجھتے ہیں۔

پُرمنڈل کا میلہ:

یہ جموں کا مشہور تیرتھ ہے۔ بعض اوقات اسے چھوٹا کاشی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر جموں سے جنوب مشرق کی طرف ۳۹ر کلومیٹر دور دریائے دیویکا کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں پر اوما پتی کا مندر ہے جس کے گردونواح میں شیومندروں کی قطاریں موجود ہیں۔ اس تیرتھ کے پہلے مندر کی تعمیر کو کشمیر کے راجا وینی دت کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ پر ماضی میں بہت گھنا جنگل تھا جس میں کسی ہمسایہ گاؤں کے زمیندار کی ایک گائے روزانہ جایا کرتی تھی اور ایک جگہ پر گائے کے تھنوں سے خود بخود دودھ ٹپک کر سوئمبھ لنگ پر پڑتا تھا۔ ایک دن جب وہ زمیندار گائے کی تلاش میں نکلا تو اُس نے بچشم خود یہ منظر دیکھا کہ گائے کے تھنوں سے دودھ ٹپک کر لِنگ پر ِگر رہا تھا اور ایک مادہ گیدڑ اس دودھ کو چاٹے جارہی تھی۔ زمیندار سے رہا نہ گیا اُس نے کوئی اوزار یا تیر پھینک کر مادہ گیڈر کو ہلاک کیا اور گائے کو گھر لے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقع کے کچھ عرصہ بعد راجہ دینی دت کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بچپن ہی سے سر درد کی تکلیف میں مبتلا تھی۔ آخر کار جب راجہ نے لڑکی کی تکلیف کے بارے میں نجومیوں سے رجوع کیا تو اُسے بتایا گیا کہ لڑکی اگلے جنم میں ایک مادہ گیدڑ تھی اور پرمنڈل کے مقام پر اس کے سر میں تیر لگا ہے۔ تب لوگوں نے راجہ کے سامنے گائے کا پورا واقع بیان کیا۔ راجہ نے اس استھاپن کی طرف رجوع کیا اور یہاں پر مندر تعمیر کروایا۔ یہاں پر ایک گہرا کنواں بھی ہے۔ کنویں کے دہانے پر گول دائرے میں سانپ کی تصویر اس طرح سے منقش کی گئی ہے کہ دیکھنے والے کو لگتا

ہے کہ گویا کنویں پر سانپ بیٹھا ہوا ہے۔

پرمنڈل کے مقام پر ہر سال چتر چودش (چیت مہینے کی ۱۴ رتاریخ) کو ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ مندر کے قریب سے گزرنے والی دیویکا (Devika) ندی کو مذہبی اعتبار سے بڑی اہمیت دی جاتی ہے جس میں اشنان کرنا بہت مبارک خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے شیوراتری کے دن لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس میں اشنان کرنے کے لیے آتی ہے۔۔ کہا جاتا ہے کہ گرونانک دیوجی نے بھی اس تیرتھ کی یاترا کی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے عہدِ میں یہاں پر زرِکثیر صرف کیا ہے۔ اُس کے بعد گلاب سنگھ نے یہاں پر بہت سارے شیومندر تعمیر کروائے۔

اُتر بہنی میلہ:

پُرمنڈل سے چند کلومیٹر دور اُتر بہنی کے مقام پر دیویکا (Devika) ندی کے کنارے پر ایک مشہور تیرتھ ہے۔ اس مقام پر دیویکا ندی دوسرا رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں پر گدادھر یا لکشمی نرائن نام کا مشہور مندر ہے۔ اس مندر کے آس پاس اور بھی بہت سے مندر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تعمیر کیے ہیں۔ نیز اس راجہ کے عہد حکومت میں یہاں روگناتھ مندر کے سنسکرت وِدیالیہ کے طرز پر ایک پاٹھ شالہ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس میں سینکڑوں کی تعداد میں ودیارتھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گدادھر مندر کے شمال مغرب کی طرف دیویکا ندی کی دوسری طرف ایک بہت بڑا شیومندر ہے۔ اس مندر کے سامنے سفید پتھر کا بنا ہوا ایک بڑا انندی بیل ہے جس کا وزن ۲۵ من بتایا جاتا ہے۔ یہ شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا انندی بیل مانا جاتا ہے۔

چتر چودش (چیت کی ۱۴ رتاریخ) کو اُتر بہنی میں ایک بڑا میلہ لگتا ہے جس

میں کافی لوگ شرکت کرتے ہیں۔اس دن لوگ یہاں پر پوجا پاٹ کرتے ہیں اور بھجن گاتے ہیں۔ چاند گرہن کے دن بھی لوگ کافی تعداد میں یہاں اشنان کرنے کے لیے آتے ہیں۔ چونکہ دیویکا ندی میں اشنان کرنا بہت مبارک سمجھا جاتا ہے اس لیے جب کبھی اس ندی میں پانی سوکھ جاتا ہے تو لوگ ریت کے نیچے سے پانی نکال کر اشنان کرتے ہیں۔

شیومندر سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ایک اور مندر ہے جس میں ایک داشارُودا (Eleven Shivalingas) رام اور لکشمن کی مورتیاں ہیں۔اس مندر میں بھی یاتریوں کی کافی بھیڑ رہتی ہے۔

جھِڑی میلہ:

جھڑی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو جموں سے مغرب کی طرف تقریباً سولہ کلومیٹر دور 'ترکوٹا' پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔تقریباً ۵۰۰ سال قبل یہاں پر جِت مَل نامی ایک کسان رہتا تھا جو بعد میں باوا جِتو کے نام سے مشہور ہوا۔ جت مل ایک غریب برہمن گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور ویشنو دیوی کا زبردست پرستار تھا۔ شادی کے چند برس بعد جِت مل کی بیوی انتقال کر گئی اور وہ اپنے پیچھے بُوا نام کی ایک بیٹی چھوڑ گئی۔ بیوی کے انتقال کے بعد جِت مل مایوس ہو کر اپنے آبائی گاؤں چھوڑ کر شاما چک منتقل ہوا جو ایک بنجر علاقہ تھا۔ شاما چک میں زمین کا ایک بہت بڑا رقبہ غیر آباد پڑا ہوا تھا جو مہتا بیر سنگھ نامی جاگیردار کی ملکیت تھا۔جِت مل نے اس رقبہ کو آباد کرنے اور اس پر کاشتکاری کرنے کے لیے مہتا بیر سنگھ جاگیردار سے درخواست کی اور شرط یہ رکھی گئی کہ پیداوار کا چوتھا حصہ مہتا بیر سنگھ کو ملا کرے گا اور تین حصوں پر جِت مل کا حق ہوگا۔ مہتا بیر سنگھ نے یہ پیشکش خندہ پیشانی سے قبول کر لی، کیونکہ اُسے اس بنجر زمین سے تھوڑی سی پیدا ر نکلنے کی بھی اُمید نہ تھی۔ جت میل نے ایک ہریجن خدمتگار ریگا سو کی مدد

سے اس ساری زمین کو آباد کیا اور زبردست محنت ومشقت سے اس میں نمایاں پیداوار اُگائی۔ تمام زمیندار جِت مل کی محنت کی داد دینے لگے۔ فصل کٹائی کے بعد جب جِت مل نے سارا اناج اکٹھا کیا تو اُس نے مہتا بیر سنگھ کو بھی بُلایا تا کہ وہ اناج کا اپنا حصہ وصول کرے۔ مہتا بیر سنگھ پیداوار کا بہت بڑا ذخیرہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ چنانچہ وہ وعدہ شکنی کر کے پیداوار کے تین چوتھائی حصے پر اپنا حق جتلانے لگا۔ اس پر جت مل نے احتجاج کیا لیکن مہتا بیر سنگھ نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ وہ زبردستی اناج حاصل کریں۔ اس پر جِت مل نے احتجاجاً کٹار اپنے سینے میں بھونک دی اور لہولہان ہوکر اناج کے ڈھیر پر چڑھ کر یہ اعلان کیا کہ جت مل کے خون کے بغیر اس اناج کو اُٹھایا نہیں جاسکتا ہے۔ جِتو کی اس المناک موت سے سارا علاقہ لرز اُٹھا۔ بے گناہ برہمن کی خودکشی نے جاگیردار کے مُجرمانہ ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد یہ تمام خون آلود اناج نزدیک بہنے والے دریائے چناب میں پھینک دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب جِتو کے انتم سنسکار کی رسم انجام دی گئی تو اس کی نوعمر بیٹی اور وفادار خدمتگار نے بھی جلتی چِتا میں چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو نذرِ آتش کیا۔ اس کے بعد جِت مل کسان ''شہید باوا جتو'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔

اس کسان شہید کی یاد میں ہر سال کتک مہینے کی پورنماشی کو جھڑی میں ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے جو ایک ہفتہ تک جاری رہتا ہے۔ اس میلے کا آغاز پورنماشی سے دو یا تین دن قبل ہوتا ہے جب کہ اختتام پانچ دن بعد ہوتا ہے۔ اس میلے میں ہماچل پردیش، ہریانہ، اُترپردیش اور پنجاب کی ریاستوں سے بھی زمیندار لوگ شرکت کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی بڑا میلہ ہوتا ہے جس میں بلالحاظ مذہب وملت لاکھوں کی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میلے کے دوران یہاں پر ایک بڑا بازار سجایا جاتا ہے اور کھانے پینے کی تمام چیزیں میسر رکھی جاتی ہیں۔ محکمہ اگریکلچر اور

اینیمل ہسبنڈری کی طرف سے مختلف پھلوں اور جانوروں کی نمائش کی جاتی ہے۔ میلے میں گھوڑوں اور اونٹوں کی خاصی تعداد دیکھنے کو ملتی ہے۔لوگ اونٹوں پر بیٹھ کر میلے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔جموں خطہ میں اپنی نوعیت کا یہ سب سے بڑا میلہ مانا جاتا ہے۔

اس میلہ میں زمیندار لوگ، کسان شہید باوا جتو کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور استحصال کے خلاف اس ستیہ ویر کی قربانی کو سراہتے ہیں۔ باوا جتو کی سمادھی پر نقدی کے علاوہ چاول، دال اور پھل وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں۔ باوا جتو کی بیٹی بُوا کے نام پھول اور کھلونے وغیرہ نذر کیے جاتے ہیں۔اُس کے نام پر یہاں ایک تالاب بھی موجود ہے۔

بُوا بھاگاں کا میلہ:

اُدہم پور میں دھار روڈ پر منڈی کے مقام سے تقریباً ۸کلومیٹر دور تھیرا کالوال گاؤں آتا ہے۔ یہاں بوا بھاگاں نامی ایک بہادر عورت کی سمادھی ہے جس پر ہر سال ایک میلہ لگتا ہے۔بُوا بھاگاں باوا جِتو کی طرح ایک بہادر اور نڈر عورت تھی جس نے ماضی میں جاگیرداروں کے خلاف زائد لگان وصول کرنے پر احتجاج کے طور پر خودکشی کی تھی۔ یہ میلہ یہاں جون میں لگتا ہے جس میں بلا لحاظ مذہب وملت اس علاقہ کے تمام زمیندار شریک ہوکر بُوا بھاگاں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

میلہ کیلاش یاترا:

بھدرواہ کا علاقہ جسے چھوٹا کشمیر بھی کہتے ہیں، جموں شہر سے تقریباً ۱۹۲کلومیٹر دور ہے۔ بھدرواہ کا یہ خوبصورت قصبہ آشاپتی اور کیلاش کنڈ کی پہاڑیوں کے دامن میں بسا ہوا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں اس علاقہ میں بھدر کالی دیوی کا مسکن تھا جس کی وجہ سے اس کا نام بھدرواہ پڑا۔ بھدرواہ قصبہ سے جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۱۵رکلومیٹر دور کیلاش پہاڑی واقع ہے۔اس پہاڑی پر ڈیڑھ

کلومیٹر رقبہ پر پھیلا ہوا ایک تالاب ہے جسے کیلاش کُنڈ یا کیلاش پتی شیو جی کا تالاب کہا جاتا ہے۔ یہ تالاب سطح سمندر سے ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ تالاب بہت ہی مقدس اور پوتر سمجھا جاتا ہے۔ اس تالاب سے تقریباً ۴ میل اوپر ایک دوسرا تالاب ہے جسے کالی کُند کہتے ہیں۔ مقامی لوگوں کے کہنے کے مطابق کیلاش پہاڑی پر چھوٹے بڑے تقریباً ۱۰۸ تالاب ہیں۔

شری امرناتھ جی کی یاترا کی طرح کیلاش کُنڈ کی یاترا کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ اس یاترا کی چھڑی مبارک گاٹھا کے واسک مندر سے نکلتی ہے اور دو میل اوپر جا کر نگری کے مقام پر دوسرے یاتری بھی چھڑی کے ہمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ یاترا بھادوں مہینے کی ۱۳ تاریخ کو شروع ہوتی ہے۔ چھڑی مبارک صبح سویرے نکلتی ہے اور شام کے وقت کیلاش کنڈ پہنچتی ہے۔ اس یاترا میں بھدرواہ، بلاور، کشتواڑ، اُدہم پور اور ہماچل پردیش وغیرہ سے یاتری شمولیت کرتے ہیں۔ یاترا کے دوران مختلف آلاتِ موسیقی بجائے جاتے ہیں اور بھجن وغیرہ گائے جاتے ہیں۔ یہ میلہ واسک ناگ یا ناگ راجہ کی یاد میں عقیدت کے طور پر منایا جاتا ہے۔ واسک ناگ کے تالاب پر کوئی مندر یا دھرم سالہ وغیرہ نہیں ہے۔ یاتریوں کو اس تالاب کے گردونواح میں چٹانوں کے نیچے پناہ لینی پڑتی ہے۔ یاتری ساری رات تالاب کے کنارے بیٹھ کر لکڑیاں جلاتے ہیں۔ بلند سطح پر تالاب کے واقع ہونے کی وجہ سے یہاں کافی سردی ہوتی ہے۔ یاتری رات بھر بھجن اور کیرتن گاتے ہیں۔ فطری ماحول اور سوز وگداز کا سماں ایک پُرکشش نظارہ پیش کرتا ہے۔ دوسرے روز چتر چودش کو صبح سویرے یاتری تالاب میں نہاتے ہیں جو اس یاترا کی آخری رسم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات اس تالاب کے کنارے پر ایک سانپ نمودار ہوتا ہے۔ اس شگون کو بہت مبارک اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر یاتری ناگ کے درشن کرتے ہیں اور ''ناگ راجہ واسک

کی جے'' کے فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہیں۔ اشنان کی رسم کے بعد بیش تر یاتری واپس چلے آتے ہیں لیکن کچھ یہیں قیام کرتے ہیں اور کچھ کالی کنڈ کے تالاب پر چلے جاتے ہیں۔ کیلاش یاترا کے موقع پر بھدرواہ میں دو دن کی سرکاری تعطیل منائی جاتی ہے۔

کیلاش یاترا کے بارے میں کئی طرح کی لوک روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق قدیم زمانہ میں جب ناگوں اور گرڑ کی دُشمنی انتہا پر تھی تو گرڑ نے ہمیشہ کے لیے ناگوں کا خاتمہ کرنے کا تہیہ کیا اور وہ ان کے درپے ہو گیا۔ ناگ راجہ، واسک، جو ناگوں کا سردار تھا۔ گُرڑ سے بچنے کے لیے بھدرواہ منتقل ہوا اور بھدرواہ کی بھدرکالی دیوی سے تحفظ کی استدعا کی۔ بھدرکالی نے اپنا بھدرواہ کا علاقہ اس کے لیے وقف کیا اور وہ خود کالی کنڈ کے مقام پر چلی گئی لیکن گرڑ نے یہاں پر بھی ناگ راجہ کا تعاقب کیا اور ناگ راجہ کیلاش کنڈ (تالاب) میں روپوش ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد جب گرڑ نے کیلاش کنڈ کے ایک کونے میں خندق کھودی، تاکہ تالاب کا پانی خشک کر کے واسک ناگ کو ڈھونڈ نکالے اور اُس کا خاتمہ کردے تو واسک ناگ نے سرسوتی سے مدد مانگی، جس کی جھیل کیلاش کنڈ سے اوپر واقع ہے۔ سرسوتی دیوی نے اُس کی التجا قبول کی۔ اس طرح سرسوتی کا پانی اس جھیل کی طرف بہنے لگا۔ جب گرڑ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب جھیل خشک نہیں ہوسکتی تو وہ وہاں سے ناکام ہو کر چلا آیا۔ کیلاش یاترا کے اس میلہ کو لوگ راجہ واسک ناگ کی کامیابی کی یاد میں مناتے ہیں۔

میلہ گُردوارہ ننگالی صاحب:

صوبہ جموں کے پونچھ قصبہ میں سکھوں کا مشہور گُردوارہ ننگالی صاحب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سکھ مت پونچھ میں گُرو ارجن دیو کے زمانہ میں آیا ہے جو شہنشاہ جاگیر کا ہمعصر تھا۔ وہ پانچواں گُرو تھا اور اُس نے بہت سے پرچارک، سکھ مذہب کی اشاعت کے لیے پونچھ بھیجے۔ اُس کے بعد دسویں گُرو، گرو گوبند سنگھ (جس نے خالصہ

پنتھ کی بنیاد ڈالی) نے بھی بہت سے پرچارک پونچھ بھیجے۔ان میں ایک بابا روچا سنگھ بھی شامل تھے جوایک سو پندرہ سال کی عمر میں راولکوٹ کے مقام پر انتقال کر گئے۔بابا روچا سنگھ کے بعد سنت بھائی میلا سنگھ آئے جس نے گردوارہ ننگالی صاحب کو قائم کیا۔ سنت بھائی کو سکھوں کے علاوہ مسلمان اور ہندو دونوں احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔اس کے نام پر اُس وقت کے حکمرانوں نے جاگیریں بھی وقف کر دی تھیں۔اس گردوارہ کو آج کل بھی بہت اہم اور مقدس سمجھا جاتا ہے۔اس گردوارہ کا مہنت ہمیشہ کنوارہ اور غیر شادی شدہ ہوا کرتا ہے۔شراب اور گوشت بھی اس گردوارہ کے احاطہ میں استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔یہ گردوارہ پونچھ قصبہ سے تقریباً ۵ کلومیٹر دور سنت پورہ گاؤں میں واقع ہے۔اس گردوارہ میں ہر اتوار کو ایک بہت بڑا دیوان لگتا ہے جس میں کافی لوگ شرکت کرتے ہیں۔

<u>**میلہ ویشنو تیرتھ:**</u>

صوبہ جموں میں ویشنو تیرتھوں کی کافی تعداد ہے۔ان ویشنو تیرتھوں میں رگوناتھ مندر، گدادھر مندر یا لکشمی نرائن مندر، رادھا کرشن اور نرسہا مندر شامل ہیں۔ یہ مندر اگرچہ صوبہ جموں کے مختلف مقامات میں پائے جاتے ہیں مگر ان میں رگوناتھ مندر سب سے مشہور ہے۔اس کی چاروں اطراف کل بیس (۲۰) مندر ہیں جن میں بڑی تعداد میں مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ان مندروں میں روزانہ پوجا پاٹھ، بھجن اور کیرتن وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے اور مختلف تہواروں کے موقعوں پر ان مندروں میں لوگوں کی کافی بھیڑ رہتی ہے۔خصوصاً جموں شہر میں مندروں کی کافی تعداد موجود ہے جس کی وجہ سے اسے مندروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔

وادیٔ کشمیر کی طرح جموں خطہ میں بھی دور دراز ملکوں سے اولیائے کرام اور مذہبی رہنما تشریف لائے۔ان بزرگوں نے کشف وکرامات اور روحانی کمالات سے

لوگوں کو بے حد متاثر کیا اور لوگ اُن کے حلقہ ٔ ارادت میں آ کر ان کے مشن کے پیرو کار ہو گئے۔ اِن اولیائے کرام اور مذہبی رہنماؤں سے والہانہ عقیدت رکھنے والے مسلمانوں نے اِن کے وصالِ حق ہونے کے بعد اُن کے نام پر یا مقبروں پر زیارت گاہیں اور خانقاہیں تعمیر کیں جہاں وہ ایصال ثواب اور مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی حاجات کی برآوری کے لیے دُعائیں مانگتے ہیں، ان بزرگوں کی یاد تازہ کرنے کے لیےان زیارت گاہوں پر سالانہ عرس کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کی مذہبی خدمات پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ یہ زیارت گاہیں اس خطہ کے مختلف مقامات پر دیکھی جاسکتی ہیں جن پر ہر سال بڑے پیمانے پر عرس منائے جاتے ہیں۔

عرس شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ:

اس عُرس کو دستگیر صاحب کا عرس بھی کہتے ہیں۔ یہ عرس چھٹی صدی ہجری کے عظیم روحانی پیشوا اور سلسلہ ٔ قادریہ کے بانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ گیلان کے رہنے والے تھے۔ وہ برگزیدہ ،اولوالعزم روحانی پیشوا اور مذہبی مبلغ تھے۔ اسلام کی اشاعت اور تشہیر میں انہوں نے نمایاں خدمات سرانجام دیں ہیں۔ اُنہیں سرتاجِ اولیاءٔ ،غوث الاعظم اور غوث الثقلین جیسے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ بغداد میں اُن کا مرقد پُر انوار ملجائے خاص وعام ہے۔ صوبہ جموں میں پونچھ کے مقام پر ان کے نام پر ایک زیارت شریف ہے اور کرادہ بانہال، رام بن میں بھی ایک عالیشان خانقاہ ہے۔ اس خانقاہِ عالیہ میں کچھ مستند اور تواریخی نوادارات ہیں۔ جن میں حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے موئے مقدس کے علاوہ امام الاعظم حضرت ابوحنیفہؓ کی کلاہِ مبارک اور حضرت شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اوراد شریف کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ یہ قلمی نسخہ فنِ کتابت کا بے نظیر نمونہ ہے۔

اس زیارت شریف پر ہر سال ایک بہت بڑا عرس منایا جاتا ہے اور اس موقع پر ان نواورات کے دیدار کرائے جاتے ہیں جس کے لیے زائرین کی اچھی خاصی تعداد آجاتی ہے جن میں ہندو اور سکھ وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ عرس کے دوران کراوہ گاؤں میں کافی دُکانیں سجائی جاتی ہیں۔ عرس کے موقع پر منقبت اور نعت خوانی کی جاتی ہے اور غوث الاعظمؒ کی حیاتِ بابرکات اور کارناموں پر مفصل روشنی بھی ڈالی جاتی ہے۔

عرس حضرت شاہ فریدالدینؒ:

حضرت شاہ فریدالدّینؒ بغداد کے رہنے والے تھے۔ وہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے۔ اشاعتِ اسلام کی خاطر انہوں نے ۱۶۵۶ء میں ہندوستان سے کشتواڑ کا سفر اختیار کیا جب کشتواڑ پر راجہ جے سنگھ کی حکومت تھی۔ حضرت شاہ فریدالدّین بغدادی ایک بلند پایہ بزرگ اور روحانی کمالات کے مالک تھے۔ وہ نہایت ہی سادہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنی ساری عمر کے دوران انہوں نے جو کی روٹی اور سبزی کے علاوہ کوئی بھی لذیذ کھانا نہیں کھایا۔ لوگ ان کی سادہ شخصیت سے متاثر ہوکر جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ ان کی کئی ایک کرامات میں سے ایک یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ انہوں نے ایک نابینا شخص کی کھوئی ہوئی بصارت کو پھر سے بحال کیا۔ ان کا روضۂ مبارک یا خانقاہ کشتواڑ میں ہے۔ جسے آستانِ بالا کہتے ہیں۔ اُن کے دو فرزند حضرت اخیارالدّینؒ اور سید انوارالدّین بھی اسی خانقاہ کے اندر مدفون ہیں۔ اس زیارت پر ہر سال ۷ ہاڑ کو ایک بہت بڑا عرس منایا جاتا ہے جس میں ضلع بھر کے علاوہ وادی کشمیر کے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں۔

عرس حضرت شاہ اسرارا لدّینؒ:

حضرت شاہ اسرارالدّینؒ حضرت شاہ فریدالدینؒ کے چھوٹے فرزند تھے۔ وہ مادرزاد ولی اور زبردست روحانی کمالات کے مالک تھے۔ حضرت شاہ نے ابتدائی تعلیم

وتربیت اپنے والد بزرگوار ہی سے حاصل کی اور روحانی کمالات میں زبردست مقام حاصل کیا۔ وہ چھوٹی عمر میں ہی اپنے کمالات اور کرامات کی وجہ سے لوگوں میں زبردست مقبول ہوئے۔ حضرت شاہؒ عہد شباب ہی میں رحلت فرما گئے جب کہ اُن کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ حضرت حضرت شاہ اسرارالدّینؒ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ یہ حیرت انگیز واقعہ منسوب ہے کہ انہوں نے ایک ہندولڑکے کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ اسرارؒ ایک دن ایک ہندولڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے اور اس کھیل میں ہندولڑکے نے حضرت شاہؒ کے مقابل بازی ہاری اور اس کے بعد کھیل کا وقت ختم ہوگیا۔ اتفاق سے اُسی رات کو وہ ہندولڑکا انتقال کرگیا۔ دوسرے روز جب لوگ اُس کی ارتھی لے جارہے تھے تو حضرت شاہ اسرارؒ راستے میں اُن سے ملے۔ حضرت شاہ کے پوچھنے پر انہیں بتایا گیا کہ میت اُسی لڑکے کی ہے جو گزشتہ روز حضرت شاہؒ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ حضرت شاہؒ نے میت کو آگے لے جانے سے یہ کہہ کر روک لیا کہ اس لڑکے کو ہاری ہوئی بازی پوری کرنا باقی ہے۔ اس طرح سے لوگوں نے حضرت شاہؒ کے اصرار پر میت کو زمین پر رکھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ اسرارؒ نے اس لڑکے کو آواز دی اور وہ زندہ ہوکر اُٹھ ہوگیا اور حضرت شاہؒ کے ساتھ کھیلتے ہوئے اپنی ہاری ہوئی بازی پوری کرلی اور اس کے ساتھ ہی پھر دم توڑ گیا۔ لوگ اس واقعہ کو دیکھ کر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس واقع کی اطلاع حضرت شاہ اسرارؒ کے والد حضرت شاہ فریدالدینؒ کو ملی تو انہوں نے حضرت شاہؒ کی جانب سے اس حیرت انگیز کرامت کا انکشاف کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ حضرت شاہ اسرارؒ اس کے بعد فوراً ہی انتقال کرگئے۔

حضرت شاہ اسرارؒ کا روضۂ مبارک کشتواڑ کے چوگان میدان کے جنوب مغربی کونے پر واقع ہے جسے آستانِ پائین کہتے ہیں۔ یہ زیارت ریاست بھر کی مشہور

زیارت گاہوں میں شُمار کی جاتی ہے۔ کتک مہینے کی ۲۵ رتاریخ کو یہاں ہر سال ایک بہت بڑا عرس منایا جاتا ہے جس میں ضلع ڈوڈہ اور بیرون ضلع کے لوگ بھی کثیر تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں کے لوگ اس زیارت سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اور انہیں اپنا ملجاو ماوا سمجھتے ہیں۔

عرس پیر فضل شاہؒ:

کٹھوعہ قصبہ کے مشرق کی طرف پارلی بنڈ کے مقام پر پیر فضل شاہ نامی ایک ولی اللہ کا مرقد ہے۔ اس بزرگ کا تعلق شبانوں کے خاندانوں سے بتایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیر فضل شاہ میں بچپن کے زمانے سے ہی ولیوں کے اوصاف پائے جاتے تھے۔ وہ نہایت ہی سادہ مزاج اور عبادت گزار تھے۔ ان کے مقبرہ پر ہر سال ۲۴ رکتک کو ایک بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر مقبرے کے آس پاس خوشبو جلائی جاتی ہے اور نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔

عرس پیر چتر شاہؒ:

کٹھوعہ ضلع میں ہی نگری کے مقام پر ایک دوسرے مسلمان ولی اللہ بابا چتر شاہ کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرہ کے گرد چار دیواری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دیوار پر کئی بار چھت ڈالی گئی لیکن یہ ہر بار خود بخود گرتی رہی جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ پیر کو چھت پسند نہیں ہے۔ عقیدتمندوں نے اس زیارت پر کئی رنگوں کی جھنڈیاں نصب کی ہیں۔ یہاں پر ایک بہت بڑا چشمہ بھی ہے اور لوگوں کا تجربہ ہے کہ اس چشمہ میں نہانے سے جلد کی تمام بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس چشمہ میں لوگ نہانے سے پہلے نمک ڈالتے ہیں۔ ہر سال اسوج مہینے کی ۱۷ رتاریخ کو یہاں پر ایک بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شرکت کرتے ہیں۔ اس دن یہاں خوب چراغاں کیا جاتا ہے جس

میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

عرس پیر شاہ درّہ شریف راجوری:

راجوری قصبہ سے تقریباً ۲۰ رکلومیٹر دور شاہدرہ کے مقام پر ایک مسلمان ولی اللہ پیر غلام شاہؒ کا مزارِ اقدس ہے۔ پیر غلام شاہ ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں سیدہ قیصران میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن ہی میں انہوں نے اپنے روحانی کمالات کے انکشافات سے لوگوں کو بے حد متاثر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر انہوں نے کچھ ایسا روحانی کمال دکھایا کہ اُن کا مرشد اُن سے ناراض ہوگیا اور ان کو سی۔ درّہ (موجودہ شاہدرہ) جانے کا حکم دیا۔ پیر صاحب کو شاہدرہ کے محل وقوع کے بارے میں واقفیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ بہت عرصہ تک منزلِ مقصود کی تلاش میں رہے۔ سب سے پہلے وہ راولپنڈی (پاکستان) سے منتقل ہوکر کالابن (پونچھ) پہنچے جہاں وہ کچھ عرصہ تک مقیم رہے۔ اس کے بعد پونچھ میں ہی ڈنڈک کے مقام پر پہنچے اور ریاضت وعبادت میں مشغول رہے۔ آخرکار انہیں ایک رات جب خواب میں اپنے مرشد کی جانب سے شاہدرہ کے محل وقوع کے بارے میں اشارہ ملا تو وہ شاہدرہ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں انہوں نے سات سال تک قیام کیا اور عبادت الٰہی میں مشغول رہے۔ اُن کی رحلت کے بعد اُن کا مقبرہ تعمیر کیا گیا جہاں ہر سال لوگ اُن کی یاد میں عرس منایا جاتا ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں اس زیارت کے نام ایک بڑی جاگیر مخصوص کی ہے۔ اب یہ زیارت شریف محکمہ اوقاف کی نگرانی میں ہے اور یہاں سے محکمہ اوقاف کو کافی آمدن ہوتی ہے۔ اس زیارت کے ساتھ مسلمانوں کے علاوہ ہندو لوگ بھی بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ شاہدرہ کے اس بزرگ کے تعلق سے راجوری میں ۱۹۷۶ء خورشید بسمل کی نگرانی میں سے ایک پرائیویٹ ہائر سکنڈری سکول مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ بابا غلام شاہ اکیڈیمی

کے نام سے اطراف واکناف میں علم کی روشنی پھیلانے میں مصروف ہے اور ۲۰۰۵ء میں'' باباغلام شاہ بادشاہ'' نام سے ایک یونی ورسٹی بھی راجوری میں قائم کی گئی ہے جہاں پیشہ ورانہ تکنیکی تعلیم کے علاوہ عربی ،اردواور اسلامک سٹڈیز کی اعلیٰ تعلیمی سہولیات بھی میسر ہیں۔

<u>عرس پیر خاناؒ:</u>

بسوہلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'چھوڑی لاوا، میں خانا نامی ایک مسلمان بزرگ کا مقبرہ ہے۔اس علاقہ کے زمیندار لوگوں کو اس بزرگ کے ساتھ زبردست عقیدت رہی ہے ۔ یہاں آٹھ نو اور دس اسوج کو ہر سال اس پیر کی یاد میں ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔جس میں ہندواور مسلمان سب شرکت کرتے ہیں۔ پیر کے مقبرہ کے متصل ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔

<u>عرس پیر روشن ولی شاہؒ:</u>

جموں شہر میں گمٹ گیٹ کے نزدیک پیر روشن ولی شاہؒ نامی ایک ولی اللہ کا مقبرہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ بزرگ عرب سے تشریف لاکر گُمٹ میں مقیم ہوئے جہاں اُن دنوں ایک جنگل تھا۔ پیر صاحب کی رحلت کے بعد اُن کا مقبرہ وہیں تعمیر کیا گیا۔ یہ مقبرہ صرف پتھروں سے بنایا گیا ہے۔بعد میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس مقبرہ کو تعمیر کرایا۔اب یہ زیارت محکمہ اوقاف کی نگرانی میں ہے۔زیارت کے متصل ایک مسجد بھی ہے۔پیر روشن ولی شاہؒ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اُن کا قد بہت ہی لمبا تھا اور انہیں پیر نوگزیعنی نوگز لمبے قد والا پیر بھی کہا جاتا تھا۔تمام مذاہب کے ماننے والے اس بزرگ کا احترام کرتے تھے اور آج بھی اُسی احترام اور عقیدت کے ساتھ یہاں آتے ہیں ۔ اس زیارت پر ہر جمعرات کو چراغاں کیا جاتا ہے اور مغفرت اور ثواب کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

پیر مِٹھا صاحب:

پیر مٹھا نام کے ایک مسلم بزرگ پندرہویں صدی کی نصف دہائی میں راجہ عجائب دیو کے وقت میں گزرے ہیں۔ ان کا مقبرہ جموں میں پیر کھوہ کے مندر کے متصل ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ پیر صاحب بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ وہ کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ وہ اپنے مریدوں سے عموماً شکر یا کھانڈ لانے کی فرمائش کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ پیر مٹھا کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ چونکہ شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اُن کی زیارت کے ساتھ ایک شیعہ مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔ اس زیارت پر اکثر جمعرات کو چراغاں کیا جاتا ہے لیکن محرم کے دنوں میں یہاں پر خصوصیت کے ساتھ چراغاں کیا جاتا ہے اور منقبت خوانی بھی کی جاتی ہے۔

ان خانقاہوں اور زیارتوں کے علاوہ اور بھی کئی ایک مقامات پر کچھ بزرگوں کے مقبرے موجود ہیں۔ جہاں پر لوگ اکثر موقعوں پر جا کر ایصالِ ثواب کی دعائیں مانگتے ہیں اور ان بزرگوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے عرس وغیرہ مناتے ہیں۔ ان زیارتوں میں حسب ذیل زیارتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زیارت پیر بڈھن علی شاہؒ (ستواری جموں)، زیارت پیر غریب شاہ (سانبہ)، تکیہ اورنگ علی شاہ (ادہم پور)، پیر گندر شاہ (بھدرواہ)، زیارت پیر چھوٹے شاہ (مینڈر ضلع پونچھ)۔ یہ تمام بزرگانِ دین مختلف مقامات سے آ کر اس خطہ کے لوگوں کو روحانی تعلیمات سے فیضیاب کرتے رہے۔ ان بزرگوں کے نام پر قائم کی گئی خانقاہوں یا زیارتوں پر آج بھی عقیدتمندوں کا بھاری ہجوم رہتا ہے جہاں ان بزرگانِ دین کی مذہبی اور دینی خدمات کو یاد کیا جاتا ہے اور ان کی تعلیمات سے فیض حاصل کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا کہ جموں خطہ میں کچھ میلے اور تہوار ایسے بھی

ہیں جن کی ایک منفرد اور مقامی حیثیت ہے۔ یہ میلے اور تہوار یہاں کی سماجی زندگی میں ایک رونق پیدا کرتے ہیں اور لوگوں کو مسرت واطمینان کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ان میں مردوں کی نسبت زیادہ تر لڑکیاں اور عورتیں ہی شریک کار رہتی ہیں۔ ایسے تہواروں میں راڑے، سکولڑے، بچھ دوا، بڑی تُلسی کا برت، کڑوا چوتھ، پُگھا اور کھار وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔

راڑے:

یہ جموں خطے کا مقامی تہوار ہے۔ اسے نوعمر لڑکیاں اپنے بھائیوں اور والدین کی خیر خواہی کے طور پر مناتی ہیں۔ یہ تہوار ہاڑ مہینے کی پہلی تاریخ سے ساون مہینے کی پہلی تاریخ تک منایا جاتا ہے۔ راڑے منانے کا طریقہ یہ ہے کہ لڑکیاں مٹی کے گھڑوں کا نصف بالائی حصہ احتیاط کے ساتھ علاحدہ کرکے اسے اپنے صحن کے کسی نمی والے حصے میں نصب کر لیتی ہیں اور ان کے اندر مختلف قسم کے بیج یعنی جو، ماش اور کپاس وغیرہ بوتی ہیں۔ گھڑے کا اوپر والا حصہ ان بیجوں کی نشو ونما ہونے میں حفاظت کرتا ہے۔ ایک لڑکی کے جتنے بھائی ہوں۔ اتنی ہی تعداد میں راڑے نصب کیے جاتے ہیں۔ والدین کے نام پر بھی ایک راڑا نصب کیا جاتا ہے جسے باقی راڑوں کے درمیان میں جگہ دی جاتی ہے۔ ایک محلے کی چند لڑکیاں اکٹھے مل کر ایک ہی جگہ پر راڑے بنا لیتی ہیں۔ اس کے بعد ہر اتوار کو آٹے میں مختلف قسم کے رنگ ملا کر ان راڑوں یعنی مٹی کے گھڑوں کے پیندے پر چتر کاری کی جاتی ہے۔ اس موقعہ پر لڑکیاں مل جل کر اپنے گھروں سے اچھے اچھے قسم کے پکوان لا کر اکٹھے بیٹھ کر کھاتی ہیں اور گانے وغیرہ بھی گاتی ہیں۔ اس طرح سے ایک مہینے کے دوران لڑکیوں کو چار بار راڑوں پر چتر کاری کرنے اور مل بیٹھ کر گانے بجانے کا موقع ملتا ہے۔ ہاڑ مہینے میں راڑوں کی وجہ سے گھروں میں خوب چہل پہل رہتی ہے۔ پہلی ساون کو لڑکیاں راڑوں کو اکھیڑ کر

دور کسی دریا یا تالاب میں پھینک آتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ راڑوں کے دوران ایک موسم میں مختلف قسم کے بیجوں کے اُگنے کے تناسب اور اُن کی شرحِ بالیدگی(Growth Rate) کا پتہ بھی چلتا ہے۔راڑوں کے موقع پرمختلف قسم کے لوک گیت بھی سننے کو ملتے ہیں۔

نیلے امبر کالے بدل چار چوفیرے چھائے
رُت سہانی برساتاں دی گُڑیاں راڑے رائے

سکولڑے یا منجروں کا تہوار:

ساون کی پہلی تاریخ کو راڑوں کے تہوار کے اختتام کے ساتھ ہی منجروں کا تہوار بھی شروع ہوتا ہے۔لڑکیاں اس موقع پر ایک دوسرے کو کناری دار اور رنگین پھول نُما منجرے کانوں میں ڈالتی ہیں۔ان منجروں کو سکولڑے بھی کہا جاتا ہے۔اس موقع پر نئی بیاہی جانے والی لڑکیوں کو اپنے سسرال والوں کی طرف سے نئے ملبوسات اور زیورات بھی بھیجے جاتے ہیں۔اس تہوار پر لڑکیاں خوب شادیانے مناتی ہیں اور گانے بجانے کا خوب پروگرام ہوتا ہے لیکن شہری آبادی میں اب اس تہوار کا چلن زیادہ نہیں رہا ہے۔

بچھ دوا:

یہ دراصل زمینداروں اور کسان طبقے کے لوگوں کا تہوار ہے۔ ہر سال جنم اشٹمی کے موقع پر عورتیں اپنے گھروں میں تقریباً دو چار دن پہلے چنے کی دال کو بھگو لیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس دال سے لونگ نکل آتے ہیں۔اس کے بعد اسے آٹے اور ہلدی کے پانی میں ملا کر اس مرکب سے اپنے مال مویشیوں کی تعداد کے مطابق جانوروں کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں بنائی جاتی ہیں اور پھر انہیں کسی بڑے تھال میں ڈال کر کسی تالاب یا دریا کے کنارے لے جایا جاتا ہے جہاں ان کی پوجا کی جاتی

ہے۔ چنے کی دال کا مُرکب بھی ساتھ لے جایا جاتا ہے۔ یہ تہوار عورتیں مل جُل کر مناتی ہیں۔ اس موقع پر اپنے بچوں کی تندرستی کے ساتھا ساتھ مال مویشیوں کی تندرستی کے لیے بھی پرارتھنا کی جاتی ہے اور گیت اور سنگیت کا خاص پروگرام ہوتا ہے۔

تُلسی کا برت:

یہ بھی اس خطہ کا معروف تہوار ہے۔ اس موقعہ پر تُلسی کے پودے کی پوجا کی جاتی ہے۔ تُلسی پودے کے اردگرد، ایک سوایک بتیاں رکھ کر چراغاں کیا جاتا ہے اور اس کے گرد ایک سوایک چکر کاٹے جاتے ہیں۔ تُلسی کا یہ پودا گملے میں رکھا ہوتا ہے اور گملے پر خوب چتر کاری کی جاتی ہے۔ راڑوں کی طرح یہ تہوار بھی ایک ماہ جاری رہتا ہے۔ تُلسی کے پودے کی ٹہنیوں میں کلیرے ڈالے جاتے ہیں اور تُلسی کے پودے کے اوپر مختلف پھل وغیرہ رکھ کر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس تہوار کے دوران گھروں میں صفائی کا پورا انتظام رکھا جاتا ہے اور خوب چہل پہل دیکھنے میں آتی ہے۔ اس تہوار پر اور اس سے ایک دن قبل عورتیں برت رکھتی ہیں۔

کرواچوتھ کا تہوار:

یہ تہوار ہندو عورتیں اپنے پتی (شوہر) کی صحت اور درازیِ عمر کے لیے مناتی ہیں۔ چوتھی کے روز عورتیں صبح سویرے اُٹھ کر کوئی طاقتور غذا کھاتی ہیں اور پھر دن کو برت رکھتی ہیں۔ شام کے وقت نئے زیورات اور ملبوسات پہن کر ایک تھال میں مختلف میوے یعنی بادام اور کھجوریں وغیرہ ڈال کر اپنی سہیلیوں کو پیش کرتی ہیں۔ ان پھلوں میں ہر ایک کی تعداد تیرہ ہوتی ہے۔ ان پھلوں کو یہ لوگ بیا کہتے ہیں۔ پھلوں سے بھرا ہوا تھال ساس اور سسر کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ عورتیں چاند نکلنے کا انتظار کرتی ہیں اور چاند نکلتے ہی اس کے سامنے شوہروں کی درازیِ عمر اور تندرستی کے لیے پرارتھنا کرتی ہیں۔ چاندنی رات کا یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، جب زمین پر بے شمار

چاند سج دھج کر دعائیں مانگتے ہیں۔

گوپال اشٹمی:

یہ بھی ہندوؤں کا اہم تہوار ہے۔اس موقع پر زمیندار لوگ پھولوں کے ہار بنا کر گایوں کے گلے میں ڈالتے ہیں۔گایوں کو نہلایا جاتا ہے اوران کی دُم بھی دھوئی جاتی ہے۔اس کے بعد اُن کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ تہوار کتک مہینے کے اندھیرے پندرواڑے میں منایا جاتا ہے۔

پُکھا:

یہ تہوار عورتوں میں زیادہ مقبول ہے اور ہر سال پوہ یا ماگ کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔اس تہوار کے موقع پر عورتیں برت رکھتی ہیں اور چاند نکلنے کے بعد ہی پھل وغیرہ کھاتیں ہیں۔اس برت کے بعد خاص طور شام کے وقت تِل کوٹ کر شکر کے ساتھ ملا کر کھائے جاتے ہیں۔ اس تہوار کے بعد تل بہت ہی کم کھائے جاتے ہیں کیونکہ اصولِ صحت کے مطابق اس موسم کے بعد تل کھانا صحت کے لیے مفید نہیں سمجھا جاتا۔

کھار کا تہوار:

یہ تہوار زمیندار لوگ نئی فصل سے حاصل کیا گیا اناج پہلی بار کھانے کے موقع پر مناتے ہیں۔ نیا اناج کھانے سے پہلے اچھے قسم کے پکوان تیار کر کے دیوتاؤں کو پیش کیے جاتے ہیں ۔اس تہوار پر پہلی دفعہ نئے اناج سے تیار کیے گئے کھانے کی افتتاحی رسم کسی ہمسایہ سے کرائی جاتی ہے۔ یہ چھوٹا موٹا تہوار زمیندار نجی سطح پر ہی ایک ہی موسم کے مختلف دنوں پر مناتے ہیں۔

●●●

☆......عطا محمد میر

کشمیر کا طرزِ تعمیر

مورخین کے مطابق نارڈک ناگا Nordic Naga کشمیر کے قدیم یا صحیح معنوں میں اولین آباد کار تھے۔ وہ جسمانی طور تنومند اور قد آور بھی تھے اور فکر وعمل میں جرأت مند بھی۔ میانہ قد وقامت کا ایک لڑاکو نسلی گروہ یا قبیلہ جس کو پشاچ کہا جاتا ہے ہندوکش پہاڑوں کو عبور کر کے وارِدِ وادی ہوا۔ وہ تند مزاج بھی تھے، خونخوار بھی، ضدی اور ہٹ دھرم بھی۔ تیسرے مرحلے یا بعد کے اَدوار میں رِگ ویدک آریہ قبیلوں کی ٹکڑیاں، جو اپنے ذیلی گروہ سرسوتی، کھتریہ، برہمن اور ویشا پر مُشتمل تھے، اس وادی میں مرحلہ وار داخل ہوئیں۔ بحیثیت مجموعی آریہ اختراعی مزاج کے مالک تھے۔ اُن میں سماجی شعور رچا بسا تھا۔ وہ Adjustment میں یقین رکھتے تھے۔ وادیٔ کشمیر کے اردگرد اُونچے فصیل نما پہاڑوں، اس کے خاص تند وشیرین موسموں، یہاں کی زرخیز اور خوشنما زمین اور سب سے بڑھ کر وقت کے گزرتے دھارے نے اِن مختلف المزاج نسلی گروہوں اور ایک طرح کے آوارہ گرد قبیلوں کو ایک ایسے مشترکہ کلچر میں ضم کیا، جس کو ہم ''ہمالیائی تہذیب'' "Himalayan Civilization" کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یہ تہذیب یا انسانی معاشرہ ناگا لوگوں کی تندی، پشاچ لوگوں کی ہمت و جرأت، آریہ لوگوں کی نفاست اور ذہانت کا نہ صرف ایک حسین سنگم ثابت ہوا بلکہ یہ اُن کی قومی پہچان بھی بن گئی۔ ان لوگوں نے اس مٹی سے اس وجہ سے بھی بہت محبت کی کہ اس کے نشیب وفراز میں اُنہیں اپنے مسکن کے علاوہ اپنے مزاج اور اعتقادات

کے مطابق عبادت گاہیں تعمیر کرنے کیلئے تین بنیادی چیزیں، اینٹ، پتھر اور لکڑی وافر مقدار میں ہر سو دستیاب تھیں۔ بہتے پانیوں اور چشموں سے اُنہیں خاص لگاؤ تھا، جس نے اُنہیں سماج اور زندگی سے محبت کرنا سکھایا۔ بنیادی مواد Key Constructional Material کے فن کارانہ استعمال سے تاریخ کے مختلف ادوار میں کشمیریوں کے خاص طرزِ تعمیر نے اُنہیں ایک خاص شناخت عطا کی۔ یہ اُن کی تاریخ کے خاص ابواب بھی ثابت ہوئے۔ دستیاب بنیادی مواد سے اُنہوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ستوپا بھی تعمیر کئے، مندر بھی اور خانقاہیں اور مسجدیں بھی، حکومتی ایوان بھی اور ذاتی مسکن بھی۔

کشمیر کی تاریخ تین قابلِ ذکر عبوری ادوار Transitional Periods سے گزری ہے، جس کی وجہ سے کشمیریوں کی مجموعی سیاسی، مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی تغیر و تبدل کے ایسے تعمیری رنگوں سے ہمکنار ہوئی کہ یہ ''ہمالیائی تہذیب'' اپنے اندر ایک قوسِ قزح بن گئی۔ اس ہمالیائی قوم نے وہ تمام اقدار اور رنگ جو اس طرح کی تبدیلیوں کا خاصہ ہوتے ہیں، کو اپنے اندر اس طرح جذب کیا جیسے کہ وہ اِس کے اپنے ہی کھوئے ہوئے رنگ تھے۔ یہ مٹی تو زرخیز تھی ہی جس وجہ سے زرخیزی نے اپنے جوہر دکھائے۔ اس طرح ہر بیج کو برگ بار عطا ہوا۔ اس نرم و نازک اور بھینی بھینی خوشبو والی زمین، جس میں چناروں کی جسامت اور گل لالہ کی رنگت و نزاکت خوابیدہ تھی یا جس زمین کے ضمیر میں بقول شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ آتشِ چنار ہے؟ نے بدھ مت کا ایک ایسا شاندار دور دیکھا، جس کے پیروکاروں کی تعمیر کردہ دانش گاہوں، معابد اور وہار کو دیکھنے کیلئے ایک ہزار سال بعد چین کا مشاق مذہبی سیاح ہیون سانگ (631-33 عیسوی) یہاں کا سفر کرتا ہے، وہ ان سینکڑوں بودھ ستوپوں اور عبادت گاہوں کا، جو مہاراجہ اشوک (264-228 ق م) سے لے کر کشان دور تک تعمیر ہوتے

رہے۔ وہ اس کا نہ صرف بچشم خود مشاہدہ کرتا ہے بلکہ ان کے ذِکر سے اپنے سفر نامے کو بھی زینت بخشتا ہے۔ اُس کے دوسو سال بعد تک یہاں بہت سے ایسے بودھ وہار موجود تھے، جن کا ذکر اسی طرح کے ایک اور چینی سیاح اوکانگ (859 عیسوی) بھی کرتا ہے۔ اس ہمالیائی زمین نے ہندومت اور شومت کا ایک ایسا طویل دور بھی دیکھا، جس کی داستان زبان حال کی طرح وہ منادر اور اس عقیدے سے منسوب وہ تعمیرات صاف واضح الفاظ میں بیان کر رہی ہیں، جو وادی کے طول وعرض میں آج بھی موجود ہیں۔ پھر اسلام کے نور نے جب اس زمین کے طول وعرض کو روشن کیا، تو اس نے یہاں کے مکینوں کی طرز زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کی طرز معاشرت، طرز فکر اور طرز تعمیر میں بھی انقلابی تبدیلیاں لائیں۔ ایسے تین اہم عبوری ادوار سے گزرتے ہوئے یہاں کے لوگوں کا فکر وعمل، طرز معاشرت، طرز تعمیر اور مذہبی اعتقادات کا دھارا اگر چہ مسلسل بدلتا رہا، مگر اس زمین نے تہذیبی چپقلش Civilizational Clashes اور منافرت کو اُسی طرح اپنی بوقلموں اور رنگا رنگ زندگی میں کوئی جگہ نہیں دی، جس طرح قوس قزح کالے رنگ کو اپنے اندر جگہ نہیں دیتا۔ Afoot through Kashmir valleys کی مصنفہ مارین ڈاگٹی اسی تناظر میں لکھتی ہیں:

The Brahmans and Buddhists agreed to differ without conflict or over-heated contention.

کشمیریوں کو ہر زمانہ میں اپنے اعتقادات اور مذہب سے جان کی حد تک لگاؤ رہا ہے اور اس سے متعلق ہر اچھی روایت کو اپنایا اور اس پر عمل کرنے کی سعی بھی کی۔ مگر کسی تبدیلی اور اعتقاد کو باعث نزاع نہیں بنایا۔ اُن کی ذاتی اور اجتماعی زندگی ایک طرح سے بس ''کشمیری'' ہی رہی۔ اُنہوں نے بدھ مت، ہندومت، شومت، اور اسلام سے متعلق وہار، منادر، عبادت گاہیں اور خانقاہیں بھی اِسی مزاج کے مطابق

ذوق وشوق سے تعمیر کی۔ بادشاہوں اور وقت کے حکمرانوں کے محلات کی تعمیر کے مقابلے میں اُنھوں نے اپنے مذہب اور عقیدے سے متعلق تعمیرات میں اپنے فن کا اظہار زیادہ Dedication سے کیا۔ ینگ ہسبنڈ لکھتا ہے:

> The people that built the ancient temples of Kashmir must have been religious, for the remains are all of temples... and not of palaces. They must have been men of strong and simple taste averse to the paltry and the florid.

کشمیریوں نے اپنے یہاں آس پاس دستیاب تعمیراتی مواد Constructional material کا صحیح، برمحل اور فنکارانہ استعمال کیا اور یہی اُن کے طرز تعمیر کا اصل جوہر رہا ہے اور خوبی بھی۔ بدھ مت کے ماننے والوں نے تپائی ہوئی اینٹوں یا Terra cotta tiles ہندومت کے پیروکاروں نے پتھروں اور مسلمانوں نے لکڑی کا استعمال اس ڈھنگ سے کیا کہ یہ یہاں کے ماحول، آب و ہوا اور زمین سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص عقیدے اور عقیدت مندوں کے جذبات کا عکاس بھی ثابت ہوئے اور ایک خاص دور کا سنگ میل بھی۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ کسی خاص جگہ کا ماحول، وہاں کے موسمی حالات، زمین کے خدوخال، ضروریات اور مقامی طور دستیاب وسائل اُس خطہ میں رہنے والوں کے مزاج، خیالات، کردار وعمل اور خواہشات اور طرزِ حیات پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اگر وہ لوگ اپنے مزاج میں بُردبار بھی ہوں، چاشنی والے بھی ہوں، اُن میں جمالیاتی حِس بھی زندہ ہو اور اِس کے ساتھ ساتھ تعمیری ذہن کے مالک بھی ہوں، تو وہ اس کا اظہار ضرور اپنے فن تعمیر، صنعت وحرفت اور دستکاریوں کے ذریعہ کرتے ہیں اور واقعتاً

کشمیریوں نے بھی ہر دور میں ایسا ہی کیا۔ اُونچے پہاڑوں کے درمیان رہتے ہوئے اُنہوں نے مندروں، مسجدوں اور خانقاہوں اور وہاروں کی اُونچائی اُن کے ہم پلہ تعمیر کرنا چاہا اور اکثر وہاں ایسی تعمیرات کھڑی کی، جہاں یہ آس پاس کی زمین پر سایہ افگن نظر آئیں۔ پہاڑوں کے دامن اس وجہ سے اُن کے پسندیدہ مقامات ٹھہرے۔ پھولوں بھری وادیوں کے وارث ان لوگوں نے پتھروں، لکڑی کے تختوں اور اینٹ نما ٹائیلوں پر پھولوں کی تصویریں کنندہ کی۔ اپنے اعتقادات سے متعلق معابد کے در و دیوار، چھت اور فرش کو اپنے فن سے نگینوں کی طرح مزین کیا۔

دنیا میں فن تعمیر کی کہانی قدیم مصر، یونان اور اس کے بعد روم سے شروع ہوئی اور اِن قدیم تہذیبوں نے اس سمت میں ایک بنیادی راہ متعین کی جس پر چل کر دیگر قوموں نے اپنے اپنے خاص اَدوار میں اپنی ضروریات، مقامی حالات، دستیاب مواد اور مذہبی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر اس میں کمی بیشی کے ساتھ آگے قدم بڑھایا۔ کشمیر اگر چہ یونانیوں کے زیر تسلط زیادہ دیر تک نہ رہا مگر اُن کے طرز تعمیر کا عکس اور shape, style and stature کا پَرتو یہاں کے قدیم منادر میں بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ بہت سے ماہر آثار قدیمہ نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ الیکزنڈر کننگھم نے تو اپنی کتاب کے بیشتر ابواب اس کی نذر کئے ہیں اور یہ اتنے قابل مطالعہ اوراق ہیں کہ والٹر لارنس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب The Valley of Kashmir میں ان کو من وعن درج کیا ہے۔ واقعتاً کشمیریوں نے اپنے فن تعمیر کو یونانیوں کی طرح اپنے مذہب اپنے ہنر اور اپنے بلند خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس میں بالکل کامیاب بھی ہوئے۔ ایک برطانوی مصنفہ مارین ڈاگٹی مارتنڈ کو دیکھ کر لکھتی ہیں:

> The impression of Greek influence left by
> this building is certainly so strong that it is

difficult to believe that Greek art is not responsible for many of the characteristics of Kashmirian architecture.

یہ بات صحیح ہے کہ کشمیریوں نے فن تعمیر کے سلسلے میں بہت کچھ اُن لوگوں سے سیکھا ہے جنہوں نے یا تو اُن پر حکومت کی یا اُن لوگوں سے جو دوسرے ملکوں سے بحیثیت صنعتی سفارت کار، ماہر گلکار، ہنر مند معمار یا ماہر تعمیرات یہاں آئے۔ اس طرح کبھی یہ یونانی طرز تعمیر سے متاثر رہے، کبھی مصری، کبھی ایرانی اور کبھی مغل طرز تعمیر کی چھاپ اُن کے یہاں نظر آئی، مگر یہ بات بھی عیاں ہے کہ اس دوران بھی کشمیریوں کی اپنی ہمالیائی شان، انفرادیت، نفاست یا صحیح معنوں میں مقامی مزاج، رنگ و آہنگ اور شناخت میں نمایاں اور غالب رہی، جس کیلئے وہ جانے جاتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں ہم اس کو Kashmirian Architecture کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ہندو دور میں کشمیریوں نے آس پاس دستیاب پتھروں کو اس ہنر مندی، ہوش مندی، نفاست اور مذہبی جوش و جذبہ سے مندروں کی تعمیر میں اس انداز سے استعمال میں لایا کہ یہ اُن کے عقیدے اور دیوتاؤں کے تئیں اطاعت کے ساتھ ساتھ فن تعمیر میں اُن کی مہارت کا نقش بر سنگ ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں Percy Brown لکھتا ہے:

"..... of all the arts practised by the people of the valley, in pre-Islamic period, the building art was one in which they were notably proficient as the remains of their large monuments in stone are a standing proof".

ڈاکٹر سٹین اس خیال کا حامی ہے کہ فن تعمیر میں جو تحریک اور اثر یہاں نظر آتا

ہے، وہ خالص مقامی نہیں، اس پر بیرونی اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ کشمیر کے قدیم فن تعمیر پر ہندوستانی اور یونانی طرز تعمیر کا پَرتو نمایاں ہے۔ اس کے باوجود وہ کشمیریوں کے اُس فن تعمیر اور اُس پر حاوی مقامی مہارت کا بھی بڑا معترف نظر آتا ہے، جس کو الیگزنڈر کننگم Arian Order کا نام دے کر لکھتا ہے:

"This name it fully merits, for it is as much a distinct order of architecture as any of the more celeberated classic orders..... the Kashmirian architecture, its lofty pediments and its elegant trefoiled arches, is fully entitled with its noble fluted pillars, its vast colonnades to be classed as a distinct style. I have therefore ventured to call it the Arian Order".

اپنے اردگرد کے پہاڑوں سے مانوس ہوتے اور ان سے اثر لیتے ہوئے کشمیریوں نے یہی شان، وسعت اور ایسی ہی اونچائی اپنے مندروں اور اعتقادات سے وابستہ دیوی دیوتاؤں میں بھی پسند کی۔ اسی شوق اور مذہبی جذبے نے اُنہیں اہرام نما حجری مندر، جن کے کلس آسمان کی طرف بلند ہونے کا اشارہ کرتے تھے اور جن کے ستون ایسے کھڑے نظر آتے ہیں، جیسے خاموش اطاعت گزار پجاریوں کی ایک سیدھی صف بستہ قطار، تعمیر کرنے کی تحریک دی۔ مٹن، بونیار، پاپچھ، اونتی پورہ، نارستھان، نارن ناگ، مامل، پانڈریتھن اور کاکا پورہ میں واقع پتھروں سے بنے ہوئے مندر، جو اگرچہ آج اپنی اصل حالت میں موجود نہیں، اس کا واضح ثبوت ہیں۔ بھاری پتھروں پر باریک کھدائی کے ذریعہ نقش کشی، نوک و پلک والی کندہ کاری،

مناسب تراش خراش اور پالشنگ کے علاوہ اُنہیں تعمیری کام میں صحیح سمت اور مقصد برابری کے ساتھ استعمال کو دیکھ کر کوئی بھی شخص اُس زمانہ کے کشمیریوں کی سنگ تراشی کے فن، ہنرمندی، چابک دستی، برداشت، جمالیاتی احساس اور ایک خاص اعتقاد کے تئیں اُن کی Dedication کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ تمام حجری تعمیرات کشمیریوں کے شاستر شلپنا یعنی Skilled Architects ہونے کے اُس لقب کی بھی تائید کرتے ہیں، جو بقول الیگزنڈر کننگم:

> A term which could only have been applied to them on account of their well-known skill in building?

اتنے بھاری پتھروں کی ڈھلائی، اُنہیں اپنے ایک خاص اعتقادی جذبے کو مدنظر رکھ کر تراشنا اور مطلوبہ صورت دینا، پھر Tongued and groved کی ترکیب استعمال میں لاتے ہوئے مکمل Bond and through کے ذریعہ محکم بنانا، مکمل پیائش کے ساتھ مطلوبہ جگہ پر ایستادہ کرتے ہوئے ان میں دیوی دیوتاؤں کی شبیہ اس طرح کندہ کرنا کہ وہ خاموش زبان میں اپنا مقصد بیان کرے، یہ سب نہ صرف حیران کن ہے بلکہ دیکھنے والوں کو بس دیکھتے ہی رہنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ یہ پتھر ہمیں وہ کچھ بتاتے ہیں، جو ہم بتا نہیں سکتے۔ یہ واقعی قدیم کشمیر کی فن تعمیر سے متعلق بھرپور معلوماتی کتابیں ہیں۔ لکھوندر سنگھ اپنی کتاب The History of Ancient Kashmir میں لکھتا ہے:

> ... In the realm of sculpture they like the Greeks, personified the natural objects and imparted to them life and vividness.... Religious

fervour of these early artists found outward expression in the building of temples.... one wonders how in those ancient days massive stones were lifted and laid in position with great precesion of the heights of the temples.

حق تو یہ ہے کہ کشمیریوں نے جس طرح پتھروں کو اولین ادوار میں بولنا سکھایا اور اُنہیں فن تعمیر کی اپنی جُدا گانہ تاریخ کی کتاب کا روپ بخشا، اُسی طرح اُنہوں نے بعد کے ادوار میں مٹی، لکڑی اور اینٹوں کو بھی زبان بخشی۔ اُن سب میں اُنہوں نے اپنی گل فروشی، گل پسندی، عقیدت، یقین اور جمالیاتی احساس کی تاریخ کندہ کی۔ اگر چہ ان تمام قدیم اور اولین حجری منادر میں یونانی اور مصری طرز تعمیر کا پرتو نظر آتا ہے مگر علاقائی رنگ و آہنگ، جس کو الیکز نڈر کننگم "Distinctive style" کا نام دیتا ہے، اِن کی نوک پلک پر شبنم کے قطروں کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے، خاص کر اُن عمودی ستونوں پر جو بھاری بھرکم سردل Lintle کو تھامے ہوئے ایک Aquduct shaped گلیاری بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ تپستیا Trefoiled کام والے منقش محراب، مرتفع پتھروں کے چبوترے Plinth، جن کو Alternate جوڑ اور grove کے ذریعہ اس انداز سے مضبوط تعمیر کیا گیا ہے کہ یہ ایک تو خاص Inscriptions کا مطلوبہ مظاہرہ بھی کرتے ہیں، دوسرے اس پر ایستادہ ستونوں کو اچھی طرح تھامتے ہوئے بھی نظر آتا ہے۔ ان ستونوں کے مابین کے مکمل اور یکساں فاصلے span کی پیمائش، اِن کی سیدھ، ان کی گیرائی اور یکساں اُونچائی اور ان کے اوپر projected محرابیں جن پر خاص تراش خراش سے اُبھاری گئی engravings، کشمیریوں کی فن تعمیر سے متعلق واقفیت، نزاکتوں اور مقصدیت کا واضح ثبوت ہیں۔ اِن تعمیرات میں جوڑا گیا ایک

بھی پتھر غیر اہم اور فالتو نظر نہیں آتا۔ الیگزنڈر کننگم تو ان کی Great width of its Intercolumniation اور pyramidal pediments جو اُنہیں ایک خاص علاقائی شان اور شناخت عطا کرتے ہیں، کا بڑا معترف نظر آتا ہے۔ ینگ ہسبنڈ لکھتا ہے:

> All over the Kashmir valley there are remains of temples remarkable for their almost Egyptian solidity, simplicity and durability... and we may take it as implying the existance of just such a people as this mountain country might be expected to produce.

اگر متذکرہ بالا حجری مندر نہ بھی بنائے گئے ہوتے، یا اگر تعمیر ہونے کے بعد ایسی تمام عمارتیں منظر سے ہٹ گئی ہوتیں اور صرف مارتنڈ مندر یا سورج مندر جس کو للتا دیتہ مکتا پیڑا (699-786 عیسوی) نے مٹن کریوا کے مشرقی کنارے پر تعمیر کیا، موجود ہوتا تو یہ واحد مندر بھی کشمیریوں کے ذوق فن تعمیر اور اس سلسلے میں اُن کی وسعت نظر، مہارت اور اعلیٰ ذوق جمال کا واضح ثبوت ہوتا۔ اس مندر میں استعمال کئے گئے پتھروں کو کھدائی اور نقش کشی اور سنگ تراشی کے ایک ایسے عمل سے گزارا گیا ہے کہ اُنہیں دیکھ کر ذہن میں سورج دیوتاؤں کا سارا عکس جاگزین ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ یہ اپنے فلسفے کی خود اپنی ایک خاموش تاریخ ہے۔ اس کا مغرب رو ہونا اور اس کا محل وقوع اس کو ایک خاص معنی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ رات کا لبادہ اوڑھنے سے پہلے ڈوبتے سورج کی آخری کرن تک اس کی طرف بس دیکھنے کا متمنی ہو۔ اس طرح یونانی اور مصری اثر سے قطع نظر اِن کو Distinctively Kashmirian فن تعمیر کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ ینگ ہسبنڈ اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

... it is at Martand that there is the finest, and as it is not only typical of Kashmir architecture at its best, but is built on the most sublime site occupied by any building in the world- finer far than the site of the Parthenon, or of the Taj, or of St. Peters, or of the Escureal- we may take it as the representative, or rather the culmination of all the rest, and by it we must judge the people of Kashmir at their best.

برطانوی مصنفہ مارین ڈاگٹی مارتنڈ مندر کے بارے میں لکھتی ہیں:

Nothing appealed or touched me save the extraordinary beauty of those grey walls rising some forty feet with sculptured surfaces and delicately ornamented pediments and pointed arches,and the grand entrance turned fittingly to the west that the setting sun might send its last rays over the temple dedicated to its worship - the Vishnu as the sun god.

اگرچہ ایسی تمام قدیم مذہبی اور نیم مذہبی حجری عمارتیں وقت کے سیلاب میں سے گزرتے ہوئے اپنی پرانی شان، چمک، ہئیت، نقوش اور یہاں تک کہ اپنی بلندی

سے محروم ہوگئی ہیں، کیونکہ وقت بذات خود ایک بڑا بے رحم وسنگ دل اور توڑ پھوڑ کا عادی سنگ تراش ہے، جو عمل فرسودگی weathering کے ہتھوڑے سے چٹانوں کو توڑتا رہتا ہے، اور اس کے علاوہ وقت کے پاس بھونچال کے جھٹکے اور موسموں کا چابک بھی ہے، جس کے ذریعہ اس نے ان عمارتوں کو کھنڈر بنا دیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ کھنڈر جن کو کشمیری ''پانڈولُر'' یعنی پانڈوؤں کے مکان کہتے ہیں، اپنے بنانے والوں کے بارے میں صاف بتاتے ہیں کہ وہ بڑے دل گردہ کے لوگ رہے ہوں گے۔ ہندو دَور سے پہلے کشمیر کے طول وعرض میں مورخین کے مطابق بودھ استھاپن، وہار یا سٹوپا اُس دور میں کثرت سے تعمیر کئے گئے جب وادی موریہ راجہ اشوک کے باعث صدیوں تک بدھ مت کے سنہری دور سے گزری۔ حقیقتاً کشمیر میں فن تعمیر کی کہانی کے اولین جملے مہاراجہ اشوک کے بنائے ہوئے ستوپوں کے ذکر سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ ستوپا شاید پکی اینٹوں clay burnt bricks سے بنائے جاتے تھے، جو ہاروَن میں ایک تو شراب کوہل کی کھدائی کے دوران محکمہ آثار قدیمہ کو اتفاقاً حاصل ہوئیں، دوسرے جو رام چندرکاک (سپرانٹیڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ 29-1919 عیسوی) کی زیرنگرانی محکمانہ کھدائی کے دوران حاصل ہوئی ہیں۔ حالانکہ وادی کے دوسرے مقامات سے بھی کھدائی کے دوران اس قسم کی اینٹیں گاہے گاہے اتفاقاً دستیاب ہوتی رہی ہیں۔ مہاراجہ اشوک نے نہ صرف سورج کا شہر ''سرینگر'' بسایا بلکہ بدھ مت سے متعلق وہ عبادت گاہیں بھی تعمیر کی جو ایک طرح سے اُس وقت تک قائم رہیں جب ہیون سانگ نے اُنہیں 631 عیسوی میں یہاں سینکڑوں کی تعداد میں قدرے اچھی حالت میں دیکھا، حالانکہ یہ وہ دور تھا جب بدھ مت وادی میں صرف اس عقیدے سے وابستہ منادر کی موجودگی تک ہی محدود ہوگیا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بدھ مت سے متعلق ان عبادت گاہوں کو شومت اور ہندومت Brahmanism کے

پیروکاروں نے کچھ بنیادی تبدیلیوں کے بعد اپنے استعمال میں لایا۔خود مہاراجہ اشوک کے بیٹے راجہ جلوک نے اس کی شروعات کی، جب اُس نے بدھ مت کو چھوڑ کر شومت اختیار کیا۔ دوسرے یہ کہ ستوپا وقت کے سیلاب میں سے گزرتے ہوئے خستہ وخراب ہوئے اور معدوم ہوئے، کیونکہ یہ ایسے مواد سے بنائے گئے تھے جو پتھروں سے بنائے گئے معابد کی نسبت زیادہ دیر تک وقت کی مار سہہ نہیں سکتے۔ بدھ مت کے پُر جوش پیرو کار مہاراجہ اشوک (304-232 B.C) جب کشمیر کا حکمران بنا اور سرینگر اُس کی راجدھانی قرار پایا تو بقول کلہن پنڈت یہ شہر چھیانوے ہزار مسکنوں پر مشتمل تھا۔ گوپادری کا مندر، یا ایک خاص قسم کا معبد، جو آج کے تخت سلیمان یا شنکر آچاریہ پہاڑی پر واقع ہے اس وقت بھی شہر کے مکینوں کا مرکز نگاہ ہی رہا ہوگا۔ گوپادری کا یہ مندر جس کا Twenty feet high three tier octaginal plinth بنیادی ڈھانچہ خالص پتھروں سے، بغیر کسی گارے کے راجہ گوپادتیہ نے 370 قبل مسیح میں تعمیر کرایا، ایک طرح سے ایک خاص عقیدے سے متعلق کشمیر کی ایک قدیم حجری عمارت خیال کی جاتی ہے۔ مگر کچھ ماہر آثار قدیمہ کشمیر میں اس کی تعمیر کو کشمیریوں اور یونانیوں کی اولین مشترکہ کامیاب کوشش بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر چہ بعد کے کئی ادوار میں یہ مندر تجدید کاری کے عمل سے بھی گزرا مگر پھر بھی بہت سے لوگ اس کو بُدھ دور کی ایک یادگار کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اگر چہ اس ہمالیائی وادی نے بدھ مت کا ایک شاندار دور دیکھا، مگر اس عقیدے سے متعلق آج کوئی قابل ذکر ستوپا یہاں موجود نہیں۔ ہاروَن میں پہاڑ کے دامن میں جو ستوپا بکھرے ہوئے مواد، جو پکی اینٹوں اور تپائی ہوئی مٹی اور کنکروں کے ڈھیلوں کی شکل میں موجود ہے اُس کے بارے میں ''کاشُر انسائیکلو پیڈیا'' جلد اول کا مقالہ نگار موتی لال ساقی لکھتا ہے ''جو آثار اس جگہ دریافت ہوئے ہیں، اُن کا تعلق صرف بدھ مت سے ہے''۔ اُن کے مطابق ایک ٹائل پر تو ستوپا کی

تصویر بھی کندہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ستوپا کس طرز کی تعمیر ہوا کرتی تھی۔ رام چند کاک اور پرسی براؤن کے مطابق ہاروَن کے آثار کشمیر میں بدھ طرز تعمیر کی سب سے پرانی یادگار ہے۔ اُن کے مطابق کُشان دور (78 عیسوی) کے یہ آثار نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دُنیا میں اپنی قسم کے واحد آثار ہیں۔

پھر جب یہ ہمالیائی وادی اپنی تاریخ کے ایک اور اہم عبوری دور Transitional period سے گزری اور اسلام کے نور سے اس کا نشیب وفراز منور ہوا، تو اِس نے یہاں کے فن تعمیر اور اس سے متعلق سرگرمیوں کا دھارا ہی بدل دیا۔ اب اس عقیدے سے متعلق عبادت گاہوں، آستانوں اور خانقاہوں کی تعمیر شروع ہوئی جن میں پتھروں کی نسبت لکڑی کا وافر استعمال کیا جانے لگا۔ دوسرے الفاظ میں اب لکڑی Key constructional material ٹھہری، اگرچہ پتھروں اور اینٹوں کا استعمال بالکل ہی متروک نہ ہوا۔ پتھروں کا استعمال ایسی تعمیرات کی بنیادوں یعنی Damp proof plinth (چبوتروں) اور چھوٹی چھوٹی پکی اینٹوں کا قدرے کم استعمال ان کے superstructure میں دھجی دیواری اور لکڑی کی کڑیوں beams کے درمیان خالی جگہوں کو پُر کرنے میں استعمال کی جانے لگیں۔ ان تین بنیادی چیزوں کے استعمال نے ان تعمیرات کا نہ صرف رنگ روپ ہی بدل دیا بلکہ یہ صحیح معنوں میں eco-friendly ماحول دوست بھی نظر آنے لگیں۔ یہ اس زمین کی وہ کھوئی ہوئی عمارتیں لگنے لگیں جن کو جیسے اب وقت نے ہی ازخود دریافت کیا ہو۔ یہ اور زیادہ اُونچی تعمیر ہونی شروع ہوئیں۔ اُن کے cone-shaped بلند کلس اب بادلوں کو چومنے لگے۔ پتھروں کی نسبت لکڑی کے کم وزن دار ہونے اور آسان استعمال کے باعث یہ ممکن ہوا۔ کایرو، بُدلو اور دیودار کی لکڑی، جس سے کشمیر کے جنگل پہلے سے مالا مال تھے، کو ان عمارتوں کی اندورنی منقش چھتوں، محراب دار کھڑکیوں،

پنجرہ کاری، اہرام نما یا cone shaped کلس، تہہ دار یا terraced چھتوں، آرائشی eaves، بالکونیوں، trefoiled داخلی دروازوں، tongued and groved تختہ بندی اور فرش، اور باہری projections میں فن کارانہ اور موقع ومحل کے مطابق استعمال نے انہیں جاذب نظر بنایا۔ سلاطین کشمیر کے دور میں ایران سے اسلامی مبلغوں اور سادات کے ہمراہ اس کام سے وابستہ جو کاری گر اور ماہر تعمیرات از خود یہاں آئے یا حکومتی کوششوں سے لائے گئے، اُن کی مہارت کشمیر میں چوبی فن تعمیر پر سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ مقامی فن اور ایرانی طرز تعمیر اور دیگر زیریں عوامل، ضرورتوں اور مذہبی جوش وجذبے کے حسین تعمیری امتزاج نے چوبی فن تعمیر کو ایک وہ پختگی، سادگی، جمالیاتی کشش عطا کی کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اُن کی مناسب تعمیری اُٹھان، حشمت وہیئت اور خاص بناوٹ آج کے اُن ماہر تعمیرات کی بھی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں، جنہیں ایک طرح سے شیشہ، سیمنٹ، لوہے اور کنکریٹ سے بنی ہوئی آج کی عمارتوں پر فخر ہے۔ سلاطین کشمیر کے دور یا صحیح معنوں میں سلطان سکندر اور زین العابدین بڈشاہ (1470-1389 عیسوی) کے کم وبیش سو سالہ دور حکومت میں جب کشمیر میں سادات کی تبلیغی اور تعلیمی سرگرمیاں عروج پر تھیں، کو ہم کشمیر کے چوبی فن تعمیر کا سنہری دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں خانقاہ معلیٰ، خانقاہ نقشبند، جامع مسجد سرینگر، مسجد مدین صاحب کے علاوہ کشمیر کے طول وعرض میں بیسیوں ایسی ہی عبادت گاہیں اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں جو آج بھی اپنی پوری آن بان اور شان کے ساتھ کھڑی ہیں۔ یہ دور اسلامی فن تعمیر، ایرانی طرز تعمیر اور کشمیریوں کے شاستر شلپنا مزاج کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔

لکڑی کا وافر استعمال اگر چہ عمارتوں کو آتش گیری کے لحاظ سے اُنہیں حساس بناتا ہے اور دوسرے یہ کہ حجری عمارتوں کے مقابلے میں یہ زیادہ دیر تک ٹکتی نہیں۔ مگر

ایک تو یہ اپنی لچک، سرد و گرم چشیدگی اور خاص بناوٹ کے باعث کشمیر کے بوقلمون موسموں کے بالکل موافق ثابت ہوئیں دوسرے یہ کہ چوبی عمارتیں یا معابد جن کے superstructrue میں کہیں کہیں چھوٹی اینٹوں کا بھی استعمال ہوتا تھا اور جو پتھروں سے بنے ہوئے مضبوط چبوتروں damp proof plinth پر کھڑی کی جاتی تھیں، قدرے ہلکی ہونے کے باعث بھونچال کے جھٹکے آسانی سے سہہ سکتی تھیں۔ مزید بر آں اُن کے cone shaped کلس spires اور کم ڈھلان والی چھتیں جو بالکل لکڑی سے بنائی جاتی تھیں، نے نہ صرف ان عمارتوں کو جاذب نظر بنایا بلکہ کشمیریوں نے اُنہیں اپنے مذہبی اعتقادات کے قریب بھی پایا۔ اُن کی خواہش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اُن کے معابد اُن کے مسکنوں پر سایہ افگن نظر آئیں۔ ایسی کم ڈھلان والی، تین طبقوں پر مشتمل چھتیں عام طور پر خاک پوش ہوا کرتی تھیں۔ ایسی چھتیں تعمیر کرنا بھی اپنے میں کشمیریوں کی فن تعمیر کی نزاکتوں اور ضرورتوں سے واقفیت کا ایک بین ثبوت ہی تھا، جس کیلئے وہ پہلے rafters کی ایک عمودی قطار کو purlins کی ایک متوازی اُفقی قطار سے ٹانک دیتے تھے اور پھر اس کو چوبی تختیوں سے پوری طرح ڈھانپ دیتے تھے، اس کے اوپر بُوج پتر درخت کی چھال کی ایک تہہ بچھائی جاتی تھی، جس کے اوپر سات انچ موٹی مٹی کی تہہ بچھائی جاتی تھی۔ بوج پتر درخت کی چھال اپنے میں ایک کارگر damp proof مواد ہونے کے باعث لکڑی کو سالہا سال تک سڑنے سے بچانے کا ایک قابل اعتماد اور قابل عمل طریقہ تھا، اور شاید اس کا اس طرح کا استعمال ایک مقامی ہُنر تھا۔ دوسو برسوں تک بوج پتر کی یہ چھال مٹی کی ایسی تہہ کے نیچے رہتے ہوئے بھی سڑتی نہ تھی۔ بوج پتر کی یہ چھال کشمیر کی ہمالیائی چراگاہوں سے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی سے لائی جاتی تھی۔ زمانہ حال تک یا صحیح معنوں میں 1965ء تک کشمیر کی بیشتر مسجدوں، خانقاہوں، زیارت گاہوں اور اُن کی باہری صحن کی محراب نما

ڈیوڑھیوں کے چھت خاک پوش ہی تھیں۔ایسی چھتیں اگر چہ موسم سرما میں برف باری اور بارشوں کی وجہ سے تر ہوکر بھاری ہو جاتی تھیں اور اُن کے دب جانے کا بھی خطرہ رہتا تھا،مگر موسم بہار میں جب ان چھتوں پر مختلف قسم کے پھول جیسے گل لالہ،سوسن، یاسمن اور سرسوں کے پھول کِھل اُٹھتے تو یہ اپنی روئیدگی سمیت آس پاس کی سرسبز و شاداب زمین کے اُبھرے ہوئے ٹکڑے لگتے تھے۔درختوں کی اُوٹ سے یہ ہوا میں ساکن پھولوں کی حسین کیاریاں جیسی لگتی تھیں۔شہری علاقوں میں اکثر مکانوں کی چھتیں بھی عام طور پر خاک پوش ہی ہوا کرتی تھیں۔اس سلسلے میں والٹر لارنس (1886عیسوی) لکھتا ہے:

In the city nearly all the houses of well-to-do people are roofed with birch bark and earth, so that looking down on Srinagar from Hari Parbat hill one sees miles of verdant roofing.... sometimes in the villages one finds the roofs of the larger houses and of the shrines (*ziyarats*) made of birch bark with a layer of earth above it.

ٹینڈل بسکو بھی لکھتا ہے:

The roofs are covered with green grass and certain of them are scarlet with poppies or tulips.

ینگ ہسبنڈ ان خوبصورت اور دریا کنارے خوش کن مناظر والی نجی اور مذہبی

عمارتوں کے بارے میں لکھتا ہے:

Handsome, picturesque buildings of small bricks and woodwork, with semicircular balconies jutting out over the river and pretty carved and lattice-work windows.

کم و بیش اُن تمام یورپی تذکرہ نگاروں جنہوں نے مور کرافٹ (1819ء) کے بعد وادی کشمیر کی سیاحت کی، اپنے سفر ناموں میں کشمیر کے قدیم طرزِ تعمیر کے ساتھ ساتھ چوبی اور خاک پوش عمارتوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ایچ۔ڈبلیو بلیو 1873ء اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ دریا کنارے کی چوبی عمارتوں کی بنیادوں میں استعمال کئے گئے پتھر فن کارانہ انداز سے تراشے گئے ہیں۔ ان خوبصورت مکانوں اور حویلیوں کی چھتیں لکڑی سے بنائی گئی ہیں، جن پر بوج پتر کے درختوں کی چھال بچھائی گئی ہے۔ ان مکانوں کی کھڑکیوں کی پنجرہ کاری Lattice work نہایت ہی خوش کن ہے۔ اسی طرح والٹر لارنس کا خاص دوست ای۔ ایف۔ نایٹ (1892ء) اپنی کتاب Where Three Empires Meet میں لکھتا ہے کہ دریا کنارے کئی کئی منزلہ عمارتیں، اپنی خاک پوش چھتوں، جن پر گلہ لالہ کھلتے ہیں، بڑی ہی حسین نظر آتی ہیں۔ ان میں منقش لکڑی کے در و بام کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہاں کی مسجدیں، مندر اور خانقاہیں بھی بڑی شاندار ہیں۔ تاریخ رشیدی کا مُصنف مرزا حیدر دوغلت جب کشمیر کا حکمران بنا (51-1540ء) تو وہ یہاں اُن تعمیرات، جو سلاطین کشمیر کے دور میں تعمیر کی گئی تھیں، کو دیکھ کر اُسی طرح حیران و ششدر رہ گیا، جس طرح اکبر بادشاہ ایک طرح سے مغل طرزِ تعمیر کو بھول کر اُس وقت دنگ رہ گیا جب اُس نے سرینگر میں یوسف شاہ چک کے محلات دیکھے۔ چنانچہ اُس کا

شاہی مورخ ابولفضل، جب کشمیر کے قدیم منادر اور خانقاہوں کو دیکھتا ہے تو ان کی تعریف وتوصیف میں ''آئینِ اکبری'' کے صفحوں کے صفحے اُسی طرح سیاہ کرتا ہے، جس طرح مرزا حید دوغلت اپنی تاریخ رشیدی کے کئی ابواب میں اس بارے میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ مرزا حیدر دوغلت کشمیر کے قدیم منادر، جن کی تعداد وہ ایک سو پچاس لکھتا ہے، کو بحیثیت مجموعی عجوبہ روزگار قرار دیتا ہے۔ اُن کے مطابق یہاں کے منادر، خانقاہیں اور لکڑی کے پل نہ صرف اپنی مثال آپ ہیں بلکہ اس طرح کی تعمیرات نہ کہیں دیکھی ہیں اور نہ ہی ایسا کچھ سنا ہے۔ ''تزکِ جہانگری'' میں بھی جہانگیر ایسے اُونچے اونچے منادر کا ذکر آتا ہے جو یہاں اسلام سے پہلے تعمیر کئے گئے تھے۔ حالانکہ سلاطین کشمیر کی تعمیر کردہ بہت سی مذہبی اور حکومتی عمارتیں یا تو وقت کے ہاتھوں یا حملہ آوروں کی زور زبردستیوں کی وجہ سے مسمار ہوکر منظر سے غائب ہوگئیں اور اس زمین کے سینے میں دفن ہوگئیں مگر تاریخ کی کتابوں میں اُن کا شاندار الفاظ میں ذکر کشمیریوں کے فن تعمیر کے تئیں خاص دلچسپی کا واضح اظہار ہے۔

سلاطین کشمیر کے بعد کے ادوار یا زیادہ صحیح معنوں میں بیرونی حکمرانوں کے طویل دور اقتدار میں بحیثیت مجموعی کشمیر کے فن تعمیر پر ایک قسم کا ملوکانہ یا حاکمانہ عنصر حاوی نظر آتا ہے۔ مغلوں نے اگر چہ کشمیر کو مغل طرز تعمیر سے متعارف کیا؟ اور اس شعبہ کو بھی بالا دستی کی نظر سے دیکھا، مگر کشمیروں نے اُن دفاعی اور حکومتی نوعیت کی تعمیرات جو مغل اور افغان دور حکومت میں تعمیر ہوئیں، میں بھی اپنے ذوق وشوق، فن کاری، نفاست ونزاکت اور پختگی کے وہ رنگ بھر دیئے کہ یہ اُن کے خاص طرز تعمیر کا حصہ بن کر اُبھرے۔ قلعہ ہاری پربت، ناگرنگر کی دیوار اور اس کے داخلی دروازے یا اس کے اندر واقع کئی مذہبی نوعیت کی حجری عمارتیں، مغل باغات کی بالا دریاں Summer houses، دریا کنارے کے گھاٹ، سرائیں، حمام، حکومتی محلات،

آرائشی دیواریں اور محراب اس کی گواہ ہیں۔ مُغل حسن فطرت کے عاشق اور تفریحی تعمیرات کے دلدادہ تھے، اور اُنہوں نے ایسی تعمیرات میں کافی دلچسپی دکھائی۔ اُن کے دور میں جو مذہبی، حکومتی اور تفریحی عمارتیں تعمیر ہوئیں ان میں لکڑی، اور پتھر کے ساتھ ساتھ اُن چھوٹی چھوٹی پکی اینٹوں کا بھی وافر مقدار میں استعمال ہوا جن کو ہم بڈشاہی یا مہاراجی اینٹ کے نام سے جانتے ہیں۔ کشمیر میں 1950ء تک بیشتر مکان ایسی ہی اینٹوں سے بنائے جاتے تھے۔ سرینگر کے پائین علاقوں اور دریا کنارے واقع وادی کی دیگر قدیم گنجان بستیوں میں ایسے پرانے مکان، جو ایسی اینٹوں سے تعمیر کئے جاتے تھے، آج بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اینٹ پتھر سے بنی ہوئی مغل دور کی ایسی بہت سی تعمیرات کے باقیات کشمیر کے طول وعرض میں آج تک موجود ہیں، جن میں چونا، سرخی اور ریت کا استعمال بحیثیت mortar بڑی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اچھہ بل باغ کا مُغل حمام، پری محل، بادشاہی باغ بجبہاڑہ کا خستہ حال داخلی دروازہ، شالیمار باغ کی شمالی دیوار، مغل روڈ کی کچھ سرائیں اس کی مثال ہیں۔ پتھروں کا استعمال اس دوران بھی مکمل طور پر متروک نہ ہوا بلکہ انہیں اور تعمیرات کے علاوہ باغوں میں تعمیر ہونے والے بالا دریوں، آرائشی چبوتروں اور ان باغوں کی حلقہ بندی کرنے والے دیواروں میں استعمال کرنے سے پہلے سنگ تراشی اور خوبصورت کندہ کاری کے عمل سے گزارا گیا۔ خود جہانگیر کی بیوی نور جہاں نے سرینگر میں ایک مسجد (1623ء) پتھروں سے تعمیر کروائی، جو اسی نسبت یعنی ''پتھر مسجد'' کے نام سے آج بھی جانی جاتی ہے۔ ان پتھروں کی تراش، اِن پر کی گئی کھدائی، ان کی مناسب اٹھان اور placement کشمیریوں کے مُغل دور میں بھی قابل ترین سنگ تراش ہونے کے اُس دعوے کی دلیل ہیں، جس کیلئے وہ قدیم زمانے سے مشہور تھے۔ اسی طرح دور سلاطین میں جب اکثر عمارتیں لکڑی سے بنائی جاتی تھیں۔ بڈشاہ نے ''بڈشاہ

ڈومٹ'' جو اصل میں ان کی ماں کا مقبرہ ہے، پکی اینٹوں سے تعمیر کروا کے اس جیسے فن تعمیر کی ایک مثال قائم کی۔ کاشُر انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار موتی لال ساقی لکھتا ہے کہ اس طرز کی کوئی دوسری عمارت ہمیں کشمیر اور کشمیر سے باہر کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ عمارت کشمیری کاری گروں کی فن تعمیر سے متعلق مہارت کی نہ صرف عکاس ہے بلکہ اُن کے اختراعی ذہن کی غماز بھی ہے۔ مُسلم حکمرانوں کے دور اقتدار اور بعد کے ادوار میں بھی اِن بڈ شاہی اینٹوں سے وادی میں نجی عمارتوں کے علاوہ سینکڑوں عبادت گاہیں اور زیارت گاہیں تعمیر ہوتی رہیں۔ ان میں سے اکثر کو اگرچہ وقت نے اب منظر سے ہٹا دیا ہے، مگر پھر بھی اس طرز کی کچھ عبادت گاہیں جو آج بھی موجود ہیں، اپنی ایک الگ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال احمد (Curator S.P.S Museum) صفا کدل سرینگر میں واقع ٹھگہ بابا زیارت گاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> The Shrine has got a wonderful chamber built of highly finished bricks called here 'Badshahi Bricks' ... I have come across several such monuments in Srinagar built of small bricks, but the brick work of this shrine is really outstanding and wonderful. The other Muslim shrines of Srinagar are the master pieces of wood carving and lattice work.

قدیم ایام میں بقول مورخ پیر غلام حسن کھویہامی، کشمیری اپنے دو منزلہ اور سہ منزلہ رہائشی مکانوں کی تعمیر میں لکڑی کا کثرت سے استعمال کرتے تھے، مگر یہ Vulnerable to fire ہونے کے باعث متروک ہوا اور ایسی عمارتوں کی تعمیر میں

پتھروں کا استعمال شروع ہوا۔مگر یہ بھاری بھرکم ہونے کے باعث Vulnerable to earthquake ثابت ہوئے۔ پھر بعد کے ادوار میں اینٹ، پتھر، لکڑی کو مناسب مقدار میں استعمال کر کے ایسے مسکن تعمیر ہوئے جو حجری اور چوبی مکانوں کے مقابلے میں ماحول موافق ثابت ہوئے۔تاریخ حسن کا مورخ مزید لکھتا ہے کہ ''کشمیر کے شہری علاقوں میں چوبی چھتوں کا رواج تھا، جس کو مٹی اور بھوج پتر سے ڈھک دیا جاتا تھا۔ جب کہ دیہی علاقوں میں لوگ دومنزلہ اور سہ منزلہ مکان کچی اینٹوں سے بناتے تھے، جن کی چھتیں اکثر گھاس پھوس کی ہوتی تھیں۔''

بودھ دور کے طرز تعمیر پر کشمیریوں کی سادگی کا عنصر غالب نظر آتا ہے، اوراسی طرح ہندو دور میں تعمیر کئے گئے منادر اُن کی عبودیت اور دیوی دیوتاؤں کے تئیں اُن کی reverence کی عکاس ہیں۔کشمیر کے اسلامی طرز تعمیر پر معلمانہ اورصوفیانہ پرتَو حاوی نظر آتا ہے۔اس کے بعد کے ادوار کی زیادہ تر تعمیرات میں تحکمانہ، حاکمانہ اور ملوکانہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ان میں سے بعض Merry-making کی پیداوار ہیں۔کشمیر کا فن تعمیر تین بڑی تبدیلیوں کے ادوار سے گزرنے کے باوجود بودھ ستوپا، ہندو منادر اور مسلم خانقاہیں نہ صرف ایک دوسرے میں حروف کشمیر کی طرح پیوست نظر آتے ہیں بلکہ ان سب میں کشمیریوں کا مزاج، ان کی شناخت، ان کا ذوقِ جمال، عقیدہ، حوصلہ، تدبر اور گوناگونیت اُسی طرح رچی بسی نظر آتی ہے، جس طرح پھول میں خوشبو۔

●●●

☆......پروفیسر کرشن لال کلا
مترجم: گلزار جعفر

کشمیر کی شاندار ثقافت

وادیٔ کشمیر اپنے لامثال حسن کی بدولت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کے جھیل، دریا، سرسبز میدان، وادیاں اور برف سے ڈھکے ہوئے کوہِ ہمالیہ کے ساتھ لگی ہوئی کئی چھوٹی پہاڑیاں اور دیگر فطری خوبصورتی سے مالا مال مناظر اسے جنت بے نظیر بنا دیتے ہیں۔ یہ خطہ ٔالارض جیسے کسی شاعر کا خوبصورت خیال یا کوئی خواب زار معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کا آب و ہوا بہت ہی دلنشین ہے۔ یہاں کا ہر موسم خصوصی خوبیوں کا حامل ہے۔ اسکے علاوہ کشمیر کے لوگ یہاں کے آب و ہوا کی طرح حسین اور نزاکتوں کے حامل ہیں۔ اگرچہ بیرونی اثرات اس خطہ ٔالارضی میں ہمیشہ وارد ہوتے رہے ہیں جس نے یہاں کی ثقافت، تمدن اور اقتصادی شعبوں میں ایک رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ خصوصاً سلک روٹ یعنی شاہ راہِ ابریشم کشمیر کو وسطی ایشیا کے ساتھ جوڑ کر اسے ایک وسیع تر تمدنی اور ثقافتی آماجگاہ بنانے میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

ایام رفتہ میں وادی دو اہم مذاہب بدھ مت اور ہندومت کا مرکز تصور کی جاتی تھی اور وسط ایشیا میں بدھ مت کشمیر سے ہو کر پہنچا ہے۔ ایک طویل عرصے تک دونوں مذاہب ایک ساتھ یہاں عروج پاتے گئے اور دونوں عقیدوں کے ملاپ سے ایک مشترکہ اور بامعنی مذہبی تمدن وجود میں آیا۔ بعد میں صوفیائے کرام کی آمد اور تعلیمات سے اس وادی میں اسلام متعارف ہوا۔

کشمیر کی قدیم تاریخ کو جاننے اور سمجھنے کیلئے دو اہم ذرائع ہیں ایک پنڈت کلہن

کی لکھی ہوئی ''راج ترنگنی'' اور دوسری ''نیل مت پوران''۔ دونوں دستاویز یہاں کے تمدّن، لوگوں کے رہن سہن، فن وموسیقی، فلسفہ، علم، زبان، کھیل کود، تہواروں وغیرہ کے بارے میں بنیادی جانکاری فراہم کرتے ہیں۔

تاریخ کے ہر دور میں کشمیری لوگ ثقافت ساز اور تمدّن نواز رہے ہیں۔ تمدّنی کاموں میں خصوصی دلچسپی دکھانا کشمیریوں کی اعلیٰ جمالیاتی شعور کو درشاتا ہے۔قدیم دور میں بہت سارے ایسے عالم اور فاضل کشمیر میں پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے تمدّنی علوم میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں سرجارج ابراھم گریرسن اپنی کتاب ''Linguistic Survey of India'' کے جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ:

''کشمیر کی دو ہزار سالہ تاریخ سنسکرتی علوم، شاعری، مصوری، فلسفہ کے حوالے سے شاندار رہی ہے۔صدیوں کشمیریوں کو اپنے تمدنی شاہکاروں اورادبی فن پاروں پر فخر حاصل رہا ہے۔کشمیری شیوزم کو اپنے بہترین مبلغ اور داعی وتستا کے کناروں سے یعنی وادیٔ کشمیر کی سرزمین پہ ملے ہیں سنسکرت جیسی تہذیب گیر زبان کے عالمی سطح کے عالم اسی خطہ ارضی کے سپوت رہے ہیں۔''

مورخ کلہن نے بھی اپنی راج ترنگنی میں جگہ جگہ کشمیریوں کی علم دوستی اور ادب نوازی کا فخریہ انداز میں تذکرہ کیا ہے کشمیر کو جن پانچ خوبیوں کے لئے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے ان میں یہاں کے لوگوں کی علم دوستی قابل ذکر ہے۔مشہور چینی سیاح اورسفرنامہ نویس ہیون سانگ، جس نے 631 میں کشمیر کا سفر کیا تھا لکھتے ہیں:

''کشمیری لوگ علم کے دلدادہ اورمہذب ہیں۔صدیوں سے علم کی توقیر اورعالموں کی تعظیم یہاں کا شیوہ رہا ہے"۔

عربی زبان کے نامور محقق اور اسکالر البرونی جو محمود غزنوی کے ہمراہ

گیارہویں صدی میں یہاں آئے تھے لکھتے ہیں:

''کشمیر ہندو علوم کی ایک اعلیٰ درسگاہ ہے۔''

کشمیر میں سنسکرت زبان اپنی تمام تر علمی اور تخلیقی آب وتاب کے ساتھ اپنے عروج پر پہنچی ہے۔ یہاں کے ماہرینِ لسانیات نے ایک الگ رسم الخط ''شاردا'' وضع کیا تھا جو دیوناگری رسم الخط سے بالکل مختلف ہے کشمیر میں کاغذ متعارف ہونے سے قبل چند خاص درختوں کی چھالوں کو بطور کاغذ استعمال میں لایا جاتا تھا۔ کتب نویسی کے ساتھ ساتھ سرکاری خط وکتابت کے لئے بھی یہی کاغذ رائج العمل تھا۔ سنسکرت زبان مسلم دور حکومت کے اولین سالوں تک کشمیر میں رائج اور اثر پزیر رہی تا آنکہ فارسی زبان رابطے کی زبان بن کر یہاں مستحکم ہونے لگی۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہندوستان بھر سے طالبانِ علم دشوار گزار راستوں سے ہوکر کشمیر کا رخ کرتے تھے۔ انہیں یہاں قائم بڑے جامعہ طرز کے تعلیمی اداروں سے اسناد اور اعزازات ملتے تھے۔ ان مشہور سنسکرت اداروں میں شاردا پیٹھ (جواب پاکستان میں واقع ہے) اور وجیشوارا (بجبہاڑہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پنڈت کلہن رقمطراز ہیں کہ:

''یہاں کے راج گھرانوں نے عالموں، فاضلوں اور طلبا کے لئے جگہ جگہ ہوسٹل اور وہار تعمیر کر رکھے تھے۔ یہ وہار مختلف اطراف سے آئے ہوئے علمی شخصیتوں کے درمیان آپسی ملاپ کے مراکز بن کر اُن کی علمی صلاحیتوں کو دوبالا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔''

مہارانی امرت پربھا نے امرت بھون نامی ایک شاندار وہار بیرونِ ملک سے آئے ہوئے طلباء کی سہولیت کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ راجا سسکرہ نے آریا دیش سے آنے والے طلباء کے لئے ایک ''وشال مٹھ'' تعمیر کروایا تھا۔ اسی طرح رانی دیدہ

نے مدھیا دیش کے لوگوں کے لئے ایک کون وینٹ (Convent) طرز کا اسکول بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے میدانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے لئے ایک بڑا وہار اور کنو ینٹ انداز کا رہائشی اسکول تعمیر کروایا تھا۔ پنڈت کلھن کے مطابق:

''نجومی حکیم، وزیر، آفیسر، استاد، سفیر، کلرک، منصف غرض زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ علمی دلچسپی رکھتے تھے۔''

عالموں کو سماج سے لے کر دربار کی سبھاؤں تک خاص اعزاز حاصل تھا۔

سنسکرت زبان وادی میں ہند آریاؤں نے متعارف کرائی تھی اور رفتہ رفتہ یہ یہاں کی مذہبی اور ادبی زبان بن کر ابھری۔ یہ بات یہاں پر قابل ذکر ہے کہ اشوک کے دور میں وادی میں بدھ مت کا بول بالا ہونے لگا، لیکن یہاں بدھ مت کی تعلیمات کو بھی سنسکرت میں قلم بند کیا جاتا تھا جب کہ ہندوستان کے باقی خطوں میں بودھ مذہب کی زبان پالی تھی۔ اس کے علاوہ وسطی ایشیاء میں واقع کچھ شہر (The City of Kucha)، جو کشمیری مشینریز کا ایک اہم مرکز تھا، کو سنسکرت کے فروغ میں بھی خاص حیثیت حاصل تھی۔ وسطی ایشاء کے قرب وجوار سے بہت سارے سنسکرت کے مسودے دریافت ہوئے ہیں۔ سنسکرت میں لکھے گئے بودھ مسودے، جو ہندوستان سے دریافت ہوئے ہیں اور جنہیں گلگت کولیکشن (Collection) نام سے ریاست جموں وکشمیر کے ریسرچ ڈپارمنٹ نے انگریزی میں ترجمہ کر کے چھپوایا تھا۔ وسطی ایشاء اور چین سے بہت سارے طلباء اور زائرین کشمیر میں سنسکرت پڑھنے اور سیکھنے کے لئے آئے تھے۔ ڈاکٹر جی۔ بہلر، جو 1875 میں کشمیر میں ایسے تاریخی مسودوں کی تلاش میں آیا تھا، نے لکھا ہے کہ مندروں اور وہاروں کے ساتھ ساتھ یہاں کے اکثر پنڈت سرکاری آفیسر اور کاروباری لوگ ایسے مسودوں کو اپنے پاس سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔

کشمیر کو جنت ارضی یا جنت بے نظیر ہونے کا درجہ حاصل ہونے کے ساتھ

ساتھ ایک عظیم علمی دانش گاہ (شاردا پیٹھ) ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ پروفیسر دھرمیندر ناتھ پال 1904 کا ماننا ہے کہ کشمیر اور تبت انسانی نسل کا گہوارہ ہے۔ تقابلی فلسفہ کے ماہر ایڈ یلنگ کا بھی یہی ماننا ہے کہ وادئ کشمیر نے انسانی نسل کو اپنے اوائل میں اپنی گودی میں پالا پوسا ہے۔ کشمیر کے قدیم تعلیمی اداروں میں شاردا اور بجبہاڑہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو نالندہ، ٹیکسلا اور اجنتا کو حاصل ہے۔ کشمیر کی کئی تاریخی کتابوں میں ہمیں ودیا مٹھ، ودیا رتنم مٹھ، شیوا مٹھ جیسے بڑے تعلیمی اداروں کا ذکر ملتا ہے۔ کلہن کے مطابق راجہ پرورسین کے ماموں جیندر کا بنوایا بودھ مٹھ اس حوالے سے مشہور ہے کہ یہاں پر چینی سیاح اور تاریخ نویس ہیون سانگ نے تعلیم حاصل کی ہے۔ مورخوں کے مطابق یہ مٹھ موجودہ جامع مسجد کے قریب واقع تھا۔

بودھ مت کی تعلیمات کو عام کرنے میں کشمیر کا رول تاریخی اعتبار سے اولین حیثیت رکھتا ہے۔ اشوک نے مشہور بدھ عالم مدھیانتِکا کو کشمیر میں نئے مذہب کی اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ اُس نے یہاں پر 12 وہار تعمیر کرائے۔ ہیون سانگ کے مطابق اشوک کے دور حکومت میں 500 بودھ راہب کشمیر میں بودھ مت کی تبلیغ کے لئے وارد ہوئے تھے۔ بودھ مت کی چوتھی تاریخی کونسل ''کنڈل ون'' کشمیر میں ہی منعقد کی گئی تھی۔ یہ کونسل راجہ کنشک کے دور حکومت (78-102AD) میں انعقاد میں لائی گئی تھی۔ معروف بودھ عالم اشوا گوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں راجہ کنشک نے ہی پاٹلی پترا سے کشمیر چوتھی بودھ کونسل کی صدارت کرنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ مشہور بدھ مت کا اصول ''Greater Vehicle of the Law'' کا مسودہ کشمیر میں ہی مرتب کیا گیا تھا۔ مشہور بودھ متن ''ملندا پنہا'' کشمیری عالم ناگ سین نے تصنیف کیا تھا۔ کئی سارے بودھ عالموں نے سنسکرت اور پراکرت میں کتابیں تصنیف کی بلکہ کئی کتابوں کا چینی زبان میں بھی ترجمہ کیا۔ کشمیر کے منظر نامے پر نمائندہ

بودھ عالموں اور مبلغوں میں درمایا شاہ، گنا ورمن، درمارکا شاہ، ساگا بٹاہ، گوتما سنگ دیوا، جنامترا، داناشیلا اور آنندوردھن صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ چین سے کشمیر تشریف لانے والے عالموں میں چی یان، چی مونگ، فاہیان، ہیون سانگ شامل ہیں۔

کشمیری عالموں اور مفکروں نے مجموعی طور پر جو ہندوستانی ادب میں اضافہ کیا ہے وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کشمیری نژاد مفکروں میں رودرٹھ (جس نے اعداد کا نظریہ پیش کیا تھا)، آنندوردھن (جس نے نظریہ دونی یعنی اشارات کا فلسفہ پیش کیا تھا) شامل ہے۔ اُن کے علاوہ مم مٹھ، ابھنو گپت، مہیما بٹاہ، قیا تاہ اورُیا کاہ وغیرہ مشہور زمانہ مفکرین اور نظریہ ساز گزرے ہیں۔ خطابت کے حوالے سے بلہن، کلہن، جون راج، شریور، پراجہ بٹ اور سکھا بہت ہی مشہور ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر کالی داس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً کشمیری تھے۔ اسی طرح پتنجلی اور پنگالا بھی کشمیر الاصل تھے۔ چرکھا سمی ہتا کے مصنف چرکھا اور شاعر پروسین، عظیم قلم کار کاشندر، رتنا کر، شِوسومین، ابھیںند ھا، منکا اور سوم دیوا وغیرہ کشمیری النسل تھے۔ اسی طرح کشپ منی نے زراعت اور لیلاوتی نے ریاضیات کے بارے میں اپنی نوعیت کی اعلیٰ پایہ کی کتابیں تصنیف کیں۔ شویزم کے ''پرتھیا بجیاں نظام'' کے فروغ میں کشمیریوں کا ایک کلیدی رول رہا ہے۔ یہ نظام فکر سوماننده اتھپلا دیوا اور ابھی نندا گپتا جیسے عالموں کی تحریرات سے وجود میں آیا ہے۔ بارویں صدی کے مشہور مورخ اور شاعر پنڈت کلہن کی کتاب ''راج ترنگنی'' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''راج ترنگنی'' میں پنڈت کلہن نے ایک مشہور ومعروف شخصیت چمپک کا ذکر بڑے فخر اور اعزاز سے کیا ہے۔ جو راجہ ہرش کے دورِ حکومت میں سرحدی افواج کا کمانڈر تھا اور غالباً پنڈت کلہن، کمانڈر چمپک کی اولاد ہیں۔ راج ترنگنی اپنے متن اور اسلوب کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم کتاب مانی جاتی ہے اگرچہ نیلمت پران میں وادیٔ کشمیر

کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ خطہ ''ستی سر'' کے پانیوں کے نکاس کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔لیکن کلہن پنڈت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تب سے لے کر اپنے وقت کے سبھی حالات وواقعات کو پوری تاریخیت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔''راج ترنگنی'' کشمیر کے بارے میں معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ پنڈت کلہن کی اعلیٰ فنِ شاعری، گہرے مشاہدے اور لامثال فطانت کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔پنڈت کلہن نے وکرامن کے ''قادیاوچترا''بلہن اور بانا کے'' ہرش چریتا'' اور''مہابھارت'' کو بہ نظرِ عمیق پڑھا تھا جس کے اثرات ان کی تحریروں میں نمایاں ہیں۔مسٹرایم اے سٹین نے سب سے پہلے راج ترنگنی کوانگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

اسلام کی آمد کشمیر میں تمدنی ارتقا کا ایک نیا سنگ میل ثابت ہوا۔اسلام کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی میں وارد ہوا اور یہ سرزمین صوفیا کرام کا مرکز بنی۔تصوف نے کشمیر کو نئے نظریات اور اقدار سے روشناس کرایا جو ایک ''شیوصوفی'' نظریات کی آمیزش سے ایک نیا خوبصورت مجموعہ بن کر سامنے آیا۔اس نئے نظریہ میں انسانیت اور آفاقیت کے اصولوں کی آبیاری کا درس ملتا ہے۔یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ پورے شمالی ہند میں عموماً اور کشمیر میں خصوصی طور اسلام کے پھیلاؤ نے یہاں کی پرانی قدروں اور ثقافتی نشانات کو ختم نہیں کیا بلکہ اُن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک نئے بوقلموں اور رنگارنگ تہذیب کی شیرازہ بندی کی۔ ہندو اور مسلم ثقافتوں یا جدید اور روایت کے اس حسین سنگم کو سر۔جے۔مارشل نے اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:۔

> ''شاذونادر ہی انسانی تاریخ میں ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ دومختلف ثقافتیں
> ،جومتضاد عقائد رکھتی ہوں اور پھر بھی آپس میں مل کر ایک دوسرے کو یکسر
> ختم کئے بغیر ایک مشترکہ تمدن کو جنم دیں۔ایسا منظر کشمیر میں ممکن ہوا ہے''۔

کشمیر کے عظیم بادشاہ سلطان زین العابدین عرف ''بڈشاہ'' کا دوراس نئے

تہذیب کے عروج کا سنہری دور تسلیم کیا جاتا ہے۔اس دور میں ''کتھا سرت ساگر'' اور ''بھرت کتھا'' سمیت کئی سنسکرت مسودے فارسی میں ترجمہ ہوئے۔ بڈشاہ کے درباری مورخ جون راج لکھتے ہیں کہ

> ''بڈشاہ کشمیر کے پرانے مہارشیوں کی لکھی کتابوں جیسے ''پنچسوتی'' وغیرہ کو بڑے عقیدے کے ساتھ پڑھتے اور سنتے تھے۔ وہ مساجد اور زیارت گاہوں کے ساتھ ساتھ یہاں واقع تیرتھ استھانوں کا از خود دورہ کرتے تھے اور اُن کی حفاظت اور رکھ رکھاؤ کا پورا انتظام کیا کرتے تھے۔''

مورخ محمد اعظم دیدہ مری نے مکمل تفصیل کے ساتھ مسلم دور کے ان صوفیوں، سنتوں اور مفکروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے یہاں کی مذہبی یگانگت اور اتحاد اور فرقہ وارانہ بھائی چارہ کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔شہرہ آفاق شاعرہ لل دید اور سہزانند جی یعنی شیخ العالم شیخ نورالدین ولی اس سنہری روایت کو مزید بام عروج عطا کرنے کے دو درخشاں ستون ہیں۔ رُپا بھوانی، راج کاک، ارنہ مال، بھوانی داس کاچرو، ماسٹر زندہ کول، رسول میر، محمود گامی، ہرگوپال کول، مہجور وغیرہ شخصیات نے اپنی تحریروں میں اس شاندار تہذیب کی مزید آبیاری کی۔

سر ولیم جونس مغرب میں سنسکرت تعلیمات کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔ 1784 میں بنگال میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کرنے کا سہرا بھی اُن ہی کے سر ہے۔ 1789 میں انہوں نے کالیداس کے مشہور ڈرامہ شکنتلا کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور بعد میں ''Code of Manu'' (ضابطہ حیات) کا ترجمہ بھی انجام دیا۔ کشمیر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور حکومت میں قائم ہوا تھا۔اس کا مقصد اس خطے کی تاریخ، تمدن، ادب، علوم اور دیگر شعبہ جات میں تحقیق انجام دینا تھا۔اس ادارے کے ذریعے یہاں کے تاریخی مسودوں کا ایک مجموعہ تیار کیا گیا تھا۔رفتہ رفتہ یہ

ایک پروقار تحقیقی مرکز بن کر ابھرا اور مشہور عالم سر گریرسن اور ڈاکٹر سٹائن جیسے حضرات بھی اس مرکز کے ساتھ وابستہ رہے۔ 1942 میں یہ مرکز باضابطہ طور ریسرچ ڈپارٹمنٹ میں ضم کیا گیا تھا۔اس ڈپارٹمنٹ کے ذریعے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وقت کئی سارے سنسکرت، عربی اور فارسی کتب کا ترجمہ کرایا گیا۔ڈاکٹر سٹائن ''لداخ گمپا'' کے کتب خانے میں موجود تاریخی مسودوں کا تبتی اور سنسکرت زبانوں میں فہرست سازی کا عمل شروع کیا۔اسی طرح ڈاکٹر گریسن نے ایسی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی جن کا اُن کے مطابق ترجمہ کرانا لازمی تھا۔1875 میں ڈاکٹر جی بہلر کو حکومت ہند کی طرف سے کشمیر اور وسط ایشیا اور راجپوتانہ میں پرانے مسودے جمع کرانے پر تعینات کیا گیا تھا۔کشمیر سے انہیں ''شوشاستر'' نامی ایک مسودہ دریافت ہوا جس کو اُنہوں نے دو زمروں میں تقسیم کیا۔ایک واسو گپتا کا لکھا ہوا ''سپنداشاسترا'' اور دوسرا ''سومدم دیوا'' اور ''اتپالا دیوا کا پرتیابجناشاسترا'' قابل ذکر ہیں۔بعد میں ڈائریکٹر جے۔سی۔چٹرجی نے اُس پر تفصیلی کام انجام دیا۔1902 سے قریباً اس کی 80 جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔جن میں واسو گپتا کا تحریر کردہ ''شوسوترا و مارشنی (جس پر کھیم اج نے تبصرہ تحریر کیا تھا) ''انو یرا پریاس چتانبدھدا'' نامی قدیم ہندو قانون جے۔سی۔چٹرجی ہسٹری، ڈاکٹرین آف ادویتا شوسکول، سٹائن کا ترجمہ لل واکھ، نلی نکشا کا مرتب کردہ گلگت مسودہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آخر پر یہ بات نہایت دلچسپی کی حامل ہے کہ ان ہی ادب پاروں کی وجہ سے ملک اور بیرون ملک کے مورخین اور عالم جیسے ایل۔ڈی۔بارنٹ، پی ٹی شرنواسا آینگر، کے سی پانڈے،کورٹ۔ایف لیڈیکر، امل بیئر اور جان ڈُلی کے ساتھ ساتھ یہاں کے مقامی محققین جیسے رام چندر کاک مدھوشودھان کول اور ہربٹ شاستری وغیرہ کشمیر کی ثقافتی تاریخ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ●●●

اختر محی الدین
کشمیری سے ترجمہ: حسن انظر

سفر نامۂ اُزبکستان

''مجھے 1968ء میں سویت روس جانے کا موقع ملا۔ یہ اتفاق تھا کہ معاہدۂ ہندوروس کلچر ڈیلی گیشن ایکس چینج کے تحت مجھے مرکزی وزارتِ تعلیم کی طرف سے یہ دعوت دی گئی۔ اس سفر کے دوران میرے ساتھی آسام کے مشہور ادیب اور میرے دیرینہ دوست بریندر بھٹا چاریہ رہے۔ میں روس میں چونتیس یوم ٹھہرا رہا۔ ان ایام میں جو کچھ بھی دیکھا اور محسوس کیا وہ سب میں نے ''سلاوآمر'' عنوان کے تحت سفر نامے میں تحریر کیا ہے۔ میں نے وہاں کئی شہر دیکھے تھے اور بہت سے لوگوں کے ساتھ ملاقاتیں کی تھیں۔ اب اس بارے میں ''ازبکستان'' کے متعلق آنکھوں دیکھے حالات بیان کروں گا۔'' (اختر محی الدین)

ہم نے گاؤں دیکھے:

دوشنبہ سے تاشقند تک ہوائی سفر کوئی خاص قابلِ تذکرہ نہ رہا۔ پامیر پہاڑ کے اوپر سے اُڑتے ہوئے جہاز نے زبردست جھٹکے کھائے۔ سواریوں پر وحشت سی طاری ہوگئی۔ ایک گھنٹہ چالیس منٹ کا یہ سفر ہمارے لئے بے حد خوفناک تھا۔ لیکن اس ہوائی سفر کا یہ فائدہ تو ہوا کہ اس کے بغیر ہمارے لئے سویت یونین کے تمام دیہات کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ جہاز میں بیٹھے بیٹھے ہم ان دیہات کو بغور دیکھتے رہے۔ میں نے ماسکو سے دُوشنبہ تک اور دُوشنبہ سے تاشقند تک کے سفر کے دوران جتنے بھی گاؤں دیہات دیکھے وہ سب کے سب سجے سجائے سے نظر آئے۔ دیہات کے بیچوں بیچ کشادہ سڑکیں نظر آئیں، تمام مکانات تک سڑکیں بنائی گئیں تھیں اور مکانات بے ڈھنگے انداز

میں نہیں بلکہ ایک منصوبے کے تحت تعمیر کئے ہوئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ کھیت اور کیاریاں چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں کے جال میں جکڑی ہوئی نہیں ہیں بلکہ کُشادہ اور پھیلے ہوئے قطعہ ہائے اراضی ایسے نظر آئے کہ دل باغ باغ ہو جاتا۔ ان کشادہ کھیتوں میں فصل ملے یا نہ ملے لیکن قحط اور فاقہ کشی نہیں مل سکتی۔ ان سے تو صرف اور صرف خوشحالی کی توقع ہی کی جاسکتی ہے۔

تاشقند ہوائی اڈے پر ہمارے لئے رائٹرس یونین کا ایک نوجوان نمائندہ انتظار کررہا تھا۔ اُن کا نام رُستم تھا۔ وہ ہمیں سیدھے شہر کے خاص اور بڑے ہوٹل ''تاشقیند'' لے چلا۔

جنم دن:

اُس دن تاریخ ۱۳، اپریل کی تھی۔ میرا یومِ پیدائش بھی اتفاقاً ۱۳ اپریل ہی ہے۔ خیر اُس وقت تو مجھے اپنے یوم پیدائش کی طرف دھیان ہی نہ تھا۔ جوں ہی میں شہر میں داخل ہونے کے لئے فارم پُر کرنے لگا تو میں نے ۱۳، اپریل ۱۹۲۸ء درج کیا۔ وہاں پر تعینات لِیو چنکوف کو لگا کہ شاید میں نے تاریخ پیدائش لکھنے میں سہو کیا۔ جب انہوں نے اس بارے میں مجھ سے دریافت کیا تو میں نے واضح کیا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے بلکہ یہی میرا جنم دن ہے۔

لِیو چنکوف نے یہ بات دوسرے ملازموں کو بھی کہہ دی۔ سب کو پتہ چل گیا کہ میں ایک ادیب ہوں اور یہ کہ آج میرا یوم پیدائش ہے مزید برآں کہ یہ میرا چالیسواں یوم پیدائش ہے۔ سب لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر میرے اِرد گرد جمع ہو گئے۔ مرد و زن سب ناچنے لگے۔ وہ سب میرا چالیسواں جنم دن کچھ اس طرح سے منانے لگے جیسے وہ میرے سگے بہن بھائی ہوں۔ میں نے کبھی ایسی شادمانی کے ساتھ اپنا یوم پیدائش نہیں منایا تھا۔ میری آنکھوں سے شاید آنسو بھی چھلک پڑے لیکن شعوری طور روک لیا۔ میں ان سب کے ساتھ باری باری بغلگیر بھی ہو جاتا لیکن لاج نے روکے رکھا۔

میں چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ گھل مل کر نا چنے بھی لگ جاؤں، اس لئے نہیں کہ یہ میرا جنم دن تھا بلکہ اس لئے کہ میں انسانوں کو دیکھ رہا تھا، ایسے انسان، جو انسانوں کے ساتھ سچّی ہمدردی بھی رکھتے ہیں۔ میں خود کو بے حد خوش قسمت محسوس کرنے لگا کیونکہ میں اپنا چالیسواں جنم دن، اپنی زندگی کا ایک اہم ترین دن، سچّے انسانوں کے درمیان رہ کر منا رہا تھا، ایسے انسانوں کے درمیان جنہوں نے مجھے ایک ذرا بھی پرایا نہیں گردانا۔

چاول کے آٹے کی روٹی:

لیو چنکوف آج ریستوران میں کوئی خاص آرڈر دینا چاہتے تھے۔ بھٹا چاریہ بھی بہت جذباتی دکھائی دیتے تھے۔ ان کو میرا چالیسواں یوم پیدائش بہت ہی خاص لگ رہا تھا جبکہ میں اندر ہی اندر اندیشہ ہائے دُوردراز میں گھرا پڑا تھا۔ میری خواہش کے مطابق پہلے تو پین کیک (Pan Cake) منگوائے گئے جن پر لگائے جانے کے لئے جام بھی ساتھ ہی تھا۔ اس وجہ سے بہت ہی پسند آ گئے۔ ہم نے دوبارہ ان کی فرمائش کی۔ لیو چنکوف نے ویٹرس سے کہہ دیا کہ مہمان کو (یعنی مجھے) یہ پین کیک بہت پسند آ گئے۔ وہ جھٹ سے اٹھیں اور تاثرات کے لئے مخصوص رجسٹر لے کر آ گئیں۔ مجھ سے بولیں کہ اگر میں چاہوں تو کیکس کے متعلق اپنی رائے اس رجسٹر میں لکھ سکتا ہوں۔ لیو چیکوف نے مذاق کے انداز میں کہہ دیا:

> ''ممکن ہے کہ ان بے چاروں کے متعلق سب لوگ ناموافق تاثرات ہی لکھا کرتے ہوں اور آج شاید پہلی بار کوئی تعریفی کلمات لکھنے جا رہا ہے۔ لہٰذا دل کھول کر تعریفیں لکھ دیجئے''۔

میں نے پہلے اپنی مادری زبان کشمیری میں تاثرات درج کر دیئے پھر اُن کا انگریزی میں ترجمہ بھی خود کر دیا۔ لیو چیکوف نے میرے لکھے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر

کہا: ''ممکن ہے کہ اب ان تعریفی کلمات کے باعث ہمیں بہتر سروس مل جائے''۔ خیر ،کھاپی کر ہم لوگ گھومنے کے لئے نکلے اور اُزبکستان میں اقتصادی ترقی سے متعلق نمائش دیکھنے چلے گئے۔

<u>بابراور زیب النساء:</u>

اُزبکستان وسط ایشیائی مما لک میں سے ایک ہے اور سویت یونین کی ایک اکائی جس کی تہذیب اور تمدّن بہت قدیم ہیں۔ وہاں کی تہذیب کے نمونے ہزاروں سال پہلے کی داستانیں سُنا رہے ہیں لیکن جنگوں اور بیرونی حملوں نے رہ رہ کر تباہی مچائی ہے اور لوگوں کی محنت سے بنائی ہوئی چیزوں کو برباد کرر ہا ہے۔ ازبکستان میں اونچے درجے کے شعرا، ماہرینِ علمِ نجوم، ریاضی دان اور فلسفی اُٹھے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی میں وہاں پیدا ہونے والے ریاضی دان اور نجومی احمد الفرغانی آج بھی مغربی مما لک میں ''الفراغانس'' کے نام سے بہت مشہور ہیں، محمد بنِ موسیٰ الخوارزِمیؔ ، ابو لریحان البیرونی، ابوعلی ابن سیناؔ، اُلغ بیگ اور نظام الدین شیروانی، جن کے نام کشمیر میں بھی مانوس رہے ہیں، اُسی سرزمین سے اُٹھے تھے۔ وہاں کے لوگ بابر اور زیب النساء (بنتِ شہنشاہِ ہند اورنگ زیب) کے ناموس سے بھی واقف ہیں کیونکہ ان دونوں نے اُزبک زبان میں شعرگوئی کی تھی۔ زیبُ النساء کو کچھ زیادہ ہی قدر و منزلت حاصل ہے کیونکہ اُنہوں نے خواتین کی آزادی کو لے کر اچھے اشعار کہے ہیں۔

اس ملک میں سمرقند اور بخارا نام کے وہ دو مشہور شہر بھی واقع ہیں جو عالمِ اسلام کی مختلف مذہبی اور تہذیبی تحریکوں کے مراکز رہے ہیں۔ یہ ملک ماضی میں پارہ پارہ ہوکر رہا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس تک اس ملک کے لوگ بے حد مفلوک الحال اور پسماندہ ہو چکے تھے۔ وہ جو تھوڑا سا زرخیز حصہ بچا ہوا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ ریتیلا ہوا جارہا تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے باعث وہاں جاگیردارانہ نظام ختم کیا گیا۔اب وہاں سوشلسٹ نظام رائج ہوگیا تھا۔تب سے اس ملک میں کس طرح کی اور کس قدر ترقی ہوتی رہی وہ بیان سے بھی باہر ہے۔بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اب یہ ریپلک بھی اُسی طرح ترقی یافتہ ہے جس طرح کہ یورپ کا کوئی بھی دوسرا ملک ہے۔

اُزبکستان میں اقتصادی ترقی کی نمائش واقعی وہاں کی مجموعی ترقی کا آئینہ تھا۔مجھ سا ایک عام آدمی تو خیر اُن مشینوں، کارخانوں اور اُس پیداواریت کے متعلق کماحقہٗ تفصیلات دے بھی نہیں سکتا، ہاں میں صرف اُس قدر تسلی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب وہاں کے رہنے والے لوگ اقتصادی اعتبار سے واقعی خوش حال ہیں۔

چیمسٹری:

نمائش کے سلسلے میں ہمارے لئے ایک دوشیزہ کوئی تیس کی عمر والی، بطورِ گائیڈ موجود تھیں۔ وہ کسی قدر انگریزی بھی بول سکتی تھیں۔ وہ نمائش کا ایک ایک حصّہ دکھائے جا رہی تھیں اور خوش ہو ہو کر کہتی کہ:

> ''ہمارا ملک پہلے بہت غریب تھا۔ہمارا گزارہ صرف ایک زراعت پر ہی تھا سو انقلاب کے بعد ہم نے پہلے اسی زراعت پر توجہ مرکوز کی۔ زرعی پیداوار بڑھ گئی۔ ہمارے یہاں روئی بہت پیدا ہوتی ہے۔ پہلے ہم اس روئی کو ماسکو بھیجا کرتے تھے جہاں اس سے کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔پھر ہم نے سوچا کہ ہم اسے ماسکو کیوں بھیجتے رہیں خود ہی کپڑا تیار کیوں نہ کریں۔پس ہم نے مشینیں لائیں، کارخانے لگائے اور خود ہی کپڑا تیار کرنا شروع کردیا۔ بعد میں تو ہم نے باہر سے مشینیں منگوانا بھی ترک کردیا اور اب ہم ازبکستان کے اندر ہی یہ مشینیں بناتے ہیں۔اب ہمارے یہاں فولاد کا ایک کارخانہ بھی ہے''۔

وہ یہ سب کچھ ایسے جوش جذبے کے ساتھ کہے جا رہے تھیں گویا ہمیں سُنانے

کے بہانے تمام عالم کو سنا رہی ہوں۔

''یہ ہمارا ازبکستان ہے۔ یہ آباد اور خوشحال ہے''۔

مُجھے اُن کا یہ انداز بہت بھایا سو میں نے پوچھا:

''آپ کا کیا نام ہے؟''۔

''عظیمہ اعتماد وفنہ'' وہ بولیں۔

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''۔

''نہیں! کیمونسٹ'' اُس نے جواب دے دیا۔

ہم ذرا آگے پہنچے تھے تو مجھے خیال آیا کہ پوچھوں:

''سور کا گوشت کھاتی ہیں آپ؟''۔

انہوں نے ناک بھوں سکیڑتے ہوئے جواب دیا:

''ہم نہیں کھاتے ہیں، یہ روسی کھاتے ہیں''۔

''آپ کیوں نہیں کھاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پتہ نہیں کیوں'' اس کا جواب تھا۔ ''مجھ سے کھایا نہیں جا سکتا''۔

یہ کہتے ہوئے اُس چہرہ کچھ اس طرح نظر آنے لگا جیسے سور کے گوشت کا ذکر ہونے کے باعث اسے متلی آ رہی ہو۔

''انسان کتنا دلچسپ ہوتا ہے'' میں نے اندر ہی اندر خیال کیا۔

مجھے کچھ سمجھاتے ہوئے اُس گائیڈ نے ایک بار لفظ کیمسٹری کی جگہ ''چیمسٹری'' استعمال کیا جس پر میں نے کہا۔

''چیمسٹری کہنا غلط ہے، کیمسٹری کہنا چاہیئے''۔

''لیکن میں نے تو ڈکشنری میں اسے پڑھا ہے وہاں تو چیمسٹری ہی لکھا ہوا ہے''۔

''انگریزی کے الفاظ کے ہجّے اور تلفظ کے ساتھ معاملہ یہی ہے۔ دھوکہ باز

ہوتے ہیں اُن کے یہ الفاظ بھی''میں نے کہا۔

''ایسا کیوں ہے آخر؟''

''یہ اس وجہ سے ہے کہ ولایت میں دراصل سرمایہ دارانہ نظام ہی چلتا ہے۔ سواُن سرمایہ داروں نے الفاظ کے ہجّے اور تلفظ کے ساتھ بھی یہی معاملہ روا رکھا ہے، دھوکہ دہی والا۔ اس سرمایہ دارانہ دھوکہ بازی کو وہاں سے ختم ہونے دیجیےءاوراس کی جگہ پرسوشلسٹ نظام کوقائم ہونے دیجئے پھر دیکھیئے کہ ان الفاظ کی سپیلنگ (تلفظ) کا معاملہ بھی ٹھیک ہوکررہ جائے گا''۔

وہ میری بات سُن کر ہنس پڑی۔ کیا خبر اُسے میری بات پر یقین بھی آیا یا نہیں۔ شک تو مجھے اُس کی ذہنی صلاحیت پر بالکل بھی نہیں البتہ شک سا اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک عورت ہے اور عورت چاہے کشمیری ہو یا اُزبیک، مرد کی باتوں کو ہمیشہ تقریباً درست ہی مانا کرتی ہے۔

<u>خروشچوف نے ہجوم کا فائدہ اُٹھایا:</u>

نمائش سے واپس آ کر ہم نے چائے نوش کی۔ شام کو پیدل ٹہلنے کے لئے نکلے۔ نہ جانے لیوچنکوف اور میرے درمیان کیمونسٹ تحریک سے متعلق کس بات پر بحث چھڑ گئی لیکن بنتے بنتے ہماری بحث کا موضوع سٹالن بن گیا۔ میرا خیال تھا کہ سٹالن کے ساتھ ظلم ہوگیا ہے۔ اُس میں سو خامیاں سہی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ایک ڈکٹیٹر ہوتے ہوئے تحریک کے ساتھ غدّاری نہیں کی ہے بلکہ حق تو یہی ہے کہ اُس نے تحریک کو بہت آگے بڑھا دیا۔ لینن کے مرنے کے بعد اُس تحریک کو زندہ رکھا اور سوشلسٹ تحریک کو ترقی دے دی۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ سٹالن میں جو بھی خامیاں پیدا ہوگئیں وہ صرف انقلاب اور سوشل ازم پر زور دینے کے باعث ہوئیں۔ اُس کی نظر میں ایک وہی لینن کا اصل وارث تھا اور یہ کہ اگر وہ لینن کے ارشادت کو عمل میں نہ لائے تو پھر

کون لائے گا۔ اُسے کسی بھی دوسرے ساتھی پر بھروسہ نہ تھا۔ اُس نے عوام کے ایک حصے پر ظلم کر لیا لیکن کس وجہ سے؟......صرف ایک انقلاب کو قائم رکھنے اور سوشل ازم کو فروغ دینے کی غرض سے۔ وہ کمیونسٹ تحریک کا مرکزی کردار تھا۔ اُس کی ذاتی خامیاں عالمی کمیونسٹ تحریک کی خامیاں کہلائی جا سکتی ہیں۔

لیو چتکوف نے سٹالن پر وہی الزامات دھر لئے جو خروشچوف نے لگائے تھے۔ بحث میں لیو چتکوف کی طرف سے سٹالن پر کوئی بھی نیا الزام دھرا نہیں گیا۔ اُس بے چارے نے دراصل یہ سب پارٹی کی طرف سے چھپی کتابوں میں دیکھا۔ سٹالن پر الزامات لگانے کے پسِ پُشت مجھے سویت لیڈروں کی کئی مصلحتیں نظر آ رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ سٹالن اپنی ذات اور اپنے خیال سے کئی زیادہ کیمونسٹ تحریک کا غم خوار تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ پوری قوم کو ملک کی تعمیر میں لگا دے لیکن عام انسان تو کافی دیر تک ایک ہی نہج اور طریقے پر چلنے کے قائل ہوتے ہیں خاص طور سے جب قانون کے کوڑے بھی مارے جا رہے ہوں تب تو وہ بیٹھ ہی جاتا ہے۔ سٹالن کے زمانے میں روسی لوگوں کو جس طرح کی کڑی محنت اور مشقّت کرنا پڑی تھی اُس سے وہ اکتا گئے تھے۔ اگر چہ اُن کی اجتماعی محنت کا ثمرہ اجتماعی طور پر روسیوں کو ملا اور اُسی کی بدولت رُوس دنیا کی دو عظیم طاقتوں سے ایک بن سکا لیکن عام لوگ تو بہر حال اب اُس ایجی ٹیشن کے مُوڈ سے تنگ بھی آ چکے ہیں۔

سٹائن کی موت کے بعد خروشچوف نے ہجوم کے اس مُوڈ کا ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اپنی ذات کو ہجوم میں مقبول بنانے کی خاطر اُس نے سٹالن پر الزامات دھر لئے۔ اُس نے کہا کہ سٹائن اپنی یک نفری ڈکٹیٹر شپ چلا رہا تھا۔ جبکہ اجتماعی لیڈر شپ ہی بہتر ہوتی ہے۔ اُس نے اس میں بلگانن، ژوکوف وغیرہ کو بھی شامل کر لیا لیکن جوں ہی قدم جمائے اُس اجتماع کو آہستہ آہستہ دفع کر دیا اور پھر اکیلے ہی اپنی ڈکٹیٹر شپ چلانے لگا۔

لا پتہ:

سویت یونین میں آج کل ترقیاتی کا بڑی تیزی سے چل رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ سویت یونین جلد ہی دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممک بن جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں سوشلسٹ نظام مستحکم ہوجائے اور ہر شہری اس محنت کا فیض بھی پائے لیکن کمیونزم بحیثیت فلسفہ کے وہاں دم توڑ رہا ہے جو بچ کر رہ گیا ہے وہ صرف ایک ڈھانچہ ہ، محض دکھاوا، محض تماشہ۔

وہ فلسفہ جو ہر بات کی نفی کرتا ہے اب اس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ جگہ جگہ ''ابدی الاؤ'' نظر آتا ہے جس کے اردگرد ٹھیک ویسے ہی پھول سجائے گئے ہیں جس طرح کہ آستانوں کے اردگرد ہوا کرتے ہیں۔ سڑکوں پر اشتہاراتی بورڈ آویزاں ہیں جن پر ''لینن ہمارے ساتھ ہیں'' لکھا ہوا ہے۔ لینن کا مزار اس مذہب کا سب سے بڑا مزارِ مقدس ہے جہاں لوگ اپنی عقیدتیں نچھاور کرنے کے لئے آتے ہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اگر پچاس ساٹھ سال بعد اس مزار پر لوگ اپنی مُرادیں لے کر بھی آنے لگیں۔

ہماری آپسی بحث میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ میں تو اپنی بات محض ہمدردی کی بنا پر کئے جا رہا تھا۔ میرا تو اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ سوشلِسٹ نظام ہی انسانوں کے لئے بہتر نظام ہے۔ سب لوگ محنت کریں اور سب لوگ مل بانٹ کر کھائیں۔ ایسے نظامِ معاشرت کی مخالفت صرف وہ لوگ کریں گے جو یا تو ذہنی اعتبار سے پسماندہ ہوں گے ورنہ لوٹ کھسوٹ کے ذریعے بڑا حصہ دبانے کے خواستگار ہوں۔ لیکن مجھے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ وہ تحریک جو عالمی سطح پر مقبول ہوتی جا رہی تھی وہی تحریک محض اپنی ذات کو ہجوم میں مقبول بنوانے کے لئے تباہ کر دی گئی۔

''آپ کبھی کمیونسٹ رہے ہیں؟'' لیوچنکوف نے مجھ سے پوچھا۔

''جی، ۱۹۵۳ء تک'' میں نے جواب دیا۔

''اُس کے بعد؟'' اُس نے پوچھا۔

''جس تحریک میں سٹالن جیسا ظالم و جابر ڈکٹیٹر پیدا ہو جائے وہ تحریک میرے ذہن کو قبول نہیں ہو سکتی'' میں نے طنزاً جواب دے دیا۔ لیوچنکوف خاموش ہو گئے۔ اس پوری بحث کے دوران بھٹا چاریہ بھی خاموش ہی رہے تھے۔

ہم رو پڑے:

لیکن پھر شام کو بھٹا چاریہ خاموش نہ رہ سکے۔ شام کو روٹی کھانے کے بعد وہ میرے کمرے میں آ گئے اور پوچھ بیٹھے:

''آپ کو کمیونسٹ تحریک کی نسبت اتنی جانکاری کیسے ہے؟''

''کیونکہ میں خود بھی کافی عرصے تک ایک سچّا کمیونسٹ تھا''۔ میں نے جواب دیا۔

''مجھے اس کی خبر نہ تھی لیکن میں آپ کے خیالات کی تائید کرتا رہا''۔

اُنہوں نے کہا جس پر میں نے کہا کہ ''مجھے تو یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ کمیونزم بحیثیت فلسفے کے ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ بنیادی بات تو قومیت کی ہے۔ انقلاب سے پہلے تو روس مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت پسماندہ تھا۔ زاروں اور جاگیرداروں کا اقتدار تو صنعتی اور سماجی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ بنا ہوا تھا۔ روسی قوم بیدار ہو گئی۔ اُن کی بیداری میں روسی ادیبوں ٹالسٹائے، ترگنیف، چیخوف وغیرہ نے زبردست کردار نبھایا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی زارشاہی کو ختم کیا گیا لیکن ملکی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو ذہنی طور پر کسی اہم تبدیلی کے لئے پوری طرح تیار نہ تھے۔ لوگ اُن سے بھی متنفّر ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی جنگِ عظیم شروع ہو گئی جس میں روس شکست کھانے لگا۔ لوگوں کے قومی وقار کو ٹھیس پہنچی۔ ایسے میں لینن یوں اُبھر کر سامنے آ گیا، جیسے گھنے بادلوں کو چیرتا ہوا چمکتا سورج نکلتا ہے۔ اکتوبر کا انقلاب بپا ہو گیا۔ پورا نظام تبدیل ہو گیا۔ قومی وقار بڑھنے لگا۔ پوری دنیا کے ساتھ مقابلہ

کرتے ہوئے روسیوں نے کچھ نیا نرالا کرنا شروع جس کی خود اُن کو بھی پوری علمیت نہ تھی لیکن جس کے فوائد سامنے آتے رہے۔ لینن کو قومی رہنما مانا جانے لگا۔ ان کا فلسفہ سب لوگوں کی سمجھ میں آیا بھی کہ نہیں اُس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ سب کی نظروں میں ہیرو بن گئے۔ اُس نے منصوبہ بند طریقہ سے ترقیاتی کاموں کی سائنسی سوشلزم کے اصولوں کے مطابق بنیادیں رکھیں۔ سٹالین نے ان ہی اصولوں اور اُسی مشن کو آگے بڑھایا۔ اب کسی میں یہ دم نہیں کی اُن کے نام اور کام یا نظام کو ختم کر سکے البتہ فلسفہ کو ریپٹ ضرور ہو سکتا ہے۔

''ہندوستان کے بارے میں آپ کیا سمجھتے ہیں''؟ بھٹا چاریہ کسی پریشانی کی سی حالت میں پوچھنے لگے۔ اُنہیں ہندوستان کی باپت ایک غمخواری ہے۔

''افسوس اور واویلا!''۔

میں بھی جذباتی کیفیت میں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے دُنیا کے اسی حصے میں کوئی نقص واقع ہو گیا تھا، کہیں کوئی لڑکھڑاہٹ سی تھی۔

''مجھے ہندوستان کا مستقبل پریشان کئے جا رہا ہے۔ ہندوستان ہی کیا پورے برصغیر کا بھی۔ مجھے لگتا ہے کہ گاندھی کی صورت میں اس برصغیر کے لئے بھی ایک عظیم قائد پیدا ہو گیا تھا جس نے ہندوستان کی روح کو سمجھ لیا تھا لیکن افسوس وہ مارے گئے تھے''۔

بھٹا چاریہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھر لی۔ ہم شاید رو بھی پڑتے لیکن کسی مصلحت نے رو کے رکھا۔

<u>مہراج گنج:</u>

آج ہم ناشتہ کرنے کے بعد تاشقند کے اُس علاقے کی طرف چل پڑتے تھے جہاں پرانی وضع کا اُزبک بازار واقع ہے۔ مجھے تو یہ اپنے سرینگر کے مہاراج بازار جیسا ہی دکھائی دیا۔ ایک پُرانا بازار جس میں مختلف اقسام کا کریانہ سودا سلف ہوا کرتا تھا۔

بڑی مقدار میں ہلدی، ادرک، کپڑا، خوبانی، کشمش وغیرہ۔ یوں لگتا تھا کہ ہر طرح کی چیزیں نہ صرف میسّر ہیں بلکہ وافر بھی۔ چیزیں ہی وافر نہ تھیں، لوح بھی بے شمار تھے یوں جیسے کوئی بڑا سا میلہ لگا ہوا ہو۔ لوگ مول بھاؤ بھی کئے جا رہے ہیں، چیزیں بیچی اور خریدی بھی جارہی ہیں اور خریدار آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم نے وہاں کئی تصویریں بھی کھینچ لیں۔ ایک جگہ پر سیخ کباب بیچنے والا مل گیا۔ ہم اصل میں سیخ کباب کھانے کے ارادے سے آئے تھے۔ لیوچنکوف سے کسی نے ماسکو میں کہہ دیا تھا کہ تاشقند کے بازار میں خاص طور سیخ کباب کا مزہ لینا چاہئیے۔ وہ سیخ کباب والا کوئی میلا کچیلا مفلس سا آدمی نہ تھا بلکہ صاف ستھرے کپڑے پہنا ہوا ایک تنومند اور آسودہ حال نظر آنے والا شخص تھا۔ وہ ایک ساتھ پچاس پچاس گوشت کی بوٹیاں سینکے جاتا تھا اور کھانے والے چٹ کرتے جا رہے تھے۔ جتنی دیر میں ہم لوگوں نے ایک ایک کباب کھایا تب تک میرے خیال میں اُس نے کوئی سو کے قریب کباب بیچے تھے۔ یہ زیادہ سے زیاہ آدھے گھنٹے کا عرصہ تھا۔ اس حساب سے آپ اُس کے کام کرنے کے طریقے کو سمجھ سکتے ہیں۔

ان کے سیخ کباب کھانے والوں میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی تھیں۔ ہر عمر کے لوگ۔ دو اُزبک دوشیزائیں' غالبًا غیر شادی شُدہ' بھی ایک دوسرے کے ساتھ تیز تیز کھانے کا مقابلہ کرتی ہوئی سیخ کباب کا مزہ کے رہی تھیں۔ میں نے کیمرہ نکال کر ان کی تصویریں لیں۔ وہ دونوں مسکرا کر فوٹو کے لئے پوز دینے لگیں۔ میں نے دوسری تصویریں بھی کھینچیں۔ اس پر اُن میں سے ایک دوشیزہ میرے نزدیک آ گئی اور کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ میں نے معاملے کو بھانپتے ہوئے دوسرے لوگوں سے ذرا ہٹ کے اُسے موقع دیا۔ وہ میرے قریب آ کر کچھ کہہ گئی۔ میں نے چھٹی حس کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ معنی نکالئے کہ وہ شاید پوچھ رہی ہیں یہ تصویریں کس ملک کی طرف

جانے والی ہیں۔سو میں نے کہا ''کشمیر''۔

''کشمیر'' اُس نے دُہرایا۔وہ ہنستے ہنستے بولیں تھیں۔ساتھ ہی اُس نے کچھ اور بھی بولا لیکن میں کچھ بھی سمجھ نہ سکا۔اس لئے بول دیا کہ:

''زبانِ یار من تُرکی، و من تُرکی نمی دانم''

مجھے نہیں معلوم کہ وہ میری بات سمجھ بھی پائیں کہ نہیں لیکن وہ ہنستے ہنستے ہی رخصت ہوگئی اور اپنی سہیلی کے ساتھ ہولیں۔

بھٹا چاریہ اور لیوچنکوف نے یہ سب تاڑے ہوئے مجھ سے کہا......''عیش مناؤ جی! علیک سلیک کے بڑے فائدے اُٹھا رہے ہو؟''۔

ارے! میں نے تو اس کے ساتھ خالی ایک ہی بات کی ہے اور وہ بھی شعر کی صورت میں، جسے وہ سمجھ ہی نہیں پائیں''۔

اُس بازار میں پرانا اُزبکستان ہی زیادہ نمایاں ہے۔بزرگ خواتین میں سے اکثر بُرقعے جیسی کوئی چیز اوڑھے ہوئے نظر آتی تھیں۔کہیں کہیں پُرانی وضع کے ریڑے جنہیں گدھے کھینچے جا رہے تھے نظر آئے۔بازار میں کسی جگہ کشمیری قصبہ جات کی طرح کوئی آہنگری کی دُوکان بھی نظر آتی۔گزرے زمانوں کی باقیات کے باوصف اُس بازار میں بھی خوشحالی کا احساس ہوجاتا ہے۔

<u>چِلن زار:</u>

وہاں سے نکل کر ہم تاشقند کی نئی کالونی دیکھنے چلے گئے۔اُس نئی کالونی کو ''چِلن زار'' کہتے ہیں۔چِلن اُزبک میں درخت کو کہتے ہیں۔اُس کالونی میں نئے انداز کے مکانات تعمیر کئے گئے ہیں اور ہو بھی رہے ہیں۔سڑکیں کُشادہ ہیں۔ڈیپارٹ مینٹل سٹورس قائم ہوئے ہیں۔

دُوشنبہ اور تاشقند دو ایسے شہر ہیں جو سویت انقلاب کے بعد تعمیر ہوئے ہیں۔ان

دونوں شہروں کی تعمیرات میں مشابہت ہے۔ اس طرح کی تعمیرات دہلی اور شمالی ہندوستان کے کئی نئے شہروں کے ساتھ بھی ملتی جلتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے ان تعمیرات میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں گاؤں اب تھوڑے ہی عرصے میں وسط ایشیا کے دو بڑے شہر بن چکے ہیں۔

گلستان:

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم شہر سے باہر جا نکلے۔جس سڑک پر ہماری کار چل رہی تھی اُس پر اچھا خاصا ٹریفک کا دباؤ تھا۔مخالف سمت سے جو بھی موٹر کار،بس یا کوئی دوسری گاڑی آتی تھی وہ پھولوں سے سجی سجائی ہوئی تھی۔ہاروں کی طرح گُل لالہ کے ہار یا گلدستے جڑے گئے تھے۔لیو چنکوف نے بتایا کہ ذرا آگے ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر اس نوع کے پھول بہت ملتے ہیں اور آج سب لوگ اُسی جگہ کا رُخ کرتے ہیں۔ مجھے تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہاں بھی ہماری ''بادام واری'' کی طرح ہی کوئی جگہ ہو اور ہم اُسی ''بادام واری'' کی طرف سیر وسیاحت کی غرض سے نکلے ہوں۔ میں مضطرب تھا کہ کب وہاں پہنچ جائیں تا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ پاؤں اُزبک لوگوں کا وہ ''پھولوں کا میلہ'' اور یہ کہ وہ کشمیریوں کے پھولوں کے میلے کے ساتھ کتنا ملتا جلتا ہے۔ لیکن وہاں پہنچنے سے پیشتر ہی ایک اور دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا۔سڑک کنارے ایک گاؤں پڑتا تھا، جسے گلستان کہتے تھے۔وہاں کسی نیک بخت دوشیزہ کی شادی ہو رہی تھی۔ یہ رُخصتی کی تقریب تھی۔لمبی لمبی میزیں ایک دوسرے کے ساتھ لگائی گئی تھیں اور مُستطیل کی شکل بنائی گئی تھی۔اس کے اندر گانا چل رہا تھا۔اردگرد لگی میزوں کے ساتھ کرسیاں بھی لگائی گئی تھیں تا کہ تمام مہمان بیچ کے صحن نما پر نظریں رکھ سکیں۔میزوں پر سفید دسترخوان بچھے ہوئے تھے جس پر کھانے کی پلیٹیں اور خوان رکھے ہوئے تھے۔ایک سرے پر ایک اور چھوٹی سی مُستطیل شکل کی میز تھی جس کے اردگرد

چار کُرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

ہم نے اپنی موٹر گاڑی روک دی۔ ڈرائیور نے بتادیا کہ شادی کے سلسلے میں جمع لوگوں کے قریب نہ جائیں کیوں کہ وہ اُن کی تقریب میں مداخلت ہوگی اور شاید اُن کو پسند نہ آئے۔ ہم نے بھی مانا کہ اُن لوگوں کے قریب نہیں جائیں گے لیکن مارے شوق کے اپنی کار سے باہر آ ہی گئے۔ شادی کی تقریب منانے والوں نے ہمیں دیکھا تو وہ دوڑے دوڑے آئے اور ہمیں تقریب میں شریک ہونے کی باقاعدہ دعوت دی۔ ہم انکار کرتے رہے لیکن وہ نہ مانے۔ پتہ چلا کہ میزوں کی مستطیل کے باہر جو تنہا میز سجی ہوئی ہے وہ دراصل ہمیشہ ہی ایسے مہمانوں کی خاطر لگی رہتی ہے جو بغیر دعوت کے شریک ہو جائیں......سو ہم اُسی میز کے اردگرد بیٹھ گئے۔

میز پر کئی اقسام کے میوے اور مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جوں ہی ہم بیٹھ گئے ہم سے اصرار کیا گیا کہ ہم کچھ کھائیں پئیں۔ ڈرائیور نے بھی کہہ دیا کہ کچھ تو کھانا ہی چاہیئے تاکہ میزبانوں کو ہتک محسوس نہ ہو۔ بُھنا ہوا گوشت لایا گیا اور سبز چائے بھی۔ ادھر گانا بجانا جاری تھا۔ ایک خوبصورت اور باسلیقہ خاتون ناچ رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ وہ اُن کی قریبی رشتہ دار ہے جن کے ہاں شادی ہو رہی تھی۔ وہ اصل میں گانا بجانا پیشے کے طور پر یا کاروباری انداز میں نہیں کر رہی تھیں بلکہ اپنی شادمانی کا اظہار کرنے کی غرض سے۔ گاؤں کے بزرگ آ گئے۔ کولوخوز کے چیرمین، سیکریٹری، اساتذہ اور اطباء، سب آئے تھے۔ آخر گاؤں کی ایک بچّی کی شادی جو ہو رہی تھی گاؤں کے گاؤں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایسی روایات کی قدر کوئی کیسے نہ کرتا۔

<u>افسوس:</u>

آخر ہم یہ وعدہ کر کے نکل پڑے کہ اگر اُسی راستے واپس آنا ہوا تو ضرور شام کا کھانا اُن کے ساتھ مل کے کھائیں گے۔ یہ بھی خیال تھا کہ شام کو دُلہا بھی آیا ہوگا سو

اُس کوبھی دیکھتے چلیں گے۔لیکن واپسی پر ہم اُن کے پاس نہیں ٹھہر سکے۔ڈرائیور نے وہاں سے گُزرتے وقت کار دوڑا دی اور کہا کہ اس وقت ان کے ہاں جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔لیو چنکوف نے بھی ڈرائیور کی بات کو صحیح قرار دیا۔ بھٹا چاریہ اور میں حیران تھے کہ آخراب حسبِ وعدہ تقریب میں شریک ہونا مناسب کیسے نہیں ہوگا؟......

افسوس ہے کہ ہمیں پھولوں کا میلہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔اجازت ہی نہیں مل سکی۔ نزدیک پہنچنے پر وہاں ایک پکٹ دیکھی۔ پکٹ پر موجود حاکموں نے بتادیا کہ اس علاقے کے حیوانات میں کوئی ایسی بیماری پھیل چکی ہے جوانسانوں کو بھی لگ سکتی ہے۔ اوپر سے ہم غیر ملکی بھی تھے اس لئے اجازت مل نہ پائی۔ہم نے اپنے اشتیاقِ دید کی بنا پر بڑا ازور لگایا لیکن پھر بھی وہاں جانا ممکن نہیں ہوا۔اس لئے مایوس ہوکر واپس آئے۔

یہ سفر پھر بھی اس اعتبار سے سُود مند ثابت ہوا کہ ہم نے ازبکستان کے بہت سے دیہات دیکھ لئے، جن میں روسی مردوزن بھی ٹھیک ویسے ہی رہتے ہیں جس طرح دوسرے لوگ،سب ایک ہی طرح کے مکانات میں۔روسی حالانکہ ٹیکنشنز، ڈاکٹرس یا اساتذہ، ہونے کی وجہ سے وہاں پر سکونت پذیر تھے اور بظاہر روسی فیڈریشن کے آسودہ حال علاقوں سے تعلق رکھنے والے تھے لیکن انہوں نے پھر بھی اُزبک لوگوں کے ساتھ خودکو یوں جوڑ رکھا تھا گویا کوئی باہر والے نہ تھے۔اُن کی چمڑی گوری نہ ہوتی تو اُنہیں اُزبک سے ممیّز کرنا بھی ناممکن نظر آتا...... مجھے روسیوں کی برتری نظر آئی کہ ان میں حاکمیت کے باعث نخوّت نہیں تھی۔ وہ مقامی آبادی کو جاہل اور گنوار سمجھ کر اُن سے دُوری اختیار نہیں کرتے نہ اپنے لئے کوئی علاحدہ بستی قائم کرتے ہیں۔اُن ہی لوگوں کے ساتھ مِل جُل کر اور اُن کو اپنائیت کا احساس دلاتے ہوئے کام کرتے رہتے ہیں......میں نہیں جانتا کہ آخر یہ روسیوں کی قومی عظمت ہے یا کمیونزم کے فلسفے کے باعث مِشنری جذبے کے باعث یا پھر لینن کے خواب پورے کرنے کا شوق، جوبھی

ہے یہ جذبہ بہرصورت عظمت اور کشادہ دلی کا آئینہ دار ہے۔

پیٹلز:

واپس آ کر ہم ریستوران میں داخل ہوئے۔ ہمارے لئے میز کھڑکی کے پاس ہی لگی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے سڑک پر بھی نظر پڑتی تھی۔ سڑک کے اس موڑ پر ایک ٹیکسی اسٹینڈ بھی تھا۔ لوگ ٹیکسیوں کے انتظار میں کھڑے نظر آ رہے تھے۔ لہٰذا ایک رونق سی لگی تھی۔

کھڑکی کے باہر دو روسی لڑکے نظر آ رہے تھے۔ ایک کوئی سولہ سال کی عمر کا اور دوسرا کچھ اُس سے کم۔ دونوں سگریٹ پی رہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں بیئر کی بوتلیں بھی تھیں۔ وہ سیدھے بوتل میں سے ہی پی رہے تھے اور ساتھ ہی سگریٹ کے کش لگائے جا رہے تھے۔ انہوں نے لمبے لمبے بال اور کن پٹیوں سے نیچے تک قلمیں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے وہ یورپی بیٹلز جیسے محسوس ہوئے اور میں اس بات کو لے کر حیران تھا کہ آیا یہ وبا پھیلتے پھیلتے یہاں تک آ پہنچی ہے۔ دونوں مست تھے۔ کبھی کھڑے ہو جاتے اور ڈگمگاتے ہوئے چند قدم چلتے تو کبھی بیٹھتے اور بوتلوں سے کچھ گھونٹ پی لیتے۔ مجھے اُن سے نفرت سی ہوگئی۔ یہ آخر اس خرافات کے لئے خرچہ کہاں سے لاتے ہوں گے؟

میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ بھٹا چاریہ زور زور سے قہقہہ مارنے لگا۔ میں اُن کی طرف متوجہ ہوا تو پایا کہ وہ اور لیوچنکوف ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے۔ وہاں ایک روسی صاحب کے زخمی سر سے خون بہہ رہا تھا۔

بھٹا چاریہ بول پڑا......''اس نے کسی کے ساتھ جھگڑا کیا' اُس سے مار کھا گیا اور نزلہ اپنی بیوی پر اُتار رہا ہے۔

روسی دراصل اُسی فریقِ ثانی کی طرف دوڑ کر جانا چاہ رہا تھا مگر بیوی روک رہی

تھیں۔ وہ بے چاری روئے بھی جارہی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ آیا وہ دوسرا شخص بھی کوئی روسی ہی تھا؟

لیو چنکوف فوراً بول پڑا کہ ''وہ بھی کوئی روسی ہی ہوگا''۔

بھٹا چاریہ نے فوراً تصدیق کرتے ہوئے کہا: ''ہاں! وہ روسی ہی تھا''۔ میں نے مُتجسس ہوکر لیو چنکوف سے پوچھا: ''آپ نے کس بنا پر یہ کہہ دیا تھا کہ وہ روسی ہی ضرور ہوگا؟''۔

لیو چنکوف بولے کہ ''اگر وہ دوسرا اُزبک یا کس اور قوم سے تعلق رکھنے والا ہوتا تو پھر لڑائی جھگڑا طول پکڑ چکا ہوتا۔ اِس کی حمایت میں رُوسی اُٹھ کھڑے ہو جاتے اور اُس کی طرف سے اس کی قوم کے لوگ!''۔ لیو چنکوف نے کہا، میں سوچنے لگا کہ اگر چہ سماج مختلف ہے، یہاں کا نظام معاشرت بھی مختلف ہے اور تعلیم وترقی بھی اونچے درجے پر ہے لیکن انسان یہاں بھی قوموں اور فرقوں میں ہی بٹا ہوا ہے...... یہ تعجب کی بات ہے!!!

بیئر پینے میں مصروف دو بچے اس جھگڑے سے یک سر بے خبر لگ رہے تھے، وہ مدہوش تھے۔ شاید اس سے پہلے بھی انہوں نے کوئی نشیلی چیز پی رکھی تھی۔ روسیوں میں شراب پینے اور پی کر بدحواس ہو جانے کی عادت بہت پرانی ہے۔ ماضی میں یہ لوگ شراب خانوں سے پی کے آتے تو گھر میں عورتوں کی بے حد مار پیٹ کیا کرتے تھے۔ اگر چہ یہ پتہ نہیں کہ آج کل ان کے گھروں میں کیا کچھ چلتا ہے لیکن اس قدر تو معلومات ہیں کہ شراب پی کر ان کے بد حواس ہوجانے کی عادت بہت پُرانی ہے۔ ''تاجکستان ہوٹل'' اور ''تاشقند ہوٹل'' میں بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ روسی کس طرح سے بے حد حساب شراب نوشی کرتے ہیں اور پھر انکو ریستورانوں سے اُٹھ کر نکلنا بھی کس قدر مشکل ہوجاتا ہے۔ اگر ان کی عورتیں ان کو سہارا دے کر نہ

لیجائیں تو نجانے کہاں راستوں میں ہی بے سُدھ ہوکر گر پڑیں......ہم نے روسی علی شیر نوائی میوزیم کے باہر ایک روسی کو اسی وجہ سے نیم مُردہ جیسا پڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔

شام کا کھانا کھا کر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے کہ اگلی صبح بخارا جانے کا پروگرام بنا ہوا تھا۔

تاریخ آگے ہی بڑھتی رہتی ہے:

تاشقند سے سمرقند اور پھر سمرقند سے بخارا تک ہمیں ہوائی سفر میں ایک گھنٹہ چالیس منٹ لگ گئے۔ ہمیں بخارا میں صبح سے شام تک ٹھہرنا تھا اور پھر واپس سمرقند جانا طے تھا۔

بخارا اور سمرقند سویت وسط ایشیا کے دو ایسے شہر ہیں جن کے ساتھ ہمارا صدیوں پرانا تعلق رہا ہے۔ان دوشہروں کے تذکرے ہمارے لئے، ہمارے فارسی شعرا، مذہبی علماء اور تاریخ نویسوں نے خوب کر رکھے ہیں۔ ہمارے آئے یہاں سادات نے بھی ہمارے آباؤ اجداد کو ان دوشہروں سے متعلق عظیم ثقافت وغیرہ کے قصے سُنائے ہیں جو بعد میں سینہ بہ سینہ مُنتقل ہوتے آئے ہیں۔اسی لئے ہمارے ذہنوں میں ان دونوں شہروں سے وابستہ ایک خاص تصوّر موجود رہا ہے۔ ہم سمرقند اور بُخارا کو اسلام کے ماخذ ومنابع گردانتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ وہاں پہنچ کر مجھے اسلام کے عروج کی نسبت مختلف تاریخی واقعات کا علم ہوجائیگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں وہاں شیخ سعدیؔ، بوعلی سیناؔ، البیرونی وغیرہ کو پھر سے جیتا جاگتا پاؤں گا لیکن وہاں پہنچنے پر معلوم پڑا کہ ہم کشمیری کس قدر غلط فہمیوں میں مُبتلا ہیں۔ ہمارے یہاں ابھی تک وہی صدیوں پرانی سمرقند اور بُخارا کے تصوّرات ہی محفوظ ہیں۔نجانے ہمارے اذہان میں یہ بات کیوں گھر کئے ہوئے ہے کہ ان دوشہروں کے جو تذکرے ہم نے آباواجداد سے سُنے یا سینہ بہ سینہ حاصل کئے

ہیں ان کے مطابق ہی یہ شہر ابھی تک موجود ہوں گے............لیکن تاریخ تو اپنا سفر جاری رکھتی ہے، پیہم آگے ہی آگے بڑھتی رہتی ہے۔

ہم چاروں تاشقند سے روانہ ہو گئے بھٹا چاریہ، لیو چنکوف اور میں۔ ساتھ میں رستُم جو تاشقند رائیٹرس یونین کی طرف سے ہمارا گائیڈ تھا۔ رُستم کا ساتھ رہنا نہ رہنا تو ایک سا تھا۔ وہ کبھی ایک لفظ بھی نہیں بولتا تھا۔ ہمارے ساتھ تو بالکل ہی کوئی بات نہیں کرتا اور لیو چنکوف کے ساتھ بھی صرف تب ہی بولتا جب وہ کچھ پوچھ لیتا۔ بُخارا کے ہوائی اڈے پر ہمارے لئے بُخارا رائیٹرس یونین کے سیکریٹری تاشپولت حمید استقبال کرنے آئے ہوئے تھے۔

ہوائی اڈے سے نکلتے ہی ہم شہر دیکھنے چل پڑے۔ پُرانی تاریخی عمارتیں عظیم الشان تھیں اور اسلامی طرزِ تعمیر کی خوبصورت مثالیں بھی لیکن ان عمارتوں کے علاوہ تو بخارا کے شہر میں دیکھنے کی کوئی اور بات نہ تھی۔ باقی شہر تو صرف ایک گاؤں کی طرح ہے۔ پرانے کچے مکانات جن کے چاروں طرف خالی خولی زمین، ٹھیک ویسے ہی جیسے کسی پسماندہ قسم کے کشمیری گاؤں میں ہوتی ہے۔ میرا ذہنی سکون چھِن سا گیا۔ مجھے وہ بخارا نظر ہی نہیں آ رہا تھا جس کے ساتھ ساتھ تصوّرات نے عجیب قسم کے اعتقادات وابستہ کروا رکھے ہیں۔

ہماری کار ایک گاؤں میں پہنچ کر رُک گئی۔ کار سے اُتر کر ہم پیدل چلتے ہوئے ایک محل دیکھنے گئے۔ یہ بخارا کے آخری حکمران امیر علی خان کا محل تھا۔ اس کے اندر ایک وسیع باغ ہے۔ باغ کے اندر ایک طرف کو ایک تالاب ہے اور اُس تالاب کے نزدیک ہی ایک پنڈال بھی موجود ہے۔ تاشپولت حمید ہمیں اس کی تاریخ سے واقف کرا رہا تھا۔

امیر علی خان ایک سخت جابر حکمران تھا۔ اُس کے محل میں ہر وقت چالیس کنواری

دوشیزائیں مہیّا رکھی جاتی تھیں۔ اُس نے ایک چھاپہ مارٹولی تیار کر رکھی تھی جس کا کام یہی ہوتا تھا کہ علاقے میں کنواری لڑکیوں کو تلاش کرتے رہیں۔ اُن خوبصورت کنواریوں کو محل میں لایا جاتا تھا۔ امیر ہر کنواری لڑکی کے ساتھ صرف ایک بار سوتا تھا جس کے بعد اُسے نِکال باہر کیا جاتا۔ طریقہ یہ تھا کہ محل میں کبھی بھی چالیس سے زیادہ کنواری لڑکیاں نہ ہوں لیکن چالیس سے کبھی کوئی کم بھی نہ ہوں۔ اسی لئے وہاں ہر روز ایک نئی لڑکی لائی جاتی اور اُس کے بدلے ایک نکال دی جاتی۔

تاشپوتِ حمید کہے جارہا تھا اور میرے تصوّرات کی دُنیا میں بخارا کی عظمتوں کے بنے بُت ایک ایک کر کے مُنہ کے بل گِرتے جارہے تھے۔ مجھے اس جگہ اور اُس ماحول کے ساتھ نفرت سی ہونے لگی اور میں دل ہی دل میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہو جاؤں۔

جوں ہی ہم وہاں سے نکلنے لگے تاشپوت حمید نے مجھ سے پوچھا: ''آپ اُس پنڈال پر چڑھنا تو نہیں چاہتے؟''۔

مجھے کراہٹ سی محسوس ہوگئی اور میں نے جھٹ سے جواب دیا:

''نہیں۔ میں کوئی خبیث نہیں ہوں جو ایسا کروں''۔

وہاں سے نکلنے پر ہم چشمۂ ایوب دیکھنے گئے۔ ایوب ایک نیک بزرگ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ بخارا آئے تھے اُس زمانے میں وہاں کوئی لاعلاج بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے خدا سے دعا مانگی۔ اس سلسلے میں اُس نے ایک قبر کھدوائی جس کے اندر وہ دعا مانگتے مانگتے غائب ہوگئے۔ اُس کے غائب ہونے پر وہاں سے ایک چشمہ پھوٹا۔ جو کوئی بھی اُس چشمے کے پانی سے نہا لیتا وہ شفایاب ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ آج بھی بخارا میں مشہور ہے۔

اس کے بعد ہم نے اسمٰعیل سمانی کا مقبرہ بھی دیکھا۔ وہ بھی بخارا کا ایک حاکم رہا

ہے۔وہ دسویں صدی کے پہلے حصے میں وہاں کا حکمران تھا۔اُس کی قبر کے سرہانے کی طرف بھی اور پیروں کی طرف بھی زمین میں دو سرنگیں سی بنی ہوئی ہیں جن سے ایک قصہّ وابستہ ہے۔

کہتے ہیں کہ اسمٰعیل سمانی کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔اُس نے صرف لڑکیاں ہی پائی تھیں۔وہ سوچنے لگا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کی سلطنت کا کیا ہوگا؟ وہ کسی نتیجہ پر تو نہیں پہنچا تھا اور اسی دوران موت آ گئی۔اُس کے امیر اور وزیر اُس کے سچے وفادار تھے۔انہوں نے یہ بات عام کرادی کہ بادشاہ قبر کے اندر میں بھی زندہ ہیں۔جس کسی شخص کا کوئی مقدمہ ہوگا اُسے چاہیئے کہ بادشاہ کی قبر میں سرہانے کی طرف اپنی درخواست پیش کردے اگلی صبح تک اُس درخواست پر فیصلہ کیا جائے گا اور درخواست دہندہ کو وہ درخواست معہ فیصلہٗ بادشاہ مل جائے گی۔

دراصل اُس قبر کے نیچے ایک کمرہ بنوالیا گیا تھا جہاں اُس بادشاہ کے وفا شعار امراو وزراء کو بیٹھ کر یہ فیصلے لکھا کرتے تھے۔صبح کو لوگ اپنی اپنی درخواستیں پیروں کی طرف واقع سرنگ سے واپس آنے کو صحیح مانتے ہوئے اُٹھالیا کرتے۔انہیں پورا یقین ہو چلا تھا کہ بادشاہ قبر کے اندر بھی زندہ ہیں اور وہی ان کی درخواستوں پر فیصلے لکھا کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اسمٰعیل سمانی نے اس طرح مرنے کے بعد چالیس سال تک حکومت کی یا یوں کہیئے کہ اُن کے نام پر حکومت ہوتی رہی۔

اس مقبرے کو ایک زبردست تاریخی اہمیت حاصل رہی ہے۔اسی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے کہا تھا کہ آپ لوگ اچھی خاصی قیمت پا کر اس قبر کو انگریزوں کو بیچ سکتے ہیں۔''لیکن شُکر ہے کہ سٹالن نے یہ پیشکش ٹھکرادی''لیوچنکوف بولے۔

اس کے بعد ہمیں مِنارۂ کلاں دکھایا گیا۔ اسے امیر تیمور نے تعمیر کروادیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد ایک درخت کی جڑوں کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بنیاد سطح زمین سے کوئی پندرہ فٹ اونچی ڈالی گئی ہے۔ جس کے اوپر مینار کو چھیالیس میٹر کی اونچائی تک اٹھایا گیا ہے۔ امیر تیمور نے کاریگروں کو بتا رکھا تھا کہ یہ مینار صرف چھ مہینوں کے عرصے میں مکمل ہونا چاہیئے لیکن چھ مہینوں میں تو اس کا صرف ایک حصہّ مکمل ہوسکا۔ کاری گر مارے خوف کے کام کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے لیکن جب امیر تیمور نے سُنا کہ یہ کاری گر مقرّرہ معیاد کے اندر تعمیر مکمل نہ کر پانے کے باعث اُس سے خائف ہیں، اُس نے معافی کا اعلان کروادیا اور بقیہ کام شروع کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ کاری گر یہ اعلانِ معافی سن کر واپس آئے اور آہستہ آہستہ کام مکمل کیا۔

ہم نے دوپہر کا کھانا ایک پٹری والے ہوٹل میں کھایا۔ اس طرح کے ہوٹل ہمارے یہاں کے عام قصبوں میں موجود ہوٹلوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ ان ہوٹلوں میں بھی بیرے کی جگہ عورتیں ہی تھیں اور خانساماں کا کام کرنے والی بھی عورتیں۔ اسمٰعیل سمانی کو دیکھنے کے لئے مدارس کے چھوٹے چھوٹے بچے آئے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ ان کی استانیاں بھی تھیں، جو سب کی سب روسی نژاد تھیں............ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر روس کی یہ نوجوان استانیاں کِس جذبے کے تحت وسط ایشیا کے ان پرانے اور بے رونق سے دیہات میں آیا کرتی ہیں اور پھر ایسی دلچسپی کے تحت محنت بھی کرتی ہیں۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم سڑکوں اور گلیوں میں ٹہلتے رہے۔ لوگوں کو دیکھتے رہے، بازاروں کو دیکھتے رہے۔ سڑکوں پر آویزاں اشتہاراتی قسم کے بورڈ دیکھے جن پر لکھا ہوا تھا ''لینن آپ کے ساتھ ساتھ ہے''۔ ہم نے ''ابدی نار'' دیکھا لیکن وہ نہیں دیکھا جو بخارا میں دیکھنے کے لائق تھا۔ ہم کسی بھی مسلمان امام کو دیکھ نہ سکے اور نہ کہیں اسلام کو

ایک جیتے جاگتے مذہب کی صورت میں پایا۔اس کی ایک وجہ تھی اور وہ تھی تاشپوت حمید کی لاپرواہی۔ بظاہر خود کو ایک خاص کمیونسٹ جتلانے کی وجہ سے ہی اُس نے ہمیں صرف امیر علی خان کے محل سے متعلق تفصیلات فراہم کردیں۔ہمیں کوئی بھی کارخانہ یا انسٹی چیوٹ نہیں دکھایا گیا۔

سہ پہر کو ہم واپس بُخارا سے سمرقند چلے گئے۔سمرقند میں بخارا کے مقابلے میں تعمیر وترقی کے نشانات نمایاں ہیں۔وہاں کی سڑکیں زیادہ کُشادہ ہیں، مکانات نئے طرز کے ہیں اور کالونیاں بنی ہوئی ہیں۔وہاں ایک چھوٹا مگر بہت خوبصورت ہوٹل ہے جس کا نام بھی ''ہوٹل سمرقند'' رکھا گیا ہے۔ہم اُسی میں ٹھہرائے گئے۔

ہوٹل میں داخلے کا اصل دروازہ سڑک کی طرف ہے۔ ہمارے لئے کمرے دوسری منزل میں مخصوص تھے جن کی بالکونیاں جانبِ عقب تھیں۔نہادھوکر اور کپڑے بدل کر میں بالکونی میں کرسی لگا کر بیٹھ گیا۔ بالکونی سے پاس کی ایک پارک پر نظر پڑتی تھی۔اُس پارک میں بچوں کے کھیلنے کودنے کے لئے گھوڑے گدھے بھی بنے ہوئے ہیں۔لیکن اُس وقت وہاں کوئی بچّہ نہ تھا۔ایک بینچ پر صرف دوتین روسی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور ایک اور بینچ پر ایک جوڑا تھا...... وہ دونوں بھی روسی تھے۔ہم نے رات گُزاری۔شام کو بھٹاچاریہ اور میں گھومنے چلے۔ ہوٹل سے نکل کر ہم داہنی طرف کو مُڑ گئے اور سیدھے راستے چلتے رہے۔تقریباً دو جریب کے فاصلے پر ایک پارک ملی۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ہم بھی داخل ہوکر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔یوں لگتا تھا جیسے ہمیں کئی باتوں کی گرہیں سلجھانے کی اشد ضرورت ہے۔ہم ابھی تک بہت کچھ دیکھ چکے تھے اور اپنے اپنے انداز میں اُسے سمجھا بھی تھا۔ہمیں اب دیکھنا یہ تھا کہ ہمارے مُشاہدے اور محسوسات آپس میں کس قدر ملتے جُلتے ہیں۔دونوں کو اس بات پر مکمل اتفاق تھا کہ روسی عوام لینن کے ارشادات کو محض اس وجہ سے بعمل لا رہے تھے کہ وہ اُسے اپنا قومی

ہیرو مانتے ہیں۔اس بات پر مکمل اتفاق تھا کہ سویت یونین میں ترقیاتی منصوبے تیزی کے ساتھ پورے کئے جارہے ہیں۔

بھٹاچاریہ مانتا تھا کہ اب تاشقند میں شادی ہونے پر نکاح نامہ لکھنے کی روایت قائم نہیں رہی ہے صرف شادی کو دفاتر میں درج کروانا لازمی ہے۔ یہ سب اُس کو گلستان نام کے گاؤں میں میرے سامنے گاؤں والوں نے بتادیا تھا لیکن مجھے اس بات پر پوری طرح سے یقین نہیں آرہا تھا۔ مجھے وہاں بہت سے بزرگ اور باریش لوگ بھی ملے جنہیں یہ مذہبی عقیدہ ترک کردینا کسی بھی صورت میں گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے نکاح کئے جانے کی بات سے میرے خیال میں محض اس وجہ سے انکار کیا تھا کیونکہ ہمارے ساتھ ایک روسی ترجمہ کار کو بھی دیکھا تھا۔شاید وہ روسی ہمراہی کی موجودگی میں خودکو''پسماندہ وفرسودہ''ظاہر ہونے کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اس کے بعد ہم پارک میں ٹہلنے لگے۔شہیدوں کی یاد میں پارک کے ایک حصے میں''ابدالاؤ'' ملا۔ہمیں اس پر ہنسی بھی آ گئی کیونکہ''یہ بھی تو نئے مذہب کے نئے آستانوں'' کی ہی ایک صورت تھی۔

واپس آتے ہوئے ہوٹل کے قریب ہی ہمیں ایک حبشی ملا۔ بھٹاچاریہ نے اُس کے ساتھ بات چیت شروع کردی۔ بھٹاچاریہ ایسے ہر شخص سے بات چیت میں دلچسپی رکھتا تھا جو روسی نہ ہو۔ بظاہر بھٹاچاریہ اُن لوگوں سے سویت یونین کے متعلق اُن کے تاثرات جاننے کی بڑی زبردست خواہش رکھتا تھا۔

وہ امریکی حبشی (نیگرو) غصے میں تھا۔اُسے انٹورسٹ (سویت ٹورسٹ ادارہ) کی جانب سے ایک چھوٹی اور خوبصورت سی لڑکی گائڈ کے بہ طور بطور فراہم کی گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُسے سمرقند اور بخارا دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اُس نے دراصل پہلے ہی انٹورسٹ والوں کو لکھ بھیجا تھا کہ اُسے روس (سویت یونین) کا مغربی حصہ

دیکھنا ہے اور اب یہاں اُسے لگ رہا تھا اُسے ٹھگا گیا ہے اور اُس کے پیسے برباد کئے گئے ہیں۔ وہ نجانے غصے میں اور بھی کیا کیا کہہ جاتا لیکن میں نے یہ کہہ کر اُس کا غصہ کم کر دیا کہ......

''آپ صحیح نہیں ہیں۔ اتنی خوبصورت گائیڈ کے ساتھ اگر مجھے جہنّم میں بھی بھیج دیا جاتا مجھے وہاں بھی سکون مل جاتا، پھر سمرقند اور بخارا میں آ کر بھلا کیسے سکون وقرار نہ ملتا''۔ یہ سُن کر سبھی ہنس پڑے، وہ حبشی بھی۔ پھر کوئی کچھ نہ بولا۔

سمرقند اور گوگہ:

آج ہم سمرقند شہر دیکھنے نکلے تھے۔ سمرقند کے ایک شاعر فیضؔی بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ سمرقند میں امیر تیمور کا مقبرہ بھی ہے۔ ہم پہلے اُس مقبرے کو دیکھنے چلے گئے۔ اُسے وہاں مقامی طور پر ''گُر امیر'' کہتے میں۔ ہماری فارسی دانی کے بموجب تو اُسے گورِ امیر کہنا چاہیئے تھا۔ فیضؔی جو ہمارے ساتھ تھا، رہ رہ کے حافظؔ شیرازی کا یہ شعر پڑھے جارہا تھا۔

اگر آں تُرکِ شیرازی بدست آرد دِل مارا
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارارا

میں نے سُن رکھا تھا کہ جب امیر تیمور نے اُس شاعر کو بُلایا تھا تو پوچھا تھا کہ اے سادہ مزاج شاعر! تم محبوب کے تِل کے عوض یہ سمرقند اور بخارا جیسے شہر کیوں کر بخش سکتے ہو! تمہیں کیا معلوم نہیں کہ ان شہروں کو جیتنے کے لئے ہمیں کتنا قتل و غارت کرنا پڑا ہے۔

فیضؔی نے کہا کہ اس کہاوت کے ساتھ ایک اور قصہ بھی ملتا ہے وہ یہ کہ اُس زمانے میں کوئی اور فراخ دل شاعر بھی تھا جس نے یہ شعر سُن کر کہا تھا کہ حافظؔ کنجوس ہے کہ معشوق کے تِل کے بدلے صرف سمرقند اور بخارا قربان کرنے پر آمادہ ہے۔ مجھ

سے کہا جاتا تو میں پوری دُنیا اُس خال پر نچھاور کر دیتا۔

بہر حال ''گُرامیر'' ایک زبردست تاریخی مقبرہ ہے۔اس کی بہت لمبی سیڑھیاں ہیں جن کی مدد سے اوپر بنے آستانہ پر پہنچا جاتا ہے۔ مجھے اس آستانہ کی کوئی علمیت نہ تھی۔ مجھے بس یہی پتہ تھا کہ وہاں تیمور اور اِس کے عزیز و اقارب مدفون ہیں مگر اوپر پہنچنے پر میں نے دو ادھیڑ عمر کی عورتوں کو قرآن خوانی کرتے پایا۔ میں حیرت میں پڑ کر سوچنے لگا کہ آیا اُزبک لوگوں کو تیمور کے ساتھ کوئی عقیدت بھی ہے کیا؟ اس کے بعد ایک معمّر خاتون کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا جو ہر زینے پر اپنے داہنے ہاتھ سے جھاڑتے ہوئے خاک اپنے ماتھے پر ملتی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں اور بھی حیران ہو گیا۔

لیکن اوپر ایک بڑے کمرے (جو مسجد رہی ہوگی) کے ساتھ ہی ایک پنجرے دار کھڑکی کے قریب ایک خوبصورت قبر بھی دیکھی۔ اندر چونکہ بجلی کے بلب روشن تھے اس لئے وہ قبر بھی صاف نظر آ رہی تھی۔قبر پر لگے کتبے کے اوپر بہترین نقش نگاری کی گئی تھی۔اوپر سے ہلکی سی سُوتی چادر بھی ڈالی گئی تھی۔ میں نے فیضی سے اس قبر کے بارے میں پُوچھا لیکن اُسے کوئی علمیت نہ تھی۔ وہاں پر موجود رُوسی سیّاحوں کو بھی کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کس کی قبر ہے۔ البتہ باہر آ کر جب میں نے ایک اُزبک شہری سے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے کہ یہ ''شاہِ قُم'' کی قبر ہے۔

میں نے اُس سے جاننا چاہا کہ وہ شاہِ قُم کون تھے۔ جواب میں اُس نے بتایا کہ وہ ''پیغمبر زاد'' تھے۔

اگر چہ میں اس قدر سمجھ گیا کہ در اصل لوگوں کو اُنہی مدفون بزرگ کے ساتھ عقیدت رہی ہے نہ کہ تیمور کے ساتھ،لیکن یہ بات پھر بھی کُھل نہ سکی کہ یہ ''شاہِ قُم'' آخر تھے کون؟۔

میں سوچتا رہا کہ ''قُم''،تو مسلمان والا نام نہیں ہے۔ممکن ہے کہ اُس کا اصل نام

''قاسم'' ہو یا ''حسام'' یا ''ہِشام'' لیکن دریافت کرتا بھی کس سے۔ ہاں اس قدر سُن لیا کہ وہ ''ابنِ عباس'' تھے جو آنحضرتؐ کے چاچا تھا۔ کشمیر پہنچ کر ایک صاحب نے وضاحت کی کہ حضرت شاہ قاسم دراصل حضرت عباسؓ کے صاحبزادے تھے جو حضرت عباسؓ رسول اللہﷺ کے چاچا تھے۔

وہاں سے نکلنے کے بعد مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ یہ اب صرف آثارِ قدیمہ ہیں لیکن قرونِ وسطیٰ میں یہی وہ عظیم یونیورسٹیاں تھیں جہاں فلسفہ، دینیات، علم نجوم، ریاضی اور سائنس پڑھائے جاتے تھے۔ ان ہی اداروں میں وہ ترجمہ کار حضرات بھی کام کیا کرتے تھے جنہوں نے پرانے وقتوں کی بہترین کتابوں کے مروّجہ زبانوں میں تراجم کئے تھے اور آج کی دُنیا کو علم وعرفان کی روشنی عطا کی۔ اب مگر ان کا کوئی پڑھنے پڑھانے والا نہ تھا اِس لئے نہیں کہ ازبکستان میں اب تعلیم زوال پذیر ہو چکی ہے بلکہ اس لئے کہ اب نئے تقاضوں کے مطابق جدید سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ فیضیؔ کو ان قدیم تاریخی اہمیت کی حامل جگہوں کی بخوبی واقفیت نہ تھی۔ لیوچنکوف کو ان چیزوں میں دلچسپی ہی نہیں تھی اور میں لاچار تھا۔

کہا گیا کہ ''یہ مدرسۂ شیردار ہے''۔ میری سمجھ میں لفظ ''شیردار'' کے معانی نہیں آ سکے۔ فیضیؔ سے پوچھا تو اُسے بھی معلوم نہ تھا۔ ''شاید اس کا اصل نام ''مدرسۂ شیردر'' ہو، میں نے سوچا۔ کیونکہ اس کے دروازے پر دو شیر بنے ہوئے تھے۔ لیکن ایک اسلامی مکتبہ کے دروازے پر بھلا کسی نے شیر کیوں بنائے ہوں گے، ایسا کرنے کی کسی کو اجازت کیسے مل سکتی ہے؟۔ پھر اُوپر سے ان شیروں کے ذرا اوپر طلوع ہوتے ہوئے سورج کو بھی دکھایا گیا ہے۔ جس کے اندر ایک انسان کی شکل بھی بنائی گئی ہے۔ بھلا یہ سب کہاں؟۔

''مجھے بھی کوئی علمیت نہیں''۔ فیضیؔ نے بتایا۔

''کیا یہ انسانی چہرے کے ساتھ سورج کی تصویر کسی ہندوستانی اثر کو ظاہر کرتی ہے''۔ میں نے پوچھا۔

فیضی نے پھر لاعلمیت ظاہر کر دی۔ میں گنگ ہو کر رہ گیا۔

دوسری طرف ''مدرسۂ اُلغ بیگ'' ہے۔ اُلغ بیگ تیمور کی نسل سے تھا۔ وہ علم نجوم کا ایک ماہر رہا ہے۔ اُسی نے وہ رصد گاہ بنوادی ہے جس کو روسی حکومت نے محفوظ کر رکھا ہے۔

مجھے سمرقند میں بدمزگی کا احساس ہوا کیونکہ ہمارے ساتھ فیضی تھا۔ وہ خود کو ایک شاعر کہتا ہے مگر اپنی قومی تاریخ پڑھی ہی نہیں ہے۔ مجھے تاشپوت حمید سے بھی نفرت سی ہوگئی تھی کیونکہ اُسے بھی بخارا میں ایک امیر علی خان کے محل خانے کے علاوہ کسی چیز کا علم ہی نہ تھا۔

<u>میں نے فیضی سے پوچھ لیا:</u>

''کیا تمہیں اُن دنوں کی تاریخ کا کچھ علم نہیں جب سمرقند عالمی ثقافت کا ایک مرکز ہوا کرتا تھا''؟۔

اُس کا جواب بہت ہی مختصر تھا...... ''اسلام یہاں زبردستی اور غلامی لے کر آ گیا تھا''۔

میں نے طنزاً کہا......اور یہاں روشنی لے کر کمیونسٹ انقلاب آ گیا۔تب سے ہی یہاں کی تاریخ بھی شروع ہوگئی ہے''؟۔

وہ اس طنز کو سمجھ پانے سے قاصر ہی رہا اسی لئے بول اُٹھا''۔

''ہاں! ہاں! تب تک یہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا''۔

''آپ کی تاریخ میں کیا کوئی بھی قومی ہیرو نہیں رہا ہے''۔ میں نے پھر پوچھا۔ جواب میں اُس نے بتایا کہ ''ہاں ہاں ایک تھا۔اور وہ تھا علی شیر نوائی''۔ میں سمجھ گیا کہ

یہ علی شیر نوائی کو محض اس وجہ سے ہیرو مانتا ہے کیونکہ انقلابی حکومت نے اُس کو ایک ہیرو تسلیم کیا اور انقلاب کے بعد اُس کے نام پر میوزیم، سڑکیں اور آپیرا ہاوس وغیرہ بنائے گئے تھے۔

سمرقند میں ہم نے کچھ اور بھی مدارس دیکھے۔ اُلغ بیگ رصدگاہ بھی دیکھ لی لیکن صرف دیکھنے کی حد تک۔ محدود رہ کر بھلا کوئی دلچسپی کس طرح بڑھ جاتی ہے۔ میری معلومات میں تو کوئی اضافہ ہو ہی نہیں رہا تھا۔

سہ پہر کو ہم واپس تاشقند چلے آئے۔

<u>ہمارے پاس بھی روپے پیسے ہیں:</u>

''تاشقند ہوٹل'' میں ہماری خاطر کمرے میسّر تھے۔ ہم سیدھے اپنے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے اور سامان رکھ دیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد شام کا کھانا کھانے کے لئے ریستوران کے ہال میں چلے گئے۔

ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔ موسیقی چل رہی تھی۔ اگر چہ آج بھی ہوٹل میں کافی روسی ٹھہرے ہوئے تھے مگر اُزبک بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ موسیقی کے ہر نئے ایٹم پر کوئی روسی مرد اور عورت اُٹھ جاتے اور ناچنے لگتے۔ میں اب یہ ناچ نغمے سُن کر اوب سا گیا تھا۔ مجھے اب اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک اچھا خاصا مرد ایک عورت کو لے کر گلے ملنے کے انداز میں دائیں بائیں ناچنے لگتا۔ کوئی خاص مشقت ہی کرتے نہ دلچسپی ہی دکھاتے۔ یہ محض مشینی قسم کا کام سا لگتا تھا۔ اِدھر سے موسیقی کی صدائیں اِدھر سے کام برائے کام...... بھلا ان ناچنے والوں کو اس طرح کی حرکتوں سے کون سا مزہ آتا ہوگا، کون سی دلچسپی ہوتی ہوگی۔

لیکن یورپ میں اس طرح کی ایک روایت تو رہی ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے۔ اس طرح کے ادب میں بہت سی رقاصاؤں کی تعریفیں بھی ہوتی رہی ہیں۔

اس میں مہارت اُن اداکاراؤں کے لئے تعریفوں کی باعث بھی بنتی رہی ہے۔ یہ سب بے وجہ بھی تو نہیں چلتا رہا ہے؟ مجھے اس میں کوئی دلچسپی شاید اس لئے نہیں ہے کہ یہ ہماری روایت میں نہیں ہے۔

روسی ریستورانوں میں کھانا بھی بہت انتظار کروا کر پروسا جاتا ہے۔ وہاں جلدی روا نہیں سمجھی جاتی کیونکہ جیسا کہ بیرہ نے بتا بھی دیا، شام کا کھانا کھانے میں جلد بازی نہیں۔ انسان دن بھر کا تھکا ہارا ہوتا ہے۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ آرام کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے تک کھایا جائے۔

مگر ہمارے سامنے ہی ایک میز پر شور سا اُٹھا۔ اُس میز پر دو ہی اُزبک مرد گاہک بیٹھے تھے۔ اُن کا کسی نے آرڈر نہیں لیا تھا۔ اس پر اُن کو بہت غصہّ آ گیا تھا۔ انہوں نے بیرے بلوائے اور اُن کو ڈانٹا۔ اُن میں سے ایک شخص نے اپنی جیب سے بٹوہ نکال کر بھی دکھایا۔ شاید وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ کوئی مُفت خور نہیں ہے۔ ''ہمارے پاس بھی پیسے ہیں''۔

زنانہ ویٹر مسکرا دی۔ معافی طلب کرتے ہوئے آرڈر لیا۔ میں اندر ہی اندر سوچ رہا تھا......''یہ نو دولتیہ ہونے کا اظہار ہے۔ اس آدمی کے اندر ابھی تک صدیوں پرانا احساسِ کمتری موجود ہے''۔

کھانا کھا کر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔

●●●

جموں و کشمیر میں معاصر اردو انشائیہ

(حصہ اوّل)

☆......وزیر آغا

انشائیہ کیا ہے؟

انشائیہ کیا ہے؟ بادی النظر میں انشائیہ کی حدود کو متعین کرنا ایک خاصا کٹھن کام ہے کیونکہ نہ صرف تاریخی اعتبار سے انشائیہ کے مفہوم اور ہیئت میں کئی ایک انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں بلکہ ہر انشائیہ کیا بہ لحاظ مواد اور کیا بہ لحاظ تکنیک ایک جداگانہ کیفیت کا حامل ہے۔ تاریخی اعتبار سے بیکن اور لیمب کے طریق کار میں اس قدر تضاد ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مضامین کو ایک ہی زمرے میں شامل کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح دور جدید کے بیشتر لکھنے والوں نے انشائیہ کے سلسلے میں کافی سے زیادہ آزادی سے کام لیا ہے اور ناقد کے لئے انشائیہ کے مقتضیات اور امتیازی محاسن کو علاحدہ کرکے دکھانا مشکل ہو گیا ہے۔ تاہم غائر نظر سے دیکھنے پر انشائیہ کی متنوع کیفیات اور ابلاغ و اظہار کے مختلف سانچوں کے پس پشت ایک علاحدہ صنف ادب کے نقوش واضح طور پر ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم ذرا کوشش سے انشائیہ کی حدود کو متعین اور محاسن کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔

ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصناف ادب سے ممیّز کرتی ہے اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں رد و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لئے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کرکے ایک غیر رسمی طریقِ کار اختیار کرے

اوراپنے شخصی ردعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرے۔

دوسرے لفظوں میں تنقید یا تفسیر کا خالق اس افسر کی طرح ہے جو چست اور تنگ سا لباس زیب تن کئے دفتری قواعد وضوابط کے تحت اپنی کرسی پر بیٹھا، احتساب اور تجزیئے کے جملہ مراحل سے گزرتا ہے اورانشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہوکر اور حقہ کی نے ہاتھ میں لئے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اور اس کے تحت انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریقِ کار کی بجائے ایک غیر رسمی انداز اختیار کرتا ہے بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد وتبصرے سے کام لینے کی بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردعمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

انشائیہ کے خالق کے پاس کئی ایک ایسی کہنے کی باتیں ہوتی ہیں جنہیں وہ آپ تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔اس طور کہ آپ فی الفور اس کے دائرہ احباب میں شامل ہوجاتے اور اس کے دل تک رسائی پا لیتے ہیں۔شاید اسے کوئی واقعہ بیان کرنا ہوتا ہے، کسی ''ذہنی کیفیت'' پر سے نقاب اٹھانا یا محض زندگی کے مظاہر کو ایک نئے زاویئے سے پیش کرنا ہوتا ہے اور وہ اس صنف ادب کا سہارا لے کر اپنی شخصیت یا ذات کے کسی نہ کسی گوشے کو عریاں کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ بنیادی طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔اس کے لئے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے اور اس کے عمل میں نشتریت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ محض ایک 'سہارے' کا کام دیتی ہے۔اسی طرح انشائیہ کا خالق

محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا کیونکہ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے اور بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی۔

اس کے برعکس ایک اچھا انشائیہ پڑھنے کے دوران آپ شاید حظ، مزاح، تعجب، طنز، اکتسابِ علم اور تخیل کی سبک روی ایسے بہت سے مراحل سے روشناس ہوں لیکن انشائیہ کے خاتمے پر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے زندگی کے کسی تاریک گوشے پر روشنی کا ایک نیا پرتو دیکھا ہے اور آپ زندگی کی عام سطح سے اوپر اٹھ آئے ہیں۔ کشادگی اور رفعت کا یہ احساس ایک ایسا متاعِ گراں بہا ہے جو نہ صرف آپ کو مسرت بہم پہنچاتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت میں بھی کشادگی اور رفعت پیدا کر دیتا ہے۔

انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی عدم تکمیل ہے۔ ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ موضوع زیر بحث کے تمام تر پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے اور تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے اپنے نقطہ نظر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ مقالہ ایک مکمل و اکمل صورت اختیار کر لے، وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جن کا بظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مقالے کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا (Loose) ہوتا ہے اور اس میں مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا اور انشائیہ کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انشائیہ لکھنے والے نے موضوع کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو اس کے شخصی ردعمل سے اثر پذیر تھے اور جن کی منفرد کیفیت اس بات کی متقاضی تھی کہ مصنف ان کو ناظر تک پہنچانے کی سعی کرتا۔ اس مقام پر ایک انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری

مماثلت کا احساس بھی ہوتا ہے۔غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے تمام تر پہلوؤں کو ناظر کے فکر وادراک کے لئے نامکمل صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی حال انشائیہ کا ہے کہ اس میں موضوع کے صرف چند ایک انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اس سے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور نامکمل حالت میں رہ جاتے ہیں۔

بنیادی طور پر انشائیہ لکھنے والے کا مقصد قاری کی سوچ بچار کے راستہ کو ہموار کرنا ہے۔ بے شک وہ اپنے موضوع کے بیان میں صرف واردات اور تجربات اور اپنے ذاتی ردعمل کے اظہار تک ہی اپنی مساعی کو محدود رکھتا ہے، تاہم اس کے پیش نظر مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کو سوچنے پر مائل کرے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعہ کے بعد کتاب کو چند لحظوں کے لئے بند کر دیں گے اور انشائیہ میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود بھی سوچتے اور محظوظ ہوتے چلے جائیں گے۔

انشائیہ نگار کی اس روش کا نتیجہ انشائیہ کی وہ مخصوص صورت ہے جو اسے دوسری اصناف ادب سے ممیّز کرتی ہے۔یعنی ایک انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علاحدہ نظر آتا ہے۔سانیٹ کی طرح انشائیہ کا بھی ایک مختصر سا میدان ہے، جس کے اندر انشائیہ لکھنے والا آپ کو تصویر کا ایک مخصوص رخ دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ جذبات واحساسات اور تخیلات میں کانٹ چھانٹ اور کفایت(Economy) کا قائل نہ ہو، اس کے لیے چند لفظوں میں موضوع کی سب سے نوکیلی کیفیات کو پیش کرنا مشکل ہوگا۔لیکن اختصار کی یہ خصوصیت اس بات کے تابع ہے کہ انشائیہ کا پس منظر کس قدر شاداب یا بے آب وگیاہ ہے۔

چنانچہ بقول ہڈسن اگر انشائیہ لکھنے والے نے اس لئے اختصار سے کام لیا

ہے کہ اس کے پاس کہنے کی باتیں ہی گنتی میں کم ہیں اور اس کے تجربات اور محسوسات تعداد اور شدت میں نہ ہونے کے برابر ہیں تو اس کا لکھا ہوا انشائیہ یقیناً انشائیہ کے معیار پر پورا نہیں اترے گا۔ اس کے برعکس اگر انشائیہ لکھنے والے کا ذہن زرخیز ہے اور اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن اس نے انشائیہ کی محدود سی دنیا میں اپنے احساسات اور تخیلات کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے تو اس کا یہ انشائیہ یقیناً ایک قابل قدر چیز ہوگا اور ناظرین کو وہ تمام کیفیات مہیا کرے گا جو انشائیہ سے مخصوص ہیں۔

ایک آخری چیز جسے انشائیہ کا امتیازی وصف سمجھنا چاہئے اس کی 'تازگی' ہے۔ یوں تو تازگی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے بغیر کوئی بھی صنف ادب فن کے اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچ سکتی، تاہم شاید انشائیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں نہ صرف تازگی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ جس کی ذرا سی کمی بھی انشائیہ کو اس کے فنی مقام سے نیچے گرا دیتی ہے۔ تازگی سے مراد محض اظہار و ابلاغ کی تازگی نہیں کیونکہ یہ چیز تو بہرحال انشائیہ میں موجود ہونی چاہئے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطہ نظر کا وہ انوکھا پن ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا ازسرنو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ عام طور پر ہم سب زندگی کے مظاہر کو ہر روز دیکھتے دیکھتے ان کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان کے بہت سے انوکھے پہلو نظر ہی نہیں آتے اور زندگی ہمارے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب محض ہمارے ردعمل کا قصور ہے، ورنہ زندگی کے دامن میں نئے پہلوؤں کے قحط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انشائیہ لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لحظہ کے لئے روک کر زندگی کے عام مظاہر کے ایسے پہلو دکھاتا ہے جنہیں ہماری نظروں نے اپنی گرفت میں لیا ہی

نہیں تھا اور جو ہمارے لئے گویا موجود ہی نہیں تھے۔ اس مقام پر ایک انشائیہ لکھنے والے اور ایک غیر ملکی سیاح میں قریبی مماثلت بھی دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح ایک سیاح کو کسی نئے ملک کی بہت سی ایسی انوکھی باتیں فوراً معلوم ہو جاتی ہیں جو اہلِ وطن کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں، اسی طرح ایک انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام مظاہر کے ان تازہ پہلوؤں کو فوراً دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے باعث ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

زندگی کی ان انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کے لئے انشائیہ کا خالق کئی ایک طریق کار اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ بلندی پر سے زندگی کے بظاہر اعلیٰ اور بلند مظاہر کی پستی کا ایک تصور قائم کرتا ہے یا ایک شریر آئینے میں سے ماحول کا بگڑا ہوا منظر دکھاتا ہے یا پھر زندگی کے تسلیم شدہ قواعد اور ضوابط پر نظر ثانی سے ہمیں چونکانے لگتا ہے۔ بہرصورت اس کا کام تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا اور ہمیں عادت اور تکرار کے حصار سے لحظہ بھر کے لئے آزادی دلانا ہے تاکہ ہم غیر جانبدارانہ طریق سے زندگی کے روشن اور تاریک رخ کا جائزہ لے سکیں۔ واضح رہے کہ انشائیہ کا خالق کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کوئی مکمل نقطہ نظر پیش کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کام محض ایک عام چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے۔

مثال کے طور پر بعض انگریزی مضامین کے عنوانات دیکھئے کہ کس طرح انشائیہ لکھنے والے نے زندگی کی عام ڈگر سے ہٹ کر زندگی کے دیوانہ وار بڑھتے ہوئے قافلے پر ایک نظر ڈالی ہے اور ایک انوکھی صنف ادب کا سہارا لے کر ناظر کو بھی اپنے تجربے میں شامل کرلیا ہے۔ یہ چند عنوانات دیکھئے:

"IN PRAISE OF MISTAKES "

(ROBETLYND)

"ON THE PLEASURE OF NO LONGER BEING YOUNG"

(CHESTERTON)

"WHY DISTANT OBJECTS PLEASE"

(HAZLITT)

"ON THE IGNORANCE OF THE LEARNED"

(HAZLITT)

یہ عنوانات اس بات پر دال ہیں کہ انشائیہ کا خالق اپنے موضوع کے انتخاب میں جدت سے کام لیتا ہے۔ تاہم بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی کیونکہ انشائیہ کا خالق مضمون کے تار پود میں بھی ایک خوشگوار تازگی کو برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ کے مطالعہ کے بعد ناظر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ چند لمحوں میں حظ، تعجب اور مسرت کی بہت سی منازل طے کر آیا ہے۔ غور کیجئے تو انشائیہ کی امتیازی صورت ایک بڑی حد تک اسی خوشگوار تازگی کی رہینِ منت ہے۔

انشائیہ کے بنیادی محاسن کو اجاگر کرنے کے بعد قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اردو میں انشائیہ کی صنف کے بارے میں تحقیق کی جائے تاکہ معلوم ہوسکے کہ اردو انشائیہ نے اب تک کیا ترقی کی ہے اور مستقبل میں اس کے فروغ وارتقا کے کیا امکانات ہیں لیکن جب اردو انشائیہ کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ کہ بعض نقادوں نے اردو انشائیہ کے تاریخی اور تدریجی ارتقا کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں انشائیہ کے وجود کو ثابت کرنے کی دھن میں انہوں نے کسی قابل قدر تحقیقی سرگرمی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ ہر قسم کے طنزیہ مضامین یا غیر شخصی سنجیدہ نگارشات کو انشائیہ کا نام دے کر محض خود کو تسلی دینے کی سعی کی ہے۔ فی الواقعہ اردو میں تاحال انشائیہ کی صنف بطور ایک

تحریک کے معرض وجود میں نہیں آئی۔

سرسید احمد خاں کے بعض مضامین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم انہیں انشائیہ کے تحت شمار کر سکتے ہیں لیکن میری دانست میں ایسا کرنا درست نہیں کیونکہ سرسید کے بیشتر مضامین میں ایک تو سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے جو انشائیہ میں نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے انداز بیان میں وہ شگفتگی نہیں جو انشائیہ کا بنیادی وصف ہے۔ تیسرے ان مضامین میں سرسید نے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کی بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ سرسید کے بعد انشائیہ کے ضمن میں سجاد حیدر یلدرم اور خواجہ حسن نظامی کے نام عام طور سے پیش کئے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اہل قلم نے انشائیہ نویسی کی صلاحیت کے باوصف اس صنف ادب کا کوئی صحیح نمونہ پیش نہیں کیا۔ سجاد حیدر یلدرم کا مضمون 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' یقیناً انشائیہ کے زمرے میں آتا ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مضمون اوریجنل نہیں بلکہ ماخوذ ہے۔ سجاد حیدر کے بعض دوسرے مضامین میں کہیں کہیں انشائیہ نویسی کے تیور ضرور ملتے ہیں لیکن ان میں سے شاید کوئی ایک مضمون بھی ایسا نہیں ہے جسے انشائیہ کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

خواجہ حسن نظامی کے ہاں بھی انشائیہ نویسی کا رجحان تھا اور وہ ایک انشائیہ نویس کی طرح زندگی کے بظاہر غیر اہم موضوعات پر قلم اٹھانے پر بھی مائل تھے۔ (مثلاً مچھر وغیرہ پر ان کے مضامین) لیکن ان تمام مضامین میں انشائیہ کی دو اہم خصوصیات کا فقدان ہے۔ ایک تو ان مضامین کا لہجہ انشائیہ کے لہجے سے ہم آہنگ نہیں۔ دوسرے ان میں مصنف کی اپنی ذات یا شخصیت اجاگر نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ مضامین انشائیہ کے تحت شمار نہیں ہو سکتے۔ فرحت اللہ بیگ کے ہاں وہ بہت سی باتیں ملتی ہیں جو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار پا چکی ہیں۔ مثلاً شگفتہ انداز نگارش اور موضوع سے مصنف کا گہرا

تعلق وغیرہ،لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرحت اللہ بیگ کے ہاں بھی دوسرے کرداروں کی عکاسی یا واقعات کا بیان ہی انشائیہ کا غالب ترین عنصر ہے اور اسی لئے وہ بھی اپنی ذات کے کسی گوشے کی عریاں نہیں کر سکے۔''نذیر احمد کی کہانی'' اور پھول والوں کی سیر اردو ادب میں زندہ رہنے والی تخلیقات ضرور ہیں لیکن انہیں انشائیہ کے طور پر پیش کرنا بے حد مشکل ہے۔

جدید دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ''غبار خاطر'' کے بعض مضامین انشائیہ سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً چڑیوں کے سلسلے میں مولانا موصوف کے تجربات یا قہوہ کے بارے میں ان کا مخصوص ردعمل۔ان مضامین میں پُرشکوہ اسلوب نگارش کی بجائے مولانا نے ایک ایسا ہلکا پھلکا اور شگفتہ سٹائل اختیار کیا ہے جو انشائیہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔افسوس کہ مولانا نے اپنے اس مخصوص انداز میں کچھ زیادہ مضامین تحریر نہیں کئے۔اگر وہ اس صنف کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوتے اور اپنے مضامین سے انکشاف ذات کا کام بھی لیتے تو یقیناً انہیں انشائیہ کے ضمن میں ایک امتیازی مقام حاصل ہوتا۔

جدید دور میں مضمون نگاری کو بے شک اہمیت ملی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انشائیہ کی بجائے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ پطرس کے تقریباً سارے مضامین مزاحیہ ہیں اور کنہیالال کپور کے بیشتر مضامین طنزیہ ہیں لیکن ان دونوں کے ہاں شاید ایک مضمون بھی ایسا نہیں ہے جسے انشائیہ کے مزاج کا حامل کہا جاسکے۔ رشید احمد صدیقی کے ہاں اگرچہ طنزیہ انداز غالب ہے اور ان کے مزاح کی اساس ایک حد تک لفظی الٹ پھیر ہی پر قائم ہے، تاہم ان کے مضامین میں کہیں کہیں انشائیہ کے تیور ضرور مل جاتے ہیں۔ پھر بھی ہم انہیں ''انشائیہ نویس'' تو یقیناً نہیں کہہ سکتے۔

کرشن چندر کی کتاب ''ہوائی قلعے'' کے بعض مضامین انشائیہ سے قریب ہیں لیکن شاید یہ زمانہ ہی طنز واحتساب کا تھا کہ کرشن چندر نے خود کو اپنی ذات کی بجائے خارجی ناہمواریوں کی طرف متوجہ کیا اور اسی لئے انشائیہ تخلیق نہیں کر پائے۔ان کے مقابلے میں فلک پیما کے ہاں انکشاف ذات کا عنصر نسبتاً زیادہ ہے اوران پر انگریزی انشائیہ کا اثر بھی ہے۔ مگر بدقسمتی سے فلک پیما کے بیشتر مضامین مختصر نوٹس (Notes) کی صورت اختیار کر گئے ہیں یا مکالمے کے انداز میں ڈھل گئے ہیں۔ چنانچہ ان مضامین کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔

جدید ترین دور میں انشائیہ کی طرف سنجیدگی سے توجہ ہونے لگی ہے۔ ڈاکٹر داود رہبر کے بعض مضامین بالخصوص ''لمحے'' اور ''چمن آرائی'' کو انشائیہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔دوسرے مضامین میں ڈاکٹر صاحب نے غواصی کی بجائے بیان اور مشاہدے پر نسبتاً زیادہ توجہ صرف کی ہے۔اس سے انشائیہ کی بجائے افسانے کا رنگ زیادہ شوخ ہوا ہے۔مشکور حسین نے بھی انشائیہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔اپنے مضامین میں انہوں نے انشائیہ کے بنیادی محاسن کو پیش نظر ضرور رکھا ہے لیکن وہ اپنے خیالات کے اظہار میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔دوسرے ان کے ہاں ایک نمایاں اصلاحی رنگ بھی آ گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں انشائیہ کے لئے مضر ہیں۔

پچھلے چند برس میں انشائیہ نویسی کے سلسلے میں کچھ اور نام بھی سامنے آئے ہیں۔مثلاً مشتاق قمر نے ''چھڑی''، ''لیونا نہم''، ''بیٹھنا'' اور ''آئس کریم کھانا'' لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ آگے چل کر انشائیہ نگار کے روپ میں ابھرنے والے ہیں۔ جمیل آذر کا انشائیہ ''پک نک'' اور محمود شام کا انشائیہ ''بے ہمتی'' بھی صحیح معنوں میں انشائیہ ہیں اور ان دونوں نے انشائیہ کے امتیازی محاسن کو اچھی طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اسی طرح غلام جیلانی اصغر بھی ایک نہایت عمدہ انشائیہ ''بستر پر لیٹنا'' لکھ کر اس صف

میں شامل ہو چکے ہیں۔

ان دنوں انشائیہ سے دلچسپی کا ایک اہم ثبوت یہ ہے کہ انشائیوں کے مجموعے پیش کرنے کا رجحان بھی وجود میں آ گیا ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر وحید قریشی نے انشائیوں کا ایک نہایت ضخیم مجموعہ بڑی محنت سے مرتب کیا مگر انشائیے کے نام سے اس میں ہر طرح کے معیاری اور غیر معیاری طنزیہ، مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین جمع کر دیئے۔ دراصل جب تک انشائیہ کے امتیازی محاسن کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھا جائے، اس قسم کے مجموعوں کو پیش کرنے سے انشائیہ کی تحریک کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچنے کا زیادہ احتمال ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے سنجیدگی سے انشائیہ کا مطالعہ کریں۔ اس کی حدود متعین کریں، اسے ''پہچانیں'' اور پھر اس میزان پر ہر اس ادبی تخلیق کو تولنے کی کوشش کریں جسے بطور انشائیہ پیش کیا جائے۔ میری دانست میں انشائیہ کو فروغ دینے کا یہی ایک احسن طریق ہے۔

پس نوشت:

طنز یا مزاح انشائیہ کی ایک اضافی خرابی ہے، اس کا جز ولاینفک ہرگز نہیں۔ چنانچہ یورپی ادب میں ہمیں بہت سے اعلیٰ درجے کے ایسے انشائیے ملتے ہیں جن میں خیال اور اسلوب کی تازگی ہی سب کچھ ہے لیکن جن میں طنز یا مزاح سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں کہیں انشائیہ میں طنز یا مزاح مقصود بالذات قرار پاتا ہے، انشائیہ کا مزاج ہی تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ انکشاف ذات کے عمل کو تج کر ایک محتسب یا مسخرے کے طریق کار کو اپنا لیتا ہے۔ یہاں ذرا توقف کیجئے تاکہ میں بعض اصولی اور بنیادی باتوں کی طرف آپ کو متوجہ کر سکوں۔

طنز، زندگی کی ناہمواریوں کے احساس سے جنم لیتی ہے اور ناہمواریاں صرف اس وقت نظر کی گرفت میں آتی ہیں جب آپ عام ذہنی روش سے اوپر اٹھ کر ان

کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ طنز نگار وہ شخص ہے جو آپ کو فراز سے مخاطب کرتا ہے اور چونکہ وہ ایک بلند جگہ پر کھڑا ہے اور خود کو ان ناہمواریوں سے محفوظ سمجھتا ہے جنہیں وہ مذاق کا نشانہ بناتا ہے، اس لئے اس کی ہنسی میں جذبہ افتخار اور احساس برتری ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ دوسری طرف مزاح نگار نشیب کے اس مقام پر کھڑا ہے جہاں وہ خود ناہمواریوں سے ہم آہنگ ہے اور اس لئے قدرتی طور پر اس کا ردعمل ہمدردی اور محبت سے مملو ہے لیکن ان دونوں کے برعکس انشائیہ نگار نہ تو آپ کو فراز سے مخاطب کرتا ہے اور نہ نشیب سے، وہ تو آپ سے ایک ہموار سطح پر ہم کلام ہوتا ہے۔

بے شک طنز و مزاح کا استعمال اس کے لئے شجرِ ممنوعہ نہیں ہے اور وہ اپنے مرکزی نقطے (ہموار سطح) سے لحظہ بھر کے لئے اوپر اور نیچے بھی جاتا ہے تاہم وہ ہر بار اپنے مرکزی نقطے کو لوٹ ضرور آتا ہے۔ دوسری طرف طنز نگار فراز کے نقطے سے ایک قدم نیچے نہیں اترتا اور مزاح نگار نشیب کے نقطے سے ایک قدم اوپر نہیں جاتا۔ اپنے اپنے مرکزی نقطہ سے ذرا سی جنبش بھی ان کے لئے مہلک ہے لیکن انشائیہ نگار نسبتاً آزاد ہے اور دونوں اطرف میں آجا سکتا ہے تاہم خود انشائیہ نگار کے لئے اپنے مرکزی نقطے کو ترک کر کے کسی اور نقطے کو اپنا لینا موت کو آواز دینا ہے۔ پس انشائیہ اور طنزیہ یا مزاحیہ مضمون میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اور جو لوگ انشائیہ کو پہچانتے ہیں، اسے کسی اور صنف سے خلط ملط کرنے کے کبھی مرتکب نہیں ہوتے۔

●●●

☆:......ڈاکٹر سلیم اختر

انشائیہ ......مبادیات

انشائیہ پر مختلف نقادوں کی تحریروں سے اس کی تکنیک کے بارے میں بہت کچھ پڑھ کر مندرجہ ذیل امور ذہن میں ابھرتے ہیں:

ا:......اختصار

۲:......غیر رسمی طریقِ کار

۳:......اسلوب کی شگفتگی

۴:......عدمِ تکمیل کا احساس

۵:......شخصی نقطۂ نظر اور

۶:......عنوانات کا موضوع یا نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نہ ہونا

گویا ان تمام اجزا کے حسین اور فنکارانہ امتزاج سے جنم لینے والا فن پارہ انشائیہ ہوگا۔ انشائیہ تقلیل نفس سے پہلے کی چیز ہے لیکن انشائیہ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اکثر اس نفسی مریض کا خیال بھی آتا ہے جو تحلیلِ نفسی کے معالج کے سامنے ایک آرام دہ کوچ یا دیوان پر لیٹا ہوا اپنے اُلٹے سیدھے خیالات کا ربط یا بے ربطی کے ساتھ بے تکلف اظہار کئے جا رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انشائیہ نگار کوئی ذہنی مریض ہوتا ہے یا انشائیہ ذہن کے مریضانہ رجحانات کی پیداوار ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ انشائیہ قاری کے ذہن میں مریضانہ رجحانات کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔

تحلیلِ نفسی کا کلاسیکی انداز یہ ہے کہ مریض آرام اور سکون سے معالج کے

سامنے کوچ یا گدے، ورنہ کسی آرام دہ بستر پر لیٹا لیٹا معالج کے کہنے کے موجب وہ سب کچھ ظاہر کرتا چلا جاتا ہے جو اس کے ذہن میں بے ساختہ آرہا ہے۔ آغاز بالعموم گزری ہوئی شب کے خواب سے ہوتا ہے یا ایسے ہی کسی اور قصے یا واقعہ ہے۔ تلازمۂ خیال کے باعث چراغ سے چراغ جلنا شروع ہوتا ہے، ایک بات سے دوسری بات نکلتی ہے، دوسری سے تیسری بات کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اس کی تمام باتیں بے ربط اور بے مقصد معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان غیر مربوط غیر منطقی بلکہ لایعنی باتوں اور ظاہراً احمقانہ باتوں سے بھی بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پسِ پردہ لاشعور کا طوطی بولتا ہے کوئی پنہاں مقصد، کوئی ناآسودہ خواہش سامنے آجاتی ہے، اسے ہڈسن نے ''داخلیت'' سے تعبیر کیا ہے اور لارڈ برکن ہیڈ ''افشائے ذات'' کہتے ہیں۔ یوں نفسیات میں علاحدہ سے اس کی کوئی واضح اصطلاح نہیں ملتی، لیکن مریض اور معالج کی ۵۰ منٹ کی ایسی ملاقات کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مریض کی شخصیت میں جھانکا جائے، مریض کی اُکھڑی اُکھڑی باتوں اور عام انداز گفتگو سے ہٹا ہوا طریقۂ گفتار بہت سے گوشوں پر سے پردہ ہٹا دیتا ہے۔ انشائیہ کا بھی کچھ ایسا ہی مقصد نظر آتا ہے۔ لارڈ برکن ہیڈ کی طرف رجوع کیجئے:-

> ''اس عنوان (ایسّے) سے دراصل اس کی کیا مراد تھی؟ میرے خیال میں تو
> ماؤنٹین اپنی ان تحریریں کو نثر نگاری کی سعی قرار دیتے ہوئے دراصل ذات
> کے انکشاف کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔''

واضح رہے کہ ماؤنٹین نے خود اپنے ان انشائیوں کو بھی مصنف کے ساتھ ''ہم وجود'' قرار دیا تھا۔

بہرنوع اپنی دوسری خصوصیات کے لحاظ سے انشائیہ تحلیل نفسی کی اس تکنیک سے مشابہ ہے جو انکشافِ ذات کے لئے کام میں لائی جاتی ہے۔ سب سے پہلے

اختصار کے وصف کو لیجئے۔ پہلے فرانسیسی انشائیہ نگار ماؤنتین (۹۲-۱۵۳۲ء) کی ایک تالیف سامنے آتی ہے جو ۱۵۸۰ء میں طبع ہوئی اور اسے ''ایسّے'' کا عنوان دیا گیا۔ لفظی معنی ''سعی''، یعنی ادبی کاوش سمجھ لیجئے۔ اس کوشش سے لے کر انگلستان کے بیکن یا اپنے ہاں ڈاکٹر وزیر آغا اور نظیر صدیقی تک سب ہی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انشائیہ کی روح اختصار میں پوشیدہ ہے۔ بیکن نے دس انشائیوں پر مشتمل ۱۵۹۳ء میں ایک مجموعہ شائع کیا۔ یہ تحریریں اتنی مختصر ہیں کہ کسی طویل مقالے کے نکات معلوم ہوتے ہیں۔ یوں بعد میں طویل انشائیے بھی لکھے گئے اور اب اختصار کا معاملہ ایک نزاعی مسئلہ بن چکا ہے تاہم بیشتر اہلِ نظر اختصار پسندی کی طرف مائل ہیں۔

انشائیہ نگار نے اپنی ذات کو ہی موضوع بنایا ہے مگر اسے بھی احساس ہے کہ وہ اتنی عظیم شخصیت نہیں کہ قاری اس کی شخصیت پر ایک دم ریجھ جائے نہ اس کی عہد بہ عہد نشو ونما میں اسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسے یہ احساس بھی رہتا ہے کہ اس نے تکمیل ذات کے لیے کم از کم مادی لحاظ سے کوئی ایسا کارِ نمایاں انجام نہیں دیا کہ ساری دنیا اس کی مداح ہو جائے اور اس بات میں دلچسپی لے کر قطرہ کے گہر ہونے تک دیکھتے رہیں اور ان مراحل کو اپنے لئے بھی سبق آموز سمجھ لیں کہ اس نے کسی منزل تک پہنچنے کے لئے بہت سے پُر پیچ مراحل طے کئے اور زمانے نے بڑی چھان پھٹک بھی کی تھی۔

اس تمام قصے سے قاری کو اتنا لگاؤ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انشائیہ خود نوشت سوانح عمری بھی نہیں......اور نہ انشائیہ نگار اپنے حالات زیست ہی قلم بند کرتا ہے مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ وہ عظیم نہ ہونے کے باوجود اپنے خیالات، احساسات اور میلانات سے دوسروں کو آگاہ ضرور کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے اس کی ذات میں کسی قدر دلچسپی لیتے ہیں، یہ انشائیہ نگار کی ہنرمندی ہے مگر سوال یہی ہے کہ انشائیہ نگار دوسروں تک اپنی ذات کو کیوں پہچانا چاہتا ہے؟

فرد میں بالعموم اور فنکار میں بالخصوص کچھ نہ کچھ نرگسیت ضرور ہوتی ہے۔ میں اس اصطلاح کو اس کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کر رہا کیونکہ وہ تو الفتِ ذات کے مریضانہ رجحان کے لئے مخصوص ہے یہاں جو کیفیت پیش نظر ہے وہ صرف الفتِ ذات ہی نہیں یا کم از کم اس کی مریضانہ کیفیت نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔ غرض کچھ بھی کیا جائے یہ تشہیرِ ذات کا پہلو ہے اور وہ ہر شخص کی انا کو بہت تسکین دیتی ہے۔ اس کا اظہار بالواسطہ یا بلاواسطہ دونوں طرح ہوسکتا ہے۔ بالواسطہ صورت میں انشائیہ نگار شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ذات کو موضوع بناتا ہے۔ اس ضمن میں چارلس لیمب کی مثال کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکی ہے جس نے ریشم کے کیڑے کی مانند خود کو اپنی ذات کے خول میں بند رکھا تھا۔ وہ قاری کو ایک معتبر و غم خوار دوست سمجھتا تھا بلکہ گوشِ ہمدرد کا حامل سمجھتا تھا اس لئے وہ ذاتی حالات اور نجی کوائف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ انشائیہ نگار کا یہ اندازِ گفتگو ''اعترافات'' کی قسم سے نہیں ہوتا، کیوں کہ اعترافات کے ساتھ جرم و گناہ یا کم از کم ان کا احساس ضرور وابستہ ہوتا ہے، مگر ایسا نہ ہونے پر بھی وہ اپنی شخصیت کے ان گوشوں پر سے ضرور نقاب اٹھاتا ہے جو معاشرہ میں تحریمات (ٹیبوز) مانے جاتے ہیں لیکن انشائیہ نگار کو کسی سنسنی یا چونکا دینے والی بات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذات کے بارے میں گفتگو کرنے کے باوجود اسے شخصیت کے مجرد رجحانات کو منظر عام پر لانے کی ضرورت نہیں۔ رُوسو کے اعترافات کی مانند یعنی یہ کہ وہ تشہیرِ ذات تو کرتا ہے مگر مہمات کے تذکرے میں لذتیت اُبھارنے کی ضرورت سمجھتا ہے نہ وہ اس کا موضوع ہی ہے۔ جیسا ''کاسانووا'' کے اعترافات میں ہم پاتے ہیں۔

انگریزی میں بعض نقادوں مثلاً ہیڈرک وغیرہ نے ایسے انشائیے کے لئے ''شخصی'' کی بے تکلف کی اصطلاح برتی ہے۔ اس قسم کی تحریروں میں انشائیہ نگار اپنی

ذات کومرکز بناتا ہے۔ اردو میں میرے خیال میں نظیر صدیقی کی کتاب شہرت کی خاطر ایک ایسی ہی چیز ہے، چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:۔

''انشائیہ جیسی شخصی صنف ادب میں ''میں'' کے مظاہرے ہی کے لئے عالم وجود میں آئی ہے۔''

انشائیہ میں اگر ''میں'' کو پھیلایا جائے تو جملہ ادب وفن میں قلم کار کی ''میں'' کا ظہور بعض پیچیدہ نفسی عوامل کا مرہون منت ہوتا ہے۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ افراد میں بالعموم اور فنکاروں میں بالخصوص ایک خاص قسم کا احساس محرومی پایا جاتا ہے۔ یہ احساس متنوع عوامل کا پیدا کردہ ہوسکتا ہے اور مختلف افراد میں ردِعمل میں یکساں نہیں ہوتا، لیکن اتنا ضروری ہے کہ سبھی اس ناتمامی کے احساس سے چھٹکارا پانے کی خاطر کسی آدرش کو اپنا لیتے ہیں جو مقصدِ حیات بھی ہوسکتا ہے اور نظریۂ حیات بھی۔ یہ تعمیری بھی ہوسکتا ہے اور تخریبی بھی۔ اس احساس کے تحت ان کے خواب ہائے بیداری اور ذہنی طلسم کاری مل کر ایک ایسے ذہنی ہیولیٰ کو جنم دیتے ہیں جسے وہ ارفع و برتر اور افضل سمجھتے ہیں اور پھر اس سے تطبیق کے خواہاں بھی رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے لئے برتر وجود کا تصور تخلیق کرتے ہوئے نفسی ارتقا کے لئے اسے ایک رہنما ستارہ قرار دیتے ہیں۔ اس رجحان کے باعث وہ خود کو ایک خاص رنگ میں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا فنکار اپنی شخصیت کیلئے شعوری یا لاشعوری طور پر ایسے خدوخال وضع کر لیتا ہے جو مستعار ہوتے ہیں مگر اس کے آئیڈیل ضرور ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی کسی ادب پارے یا فن پارے میں بلاواسطہ طور سے اظہار ذات در آئے تو وہ ذات اصلی خدو خال کی نمائندہ نہ ہوگی جبکہ خواب ہائے بیداری اور ذہنی طلسم کاریوں سے بنی ہوگی۔

اس سلسلے میں مصوروں کی ''خود شبیہیں'' بھی آتی ہیں۔ انشائیوں کے ''قلمی چہرے'' کی مانند ان میں بھی فنکار اپنی موقلمی تصویر ہی پیش کرتا ہے۔ تقریباً تمام

عظیم مصوروں نے اپنی تصاویر بنائی ہیں اور ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو اپنے چہرے پر کچھ ایسا تاثر دے جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے ناقابل فہم بھی ہوسکتا ہے، مگر یہ فنی خامی نہ ہوگی کیونکہ مصور خود کو جیسا سمجھتا ہے ویسا ہی رنگوں اور خطوں کی ہم آہنگی سے پیش کر دیتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال نقاش پال گاگین (فرانس) کی وہ تصویر ہے جس میں اس نے اپنے چہرے پر عجیب کربناک تاثر پیدا کرنے کے ساتھ پسِ منظر میں مسیح مصلوب سے اپنی دکھ بھری زندگی کا تلازمہ قائم کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ایڈورڈ لوضک کی سگرٹ والی تصویر کا ہے۔ سب لوگ اس نقاش کو خبطی سمجھتے تھے۔ مگر اس کے بنائے ہوئے اپنے چہرے سے کسی عظیم شخصیت کی انا کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

انشائیوں میں ''تشہیرِ ذات'' کرنے والے لوگ ایسے نظر آتے ہیں جیسے وہ کوئی مخصوص تاثر پیدا کرنا چاہتے ہوں۔ یہ تاثر محض اسلوب کا پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ ایک برتر وجود کے اس تصوراتی ہیولیٰ سے روشنی اخذ کرتا ہے جسے ہر انسان اپنے ذہن کے صنم کدہ میں سب سے اونچے استھان پر متمکن کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ پگملیون بنا ہوا اس کی پرستش کرتا رہتا ہے۔ اس نوع کے انشائیوں میں سب سے بڑی قباحت ہوتی ہے کہ ابلاغِ ذات اگر غیر فنکارانہ انداز سے ہو تو قاری کچھ چڑ جاتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے برتر وجود کے ہمزاد سے کہے کہ کبھی کبھی وہ اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ ایسا سلوک کرتے ہوئے اسے چاہیے کہ وہ اپنی ذات کے صرف انہی پہلوؤں کو سامنے لائے جو انسانی دلچسپی کی بنا پر سدا بہار ثابت ہوسکیں۔ ورنہ انشائیہ نگار کا یہ ہمزاد قاری کے لیے ایک پیرِ تسمہ پا بن جائے گا۔ یہ درست ہے کہ اولاد کی مانند ہر انسان کو اپنی شخصیت کے تمام اچھے برے پہلو بھی ''آرٹ'' میں نظر آتے ہیں۔ مگر تیز بچوں کو پڑوسی کس طرح پسند کریں؟ اس طرح کے غیر دلچسپ پہلوؤں کو انشائیہ کا قاری بھی پسند نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہر انشائیہ نگار لیمب تو ہونے سے رہا لیکن خشک

وتر سے احتراز کرنے پر بڑے خوبصورت انداز سے افشائے ذات کیا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں میرا ذہن نظیر صدیقی مرحوم کی طرف جاتا ہے۔اگر اس میں طنز کی خاطر بعض باتوں کا اضافہ نہ کیا جاتا تو یہ انشائیہ میرے خیال میں بہت خوب ہو جاتا لیکن مصنف نے ''میں'' کی لے اتنی زیادہ بڑھادی ہے کہ یہ انشائیہ اس فنکارانہ حسنِ توازن سے محروم ہو گیا ہے جو اس نوع کے انشائیوں کی اصل اساس وروح ہوتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اس پر متفق ہیں کہ انشائیہ میں ایجاز واختصار بہت ضروری ہے۔وجہ یہی کہ قاری طولِ کلام سے اکتا نہ جائے اور لکھنے والے سے ہمدردی ضائع نہ ہو جائے۔ بعض اوقات طنز کی ترشی یا مزاح کی چاشنی سے ایک چیز سے دیگر پیش کی جاتی ہے۔یہ گویا قاری کو جیتنے کے لیے ایک رشوت یا چاٹ ہے اور یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اظہارِ ذات کے لیے انشائیہ نگار بالواسطہ طریق بھی اختیار کر سکتا ہے بلکہ بیشتر انشائیہ نگار اس طریقے کو اپناتے ہیں۔ایسے ادب پارے میں انشائیہ نگار اپنی ''میں'' کو یوں سامنے لاتا ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہونے دیتا۔اس مقصد کے لیے زندگی میں سے (بظاہر) فراہم پہلوؤں کو لیتے ہوئے اپنی باتوں کو فنی اہمیت بخشتا ہے جس کیلئے وہ منفرد اور بعض اوقات انوکھے یا پھر چونکا دینے والے زاویہ ہائے نگاہ سامنے لاتا ہے۔مسلم الثبوت اقدار اور معیاروں کا ایسے انداز ہ سے تجزیہ کرتا ہے کہ ڈھول کا پول کھل جائے۔

الغرض وہ زندگی اور اس کے متنوع مظاہر کو نت نئے معانی بخشتا ہے۔اس نوع کے انشائیوں میں مصنفین سے قارئین کی رائے کا اتفاق ضروری نہیں۔ادھر یہ بھی ہے کہ انشائیہ نگار اپنے قاری کو قائل کرنے کا بھی کوشاں نہیں ہوتا کیونکہ قائل کرنے کے لیے دلیل واستدلال ضروری ہے۔مگر انشائیہ کی لطافت تازگی ٹھوس دلائل وبراہین کی متحمل نہیں۔

انشائیہ نگار کی حالت تو اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کسی عمدہ و خوشگوار موڈ میں بیٹھا ہے اور اپنے کسی بے تکلف دوست سے ایسے ہی خوش گوار لہجہ میں باتیں کئے جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے کسی حد تک ڈرامائی خود کلامی سے بھی مشابہ قرار دے سکتے ہیں، لیکن انشائیہ نگار ڈرامہ نگار کی طرح پابند نہیں۔ خود کلامی صرف ایک کردار کے احساسات اور ردّعمل کے لئے ہوتی ہے۔ مگر انشائیہ بظاہر غیر منطقی اور غیر عقلی بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ سب کچھ دوسروں کے خیال میں ہوگا۔ خود انشائیہ نگار اس باب میں بالکل سنجیدہ ہوتا ہے وہ ان باتوں کو درست اور جائز سمجھتا ہے۔ ویسے بھی یہ فردِ واحد کے خیالات ہیں، ایسے خیالات جن سے وہ اپنی شخصیت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنے کی دھن میں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انشائیہ میں اصل چیز موضوع نہیں (کیونکہ ہر موضوع اپنایا جا سکتا ہے) بلکہ اصل چیز شخصیت کا حسن ہے، مصنف کے تاثرات ذاتی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ ہونے چاہیے اس کے اپنے ذہن کی تخلیق۔ انشائیہ کے حسن کا انحصار تو ان تاثرات اور خیالات کے حسنِ اظہار پر ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ انشائیہ ذہن کی ترنگ سہی مگر یہ مجذوب کی بڑ نہیں ہوتی۔ اسی لئے نقادوں کی اکثریت نے اس کے لیے ہلکے پھلکے انداز اور لطیف مزاح کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ انشائیہ میں اس عنصر سے خوبی پیدا ہوتی ہے اور قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف اپنی انفرادیت بھی منواتا جا رہا ہے۔ ایک اور خصوصیت جس کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے یہ ہے کہ بعض اوقات انشائیہ کے عنوان نفسِ موضوع سے لاتعلق ہی نہیں ہوتے بلکہ سرے سے اس کی تکذیب کرتے نظر آتے ہیں اور ایسے عنوانات سے موضوع کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس طرح مصنف قاری کو ایک دلچسپ نفسیاتی مغالطہ میں خبط کر کے حیرت زدہ کر دیتا ہے اور ایسے خیالات سے اپنی شخصیت کا ایک اثر اس کے ذہن پر چھوڑتا ہے۔ عنوان کی پیدا

کردہ توقعات کے برعکس قاری مضمون میں کچھ اور ہی پاتا ہے اگر وہ کوئی انوکھی بات ہو تو یقیناً اس سے ایک لطیف مسرت کا احساس ضرور جنم لے گا۔ مگر یہ خصوصیت ہر انشائیہ میں نہیں ہوتی، لیکن اگر ہو تو قندِ مکرر کا لطف دیتی ہے۔ انگریزی میں اس کی کئی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں ''سوفٹ'' کے ''اے موڈیسٹ پروپوزل'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں بچہ فروخت کرنے ذبح کرنے اور اسے پکا کر دعوتوں میں کھانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

تکنیکی اعتبار سے ہم اسے افسانہ کے اچانک اختتام جیسا بھی قرار دے سکتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں افسانہ میں ایک خاص فضا سے توقعات ابھارنے کے بعد ان کو اختتام تک لایا جاتا ہے، لیکن اس نوع کے انشائیوں میں عنوان سے موضوع کے بارے میں پیدا ہونے والی توقعات فنی رعنائی سے باطل کر دی جاتی ہیں۔ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ موضوع کی مذمت کے لئے ''موضوع'' جیسا عنوان دیا جس کے تلازمہ سے قاری کے ذہن میں عنوان سے وابستہ تمام خیالات و نظریات اور احساسات اُبھر آئے اور یوں ان سب کی فرداً فرداً خامیاں اجاگر کئے بغیر ہی ہلکے پھلکے انداز سے موضوع سے وابستہ تصوّر کے بارے میں قاری کے ذہن میں ایک ہلچل ڈال دی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا اور یہی انشائیہ کا مقصد ہونا چاہیئے۔

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مقالہ ''اردو کا پہلا اور آخری انشائیہ نگار'' میں انشائیہ کے فن پر جو بحیثیت مجموعی تبصرہ کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے، ان کے بقول:

> ''اس فنِ لطیف کا تعلق صرف سلاستِ زبان سے نہیں بلکہ تخیلِ شاعرانہ اور شعورِ ناقدانہ سے بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی سے بھی، اس کے لئے نہ صرف اعلیٰ درجہ کی ژرف درکار ہے جو صرف وسیع مطالعے اور دقیق مشاہدے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے بلکہ فلسفیانہ اندازِ تفکر، جدت و اختراع یعنی Orginal Thinking بھی ضروری ہے جو ایک فطین و ذہین

دماغ، متوازن وسلیم طبیعت اور ایک کشادہ و پاکیزہ قلب ہی کو میسر آتی ہے۔ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ سادہ زبان اور شگفتہ و دل نشین اندازِ بیان۔''

وہ اِس ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

''یہ صنف در اصل تنقید ہی کی ایک صورت ہے لیکن نہایت لطیف وخوشگوار۔اس کا انداز بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہم اگر تبادلۂ خیال کریں اور لطف وتفریح کا عنصر ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ظاہر ہے کہ اس نوع کی صحبتوں میں جو گفتگو کی جاتی ہے وہ کسی علمی تقریر کی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ محض خشک ودقیق مسائل ہی سے کام لیا جاتا ہے لیکن ہوتی ہے وہ بہر حال تنقید ہی۔اس لئے کسی مقصود سے نالاں نہیں ہوتی اور اس کے اظہار کے لئے جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ بڑی شیریں وبے ساختہ بے تکلف ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ظرافت اور جرأت سے بھی خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک اچھا انشائیہ نگار دلائل میں ماہر نفسیات بھی ہوتا ہے کہ حقائق کا بیان وہ شاعرانہ فکر وتخیل اور ادیبانہ لب ولہجہ میں کرتا ہے اور اس لئے سننے والا جلد متاثر ہو جاتا ہے اور اس کی علمی مسائل سے متعلق اکثر الجھنیں بھی دور ہو جاتی ہیں۔

گو ہمارے ہاں انگریزی نصاب کی کتابیں زیادہ تر انشائیوں پر مشتمل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں بھی یہ صنف ایسی ہی مقبول ہے جیسی مثلاً افسانوی ادب کی صنف ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک اتنے انشائیے لکھے بھی نہیں گئے کہ ہم ان سے کوئی شائستہ نصابی مجموعہ مرتب کر سکیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ ہر مزاج کے مصنف یا قاری کے بس کا روگ بھی نہیں۔اچھا بُرا افسانہ یا غزل تو کسی نہ کسی طرح لکھ لی اور اس کے قدر دان بھی میسر آ گئے۔مگر ''انشائیہ'' اچھا بُرا انشائیہ نہیں ہوسکتا۔کیوں کہ وہ یا کوئی کامیاب نمونۂ فن ہوگا ورنہ ایک بے تکی تحریر۔دراصل انشائیہ ایک مہذب ذہن کی پیداوار ہے اور مہذب قاری ہی اس کا لطف اُٹھا سکتا ہے۔ یہ انفرادیت کا

اظہار تو ہے، ابلاغِ ذات بھی ہے۔نرگسی میلانات کا حامل بھی۔مگر یہ سب چیزیں جس لطافت سے انشائیہ کی شکل میں جلوہ پیرا ہوتی ہیں وہ بڑا ریاض چاہتی ہے۔اگر اس انداز سے انشائیہ میں جائزہ لیں تو غالبؔ کے خطوط میں سے بعض خطوط یقیناً انشائیہ قرار پاتے ہیں۔ان خطوط میں ابلاغِ ذات کی فنکارانہ سعی کارفرما ملتی ہے۔اس پر مستزاد غالب کا زیرلب تبسم بھی ہے۔اگر بعد میں یہی انداز شعوری طور سے اپنایا جاتا تو آج یقیناً انشائیہ ہمارے ہاں بھی ایک مقبول و معتبر صنفِ ادب بن جاتا۔اسی طرح مولانا ابوالکلام آزادؔ کی ''غبارِ خاطر'' میں بھی ہمیں انشائیہ کی جھلک ملتی ہے، خاص طور پر چائے کے سلسلے کی چیزیں یا چڑے چڑیوں والا خط۔

انشائیہ کی جھلک دیکھنے کے لئے تلاش جستجو کی یہ سعی ہے۔اتنی دور تک جانے کا مقصد اس کی ''قدامت'' ثابت کرنا نہ تھا۔جب کہ یہ عرض کرنا تھا کہ میرے نزدیک مہذب ذہن کی مثال کیا ہے۔غالبؔ اور آزادؔ کا سوانحی مواد موجود ہے اور انہیں مہذب ذہن قرار دینے کے لیے مزید بحث کی بھی ضرورت نہیں مگر ہم انہیں انشائیہ نگار بھی نہیں کہہ سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط محض خطوط ہی تھے، بلکہ ''غبار خاطر'' کے خطوط تو خطوط کے طور پر لکھے بھی نہیں گئے تھے۔

انشائیہ کے ضمن میں بہت سی اصطلاحات انجمنوں کی پیدا کردہ ہیں۔اگر انشائیہ کی حدود معین کر کے اسے طنزیہ یا مزاحیہ مضامین سے ممیّز کرنے کی کوشش کی جاتی تو بات اتنی نہ الجھتی۔انشائیہ میں مضامین کے برعکس دیگر تکنیکی خصوصیات کے علاوہ اصل چیز ذات کا ابلاغ ہے جو تشہیر تک بن سکتا ہے اور صرف ایسے ہی نثر پارے کو انشائیہ قرار دینا چاہئے۔اگر اس میں یہ اساسی صفت نہ ہو تو اسے عام مضمون کہنا چاہیئے۔انشائیہ کی تکنیک سے وابستہ تمام خصوصیات مضمون میں بھی مل سکتی ہیں اور مضمون کیا بعض اوقات تو تاثراتی افسانہ میں بھی نظر آتی ہیں، تو کیا ان فن پاروں کو بھی انشائیہ سمجھا جائے، مگر ہم انہیں افسانہ ہی شمار کرتے ہیں۔جب ایسا ہے تو پھر ''مضمون''

اور ''انشائیہ'' کوبھی خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

سب سے بڑی الجھن طنز ومزاح سے پیدا ہوئی۔ بالعموم طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کوبھی انشائیہ سمجھ لیا گیا۔اس ضمن میں ایک بڑے کام کی بات یہ کہی گئی ہے کہ طنز اور مزاح ادب کی صنف نہیں۔اسلوب کی صفت ہیں اور اسلوب کی یہ صفات ادب کی ہرصنف میں دیکھی اور برتی جاسکتی ہیں۔بقول ظہیر صدیقی:

''یہ تجزیہ بڑی حد تک درست ہے مگر اس میں نقطۂ نظر کی اہمیت فراموش ہوگئی۔ہمیں تمام اصنافِ ادب میں ہلکا یا گہرا طنز یا مزاح مل سکتا ہے۔ مگر ہم ان کے مصنفوں کو طنز نگار یا مزاح نگار نہیں کہتے کیونکہ جب کسی افسانہ یا ڈرامے میں کی اسی کردار کی شخصیت کی ناہمواریوں سے مزاح کا رنگ لایا جاتا ہے یا کسی واقعہ پر طنزیہ انداز سے چھینٹا پھینکا جاتا ہے تو اس کا بنیادی مقصد مزاح یا طنز نہیں ہوتا بلکہ مقصدِ تخلیق اور نقطۂ نظر کی صراحت کے لئے ثانوی مواد ہوتا ہے جب کہ مزاح نگار معاشرہ انسان اور انسانی زندگی کی ناہمواریوں، خامیوں اور پیچیدگیوں پر خود بھی ہنستا ہے، یہیں مزاح ہے،لیکن اگر معاشرہ انسان اور انسانی زندگی کی ناہمواریوں، خامیوں اور پیچیدگیوں کو بدلنے کی خاطر قلم میں زہرنا کی، تلخی یا آتش بھرلی جائے تو یہ طنز ہے اول الذکر میں طنز ومزاح سے نقطۂ نظر کی وضاحت کا کام لیا جاتا ہے اور موخر الذکر میں طنز ومزاح ہی کو اوّلیت یا تقدم حاصل ہے۔یہ بے مقصد بھی ہوسکتے ہیں اور بامقصد بھی لیکن یہ صحیح ہے کہ انشائیہ کا یہ عالم نہیں۔یہاں مصنف اپنی ذات کا کوئی پہلو قاری کے سامنے لانا چاہتا ہے یا تو وہ بلاواسطہ طریقے سے ایسا کرے گا یعنی سوانحی مواد سے کام لیتے ہوئے اپنی سائیکی کی گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع دیتا ہے ورنہ بالعموم وہ بالواسطہ طور سے ہی'' ذاتی'' اور'' نجی'' خیالات کا اظہار

کرتا ہے۔ ایسے خیالات جن کا منطقی ہونا تو ضروری نہیں مگر ہم انہیں لایعنی، بیہودہ اور غلط بھی نہیں کہہ سکتے۔ انشائیہ نگار اس مقصد کے لئے طنز ومزاح سے بھی کام لے سکتا ہے لیکن صرف اسلوب میں شگفتگی اور اظہار میں تازگی پیدا کرنے کے لئے۔ اس طرح قاری کو اُکتاہٹ سے محفوظ رکھا جاتا ہے پطرس، شفیق الرحمٰن یا شوکت تھانوی کے ناموں سے۔''

ہمارے ذہن میں مزاح کا خیال ہی آتا ہے۔ کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس سے طنز کی طرف دھیان جاتا ہے لیکن مثلاً، وزیر آغا کے نام سے طنز یا مزاح کا تصوّر ذہن میں نہیں اُبھرتا، حالانکہ انہوں نے تو اس موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی بھی کر رکھی ہے اور یہ اس لئے کہ وہ خالص انشائیہ نگار ہیں۔ میری دانست میں اس تقسیم سے اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور اگر ہم طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون و اصلاحی مضمون کے موضوع اور مقصد کو الگ الگ سمجھ لیں تو دیگر اقسام کو انشائیت کے ساتھ خلط ملط کرنے کی بحث پیدا نہیں ہوگی، بہرنوع انشائیہ کے لئے میں انکشافِ ذات اور ابلاغِ ذات کے وصف کو بنیادی شرط ماننا پڑے گا۔

اور آخر میں ایک ہدایات نامہ انشائیہ نگار کے لئے:

ا:......غیر ضروری طوالت سے بچو!

۲:......کہنے کو نئی بات نہیں ہے تو انشائیہ سے دور رہو۔

۳:......اسلوب انشائیہ کی جان ہے۔

۴:......مشاہدہ کے لئے رنگیں نہیں بلکہ سفید شیشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۵:......انشائیہ کا سنگھار......ذاتی سوچ ہے۔

۶:......انشائیہ میں خوش طبعی کا جوہر شخصیت سے عیاں ہوتا ہے۔

۷:......افراط وتفریط سے بچو!

۸:......بور مت کرو۔

۹:......ذات کے بغیر انکشافِ ذات کیسے ممکن ہے؟

۱۰:......خود سوچو اور دوسروں کو سوچنے کا موقع دو۔

۱۱:......انشائیہ آزاد بندوں کی دنیا ہے۔

۱۲:......کبھی بھی سوچا کہ تم انشائیہ کی صنف کے لیے باعث خطرہ ثابت ہو سکتے ہو۔

۱۳:......ناکام ادیب کامیاب انشائیہ نگار نہیں ہو سکتا!۔

●●●

☆۔۔۔ڈاکٹر گلزار احمد وانی

جموں وکشمیر میں معاصر اردو انشائیہ

انشائیہ ایک نثری صنف ہے جس کی حدود کا تعین اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ ناقدین ادب نے مذکورہ صنف کی جو شناخت بیان کی ہے وہ بہت حد تک تضاد اور اختلاف کی شکار ہے اور زیادہ تضاد صنفی اعتبار سے ان تحریروں میں ملتا ہے جو انشائیہ کے نام پر اب تک پیش ہوئی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خود انگریزی ادب میں بھی انشائیہ کے نام پر مضمون، سوانحی تحریریں، سنجیدہ وغیر سنجیدہ نثر پارے اور شخصی انشائیے غرض سبھی کچھ لکھا گیا ہے، جو الجھنوں کو جنم دیتے ہیں۔ الغرض انشائیہ اردو ادب کی ایک نوزائید صنف ہے۔ اردو کے مشترکہ کلچرل کی آب وہوا اس نومولود صنف کے لئے نہایت موزون رہی ہے۔ ''نیرنگِ خیال'' میں مذکورہ صنف کے دھندلے نقوش ملتے ہیں اس کے بعد 'مضامین رشید'' میں اس کے بقیہ نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

جموں وکشمیر میں ملک کی دیگر ریاستوں کی طرح انشائیہ نگاری کی باضابطہ روایت ملتی ہے نہ ہی کوئی بڑا انشائیہ نگار۔ 1947 سے پہلے یہاں کے چند انشائیہ نگار ادب میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے جن میں سالگ رام سالک، مرزا غلام حسن بیگ، پنڈت نارائن، پنڈت دینا ناتھ نادم، پریم ناتھ پردیسی، پنڈت دینا ناتھ واریکو، شاہد کاشمیری، عبدالرحمٰن زکی، پرتھوی ناتھ کول، پنڈت جیا لال کول، اسیر کاشمیری، حکیم غلام حسین مخمور، اندر جیت لطف، منوہر لال دل، اللہ رکھا ساگر، صادق

کاشمیری، رونق کاشمیری، رسا جاودانی، نشتر کاشمیری، اعجاز ساقی، دیا کرشن گردش، کشن سمیل پوری، حمید نظامی، حبیب کیفوی، معراج الدین احمد، عبدالرحمٰن جامی، پنڈت اومکار ناتھ کول، غلام حیدر خان چستی، نند لال واتل وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔

اس دور کے انشائیوں میں سالگ رام سالک کے انشائیوں کا مجموعہ " گنجینۂ فطرت " کو اولیت کا درجہ حاصل ہے اور تیرتھ کاشمیری کے انشائیوں کا اسلوب جس میں ایک طرف فطرت نگاری اور دوسری جانب تصوف وفلسفہ اور حقیقت نگاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ متذکرہ بالا انشائیہ نگاروں کی دھاک قارئین کے دلوں پر بیٹھ چکی ہے اور کئی اہم وغیرا ہم موضوعات پر انہوں نے انشائیے تحریر کئے ہیں۔

جموں وکشمیر میں مجموعی طور پر صنف انشائیہ بقیہ اصناف ادب کے مقابلے میں نوزائیدہ ہی تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ درجنوں نام ایسے لئے جاسکتے ہیں جنہوں نے مذکورہ صنف میں طبع آزمائی کی ہے یا تو ان کے انشائیے افسانوں کے مجموعوں کے ساتھ شائع ہوئے یا پھر رسالوں اور اخبارات کی زینت بننے تک ہی محدود رہے۔ اس نوزائیدہ صنف کو پروان چڑھانے میں اور مزید سرعت لانے میں مقامی اخباروں اور رسالوں کا بہت حد تک اہم کردار اور خدمات میّسر رہی ہیں۔ اسی کے توسط اور توسل سے یہاں کے تخلیق کاروں نے اپنے انشائیوں کو رسائل واخبارات کی زینت بنایا اور آخرکار یہ صنف اپنی سمت و رفتار پکڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ پھر اکیسویں صدی میں کئی نئے تخلیق کار مل گئے جو صنفِ انشائیہ کے ساتھ جُڑ گئے اور اس میں باقاعدہ طور پر طبع آزمائی کرنے لگے مگر یہاں باقاعدہ داغ بیل پروفیسر محمد زماں آزردہ، برج پریمی کے ساتھ ساتھ درجنوں قلم کاروں کے انشائیوں کی صورت میں پڑ چکی تھی۔ جموں و کشمیر میں انشائیہ نگاری کے ابتدائی دور میں برج پریمی کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا انشائیہ ''باتیں توہمات کی'' ایک اچھا نمونہ ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے

کہ پروفیسر محمد زماں آزردہ کی انشائیہ نگاری کو کوئی ناقد پس پشت نہیں ڈال سکتا ہے نہ ہی صرف نظر کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے انشائیے جموں وکشمیر میں انشائیہ نگاری کے حوالے سے نقش اول کہلانے کی حامل ہیں۔ بعد ازاں درجنوں تخلیق کار مذکورہ صنف کی آغوش میں خود آ گئے یا تو انہیں مزاجاً مذکورہ صنف کے ساتھ اُنسیت جاگی یا پھر تحقیق کے دوران وابستگی ہونے لگی۔

پروفیسر محمد زماں آزردہ نے صحیح معنوں میں جموں وکشمیر میں اردو انشائیہ نگاری میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔آپ نے باقاعدہ طور پر صنف انشائیہ کی طرف دھیان مبذول کر کے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔ابھی تک ان کے کئی مجموعے مذکورہ صنف کے حوالے سے منظر عام پر آئے ہیں۔آپ کشمیری اور اردو زبانوں میں انشائیہ لکھتے رہتے ہیں۔آپ کے انشائیوں میں دبی سی ہنسی کے پیچھے طنز نشتر کی طرح چبھتی ہے۔کبھی آپ مزاح کے توسط سے ہنسا کر بات کی تہہ تک پہنچ کر اصلیت سے واقف کراتے ہیں تو کبھی معاشرے کے کرداروں کے حوالے سے ہجویانہ انداز بیاں اپنا کر حقائق سے بھرپور آگہی دیتے ہیں۔

"غبارِ کارواں" اور "شیریں کے خطوط" آپ کے بہترین مجموعہ انشائیہ ہیں۔ان کے علاوہ کشمیری میں "فکر ہنز ٹکر" ادبی حلقوں میں بہت حد تک مقبول عام ہوئی ہے۔آپ نے باقاعدہ طور پر صنف انشائیہ کو اپنا لیا ہے۔ان کے علاوہ شاید ہی جموں وکشمیر کے کسی انشائیہ نگار نے اس طرح سنجیدگی سے مذکورہ صنف کو اپنایا ہے۔ اس کے علاوہ آپ مرثیہ پر بھی بہت حد تک نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے بہت گہرائی سے مطالعہ فراہم کر چکے ہیں اور اس حوالے سے ان کی تحقیقی کتاب "مرزا دبیر حیات اور کارنامے" بھی منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی ہے۔

راجہ نذر بونیاری ایک اچھے انشائیہ نگار گزرے ہیں۔ان کے انشائیے وادی اور وادی سے باہر مجلوں اور رسالوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔''مکھی'' ان کا ایک اہم انشائیہ ہے جو''نگینہ'' میں شائع ہوا ہے۔ وہ طوالت اور بے جا لفاظی سے پرہیز کرتے ہیں۔ان کے انشائیے طنز ومزاح کی چاشنی میں رنگے ہوئے ہیں۔بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔انہیں انشائیے بننے کا فن بخوبی آتا ہے۔وہ خالص انشائیہ نگار ہیں جنہیں مذکورہ صنف پر تکنیکی طور پر دسترس حاصل ہے۔

عبدالرحمٰن مخلص ایک منفرد کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب انشائیہ نگار کے طور یاد کئے جاسکتے ہیں۔ان کے بیشتر کالم انشائیوں کے زمرے میں آتے ہیں تاہم کہیں کہیں پر افسانوی رنگ بھی نمایاں ہے۔پروفیسر جگن ناتھ آزاد بھی عبدالرحمٰن مخلص کی انشا پردازی کا اعتراف کر چکے ہیں۔

جاوید آذر جموں وکشمیر کے معاصر انشائیہ نگاروں میں ایک معتبر نام ہے۔ موصوف کشمیر عظمیٰ میں ایک طویل عرصے تک ''خدنگ جستہ'' کے عنوان سے ایک ہفتہ وار فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے۔جس میں انشائیہ کی تکنیک اور اسلوب پایا جاتا تھا۔ اکثر کالموں میں جہاں مزاح کی چاشنی دیکھی جاتی ہے، وہیں پر اس میں طنز کی کاٹ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔فکاہیہ کالم لکھنے کی وجہ سے موصوف کا ذہنی میلان انشائیوں کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہے۔

آذر صاحب کے یہاں انشائیہ کی تخلیق کسی زور زبردستی کے عمل سے وقوع پذیر نہیں ہوتی ہے بلکہ تکنیکی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا اور معاشرے کے حالات و واقعات کے ردعمل میں ہی انشائیے تخلیق پاتے ہیں۔آپ کا اسلوب ''خدنگ جستہ'' کے کالم کی بدولت جداگانہ اور منفرد ہے جو بہت دور سے پہچانا جاتا ہے، پر کہیں کہیں یہ انشائیے مضمون کی سی کیفیت اختیار کر کے انشائیہ کی پٹری سے ہٹ جانے کا تاثر فراہم

کرتے ہیں۔آپ نے کئی اہم اور کامیاب انشائیے تخلیق کئے ہیں جن میں گھریلو نوکر، ہمارا قومی اثاثہ، سم کارڈ سم سم، عید آیہ رسہ رسہ اور ایک کے ستر وغیرہ شامل ہیں۔جن میں انشائیہ کا دامن وسیع سے وسیع تر اور ست رنگی ہوا ہے۔ان انشائیوں کے مطالعے سے ایک قاری مختلف النوع گوشوں سے معنی اور مفہوم کی ضیا پا کر طمانیت سے سرشار ہو جاتا ہے اور جس سے یہی مترشح ہو جاتا ہے کہ انشائیہ نگاری کی مذکورہ صنف پر آپ کی کتنی اور کس قدر مضبوط گرفت بھی ہے۔

دیپک بُدکی بھی انشائیہ لکھتے ہیں۔وہ اس فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ان کے انشائیے اختصار لئے ہوئے ہوتے ہیں نہ طوالت کے شکار۔وہ زندگی کی ہر شے میں انشائیہ کی سی شگفتگی پاتے ہیں اور اسے بیان کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ ''سونٹے'' ان کا ایک ایسا انشائیہ ہے جس میں سونٹے کو بچوں کی پٹائی کے مختلف روپ جیسے لاٹھی، عقل نما، ڈنڈا، کین وغیرہ کے گروہ میں گردانتے ہیں۔دیپک بدکی فن انشائیہ نگاری کے تمام گن اپنے آپ میں رکھتے ہیں اور معمولی سے معمولی موضوع کو بھی اعلیٰ انشائیہ بنا دیتے ہیں۔جہاں تک ان سے ہوتا ہے موضوع کے حصار میں ہی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

شفیع اطہر/شفیع احمد انجینئر اکیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر میں ایک انشائیہ نگار بیک وقت ادبی افق پر اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو جاتے ہیں اور اپنا مجموعۂ انشائیہ ''لو آج ہم بھی صاحبِ کتاب ہوگئے'' منظر عام پر لاتے ہیں۔شفیع اطہر مذکورہ مجموعہ سے قبل یہاں کے روزناموں میں اپنی شگفتہ تحریروں سے قارئین کے لیے تفننِ طبع کا سامان مہیا کرتے رہے ہیں۔اُن کی تحریروں میں جہاں مزاح کا عنصر ہے وہیں طنز کے نشتر بھی غیر محسوس طریقے سے جان و جسم میں پیوست ہوتے ہیں۔اُن کی عبارتوں سے بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔وہ بات میں

بات پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

غلام حسن طالبؔ نے تقریباً دو دہائیوں سے تسلسل کے ساتھ روزنامہ آفتاب، آئینہ اور کشمیر عظمیٰ جیسے اخبارات میں انشائیے شائع کئے۔ وہ ریڈیو کشمیر سرینگر کے لئے بھی انشائیے لکھتے رہے۔ انہوں نے ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ انشائیہ نگاری کے فن کو اپنایا ہے۔ غلام حسن طالبؔ کے انشائیوں میں ایک تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں ہنسی کے اندر طنز کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے جو سماج میں نت نئے مسائل کی طرف قارئین کو متوجہ کرتے ہیں۔ اُن کے فقرے اگرچہ لبوں کو ہلکی مسکراہٹ عطا کرتے ہیں لیکن وہیں فکر کی ایک دبی سی چبھن عطا کرنے میں بھی میں تامل نہیں کرتے۔ ان کے انشائیے بڑھاپا، باقی سب ٹھیک ہے، پبلک سرونٹ یا ماسٹر، دعوت پر سویرے جانا، بچوں کے لئے بازار جانا اور شاپنگ جیسے انشائیے مطالعے کی دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

پروفیسر منصور احمد منصور نے صنف انشائیہ میں اپنا ہنر آزمایا ہے۔ اُن کا ایک مجموعہ ''کشمیر خواب، سراب، گرداب'' اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں منظر عام پر آ گیا جس میں خاکوں کے ساتھ ساتھ انشائیے بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس سے قبل ان کے انشائیے یہاں کے روزناموں کی وساطت سے عام قارئین تک پہنچے ہیں۔ پروفیسر منصورؔ نے اپنے انشائیوں میں عصری حسیّت کو عام طور پر جگہ دے دی ہے۔ بہ قول پروفیسر قدوس جاوید:

> ''منصورؔ کی ان تحریروں کو میں انشائیے کہوں یا طنزیہ ومزاحیہ مضامین، فیصلہ نہیں کر پا رہا جب کہ جانتا ہوں کہ ان تحریروں میں زیادہ تعداد ایسے مضامین کی ہے جنہیں انشائیہ کے سوا کوئی اور نام دینا ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ ان انشائیہ نما مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں مصنف نے عصرِ حاضر کے اس کرب کو احساس کی

پوری شدت کے ساتھ سمونے کی کوشش کی ہے''۔

(بازیافت تحقیقی وتنقیدی مجلّہ، شعبہ اردو کشمیری یونیورسٹی سرینگر)

یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پروفیسر منصور کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی ہے کہ اُن کی تحریروں کو کسی نے انشائیہ، کسی نے خاکہ تو کسی نے افسانہ یا مضمون بتایا ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح محمد حسین آزاد، سرسید احمد خان، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، اختر انصاری، رشید احمد صدیقی یا پطرس بخاری کی بہت سی تحریروں کے ساتھ ہوا یا پھر عصر حاضر میں مجتبیٰ حسین اور ناصر علی کی تحریروں کو مضمون کے زمرے میں گردانا جاتا ہے۔ حالانکہ مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم نے بھی عمدہ خاکے اور بہترین انشائیے تحریر کئے ہیں۔ اب یہاں بھی ایسا ہی مسئلہ ہے کہ پروفیسر منصور کی ان تحریروں کو کس خانے میں رکھا جائے۔ پروفیسر قدوس جاوید منصور کی انشائیہ نگاری کے محاسن اس طرح بیان کرتے ہیں:

''منصور احمد کی تحریریں اپنے تاثر کے اعتبار سے کشمیر کے نوحے ہیں جو بظاہر انشائیہ کے اسلوب میں سامنے آئے ہیں لیکن ان کے اندر درد اور کرب کی جو لہریں ہیں وہ ہر قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں اور یہ منصور کی بڑی کامیابی ہے''۔

(کشمیر خواب، سراب، گرداب ص:۵)

پروفیسر منصور کا مذکورہ مجموعہ ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آ گیا ہے جس کے بعد دو تین سال تک پھر یہ صنف خاموش رہی۔

مشتاق احمد کینی اکیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں جس انشائیہ نگار نے مذکورہ صنف کی زمین میں نہ صرف اپنی جڑیں پھیلائیں بلکہ تنومندی کے ساتھ اُسے تناور درخت بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میری مراد مشتاق احمد وانی کینی سے ہے۔ ۲۰۱۰ء میں اُن کا پہلا مجموعۂ انشائیہ ''شہر بے پُرسان'' کے نام سے شائع ہوا ہے جس

میں تیس انشائیے موجود ہیں۔اُن کا ایک اور تازہ مجموعۂ انشائیہ ''ہاوس ہسبنڈ'' کے نام سے رواں سال میں منصۂ شہور پر آیا ہے۔ اس طرح ان کے ابھی تک دو'' مجموعۂ انشائیہ''منظرِ عام پرآ چکے ہیں۔

مشتاق احمد کینی اپنے انشائیوں میں ہنسی اور مزاح پر دباؤ کم ڈال کر کئی زاویوں سے بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ پھر اگر ہونٹوں تلے دبی مسکراہٹ دستک بھی دے تو جلد ہی وہ فکر کی دُھند میں غائب ہو کر کبھی افسردگی اور گہے مسرت زالمحوں کی سیر کرا دیتی ہے۔کسی نے ان کے انشائیوں کو کہانیاں بتایا تو کسی نے مضامین،غرض ان کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی ہے، خیر کچھ بھی ہو وہ جموں وکشمیر کے غیر افسانوی نثر میں معماروں کی فہرست میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔نور شاہ،مشتاق احمد کینی کی انشائیہ نگاری سے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''ان کی تحریروں میں موجودہ حالت کی کڑواہٹ، زندگی کے نشیب وفراز، پستیاں اور بلندیاں مختلف روپ اپنا کر سامنے آتی ہیں۔ان تحریروں میں انشائیوں کا سا لطف ہے اور یہ تحریریں انشائیے کے زمرے میں آتی ہیں یا افسانے کے زمرے میں۔ بہرحال کینی صاحب کے پڑھنے والے ہی طے کر سکتے ہیں''۔

(شہر بے پرساں۔ص:۱۳)

زنفر کھوکھر خواتین انشائیہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے جو ایک افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگار کے بطور بھی مقبول عام ہیں۔ان کا ایک مجموعۂ انشائیہ ''ہم سب ایک ہیں'' ۲۰۱٦ء میں منصۂ شہود پر آیا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں کُل پچیس انشائیے ہیں۔ زنفر کھوکھر نے بڑی سنجیدگی سے صنف انشائیہ کو برتا ہے۔ وہ انشائیوں میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ موضوع اور نفسِ مضمون کے حوالے سے کئی باتوں کو بیک وقت نقاب کشائی کر کے ایک دبی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں

پر بکھیر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال زنفر کھوکھر کے انشائیوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''زنفر نے بڑے پُر وقار اور خوشگوار انداز میں اپنے عہد کی برائیوں کو ہدف بنایا ہے۔ وہ کم آبادی والے پہاڑی علاقے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کی فکر اور انشائیوں کا کینوس وسیع ہے اور اُن کا مشاہدہ ہم عصر اور عصری حسیت کا غماز ہے۔ وادیٔ کشمیر کی شگفتگی اور تازگی اُن کے اسلوب اور مزاج پر حاوی ہے۔ انشائیوں میں طنز کے جوہر اور مزاح کے جھمکے ٹانکنا زنفر کو خوب آتا ہے''۔

(ہم سب ایک ہیں۔ص:۹۔۱۰)

گالی، جوتا، زمانہ بدل گیا ہے، کُرسی وغیرہ ان کے کامیاب ترین انشائیے گردانے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں کے ذریعے سماجی تغیرات پر اپنے تجربات و مشاہدات بیان کرتی ہیں۔ جیسے مظلوم انشائیہ میں شوہر کی بے بسی، اور لاچاری کے پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ سماج کے تئیں حساس بھی اور فکرمند بھی ہیں اور یہ عنصر ان کی انشائیہ نگاری کی عکاسی کرتا ہے۔

کاچو اسفندیار خان کا ایک مجموعہ انشائیہ ''پرکالہ گُفتار'' قارئین کو نظر نواز ہوا ہوگا۔ کاچو اسفندریار خان لداخ میں رہتے ہیں بلتی اور اردو زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں طوالت پائی جاتی ہے۔ مذکورہ مجموعے پر پروفیسر محمد زمان آزردہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے قبل ان کے انشائیے وادی کے کئی رسالوں کی زینت بنے ہیں جن میں رسالہ ''نگینہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مذکورہ مجموعے میں کل انشائیوں کی تعداد سولہ ہے جس میں بڑے ہی قرینے سے بات میں سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان انشائیوں پر مضامین کا شائبہ ہوتا ہے مگر یہ تاثر بھی زیادہ دیر تلک نہیں رہتا ہے۔ آپ ایک ترجمہ کار بھی

ہیں، آپ اردو، بلتی، پرگی سے انگریزی میں ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ پروفیسر محمد زمان آزردہ کاچو اسفندیار کی انشائیہ نگاری سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''ایک بات بتانے کی یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ انشائیہ میں موضوع کے ہر پہلو کا احاطہ کیا جائے، کچھ چیزیں اوروں کے لئے بھی چھوڑ دینا اچھا ہے۔ وہ یوں بھی کہ اختصار انشائیہ کا زیور ہے اس سے اس کو محروم کرنا زیادتی کرنا ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ کاچو اسفندیار خان آگے اور انشائیہ لکھتے رہیں گے اور اختصار کا بھی خیال رکھیں گے''۔

(پرکالہ گفتار، ص: ۱۵۔۱۴)

ان کے کئی انشائیے قارئین کو حظ اٹھانے کے لیے اکساتے ہیں جن میں داڑھی، پیاز، گدھے اور کہانی کتوں کی وغیرہ۔

عبدالغنی شیخ ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ ان کے چند انشائیے رسالہ ''نگینہ'' میں شائع ہوئے ہیں۔ انشائیوں کو اکثر طول دیتے ہیں اور انشائیے طوالت کے سبب مضامین بن جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں طنز ومزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ لفظی برتاؤ میں تاریخ کی سیر ہو جاتی ہے۔ جموں کشمیر ولداخ کے انشائیہ نگاروں میں ان کے انشائیے کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہیں زبان وبیان پر دسترس حاصل ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات بھی انوکھا پن لئے ہوئے ہیں۔

عطا محمد میر: عطا محمد میر کے اندر بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار چھپا ہوا ہے۔ وہ کسی بھی موضوع کو بڑے ہی قرینے سے لفظوں کی تار پود میں بُن لیتے ہیں۔ ان کی لفظیات میں رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کے اندر ان کا منفرد اسلوب جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ کفالت، میں بے حد خوبصورت پیرائے میں ماں کی محبت اور محنت کا اثر بہت ہی دلکش اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں

چرواہا، کفالت، جنگلی، کاٹھ کا دروازہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر محمد شفیع ایاز فطری طور پر افسانہ نگار ہیں مگر صنف انشائیہ کی طرف بھی مائل دکھائی دیتے ہیں۔ان کا ایک مجموعہ انشائیہ ''خرافات'' ۲۰۲۱ء میں منظرِ عام پر آیا ہے جس میں کُل ۳۶ مختصر انشائیے ہیں۔ان کے یہاں سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں پر روک لگانے کا اصلاحی مقصد گردش کر رہا ہے۔وہ خود لکھتے ہیں:

''خرافات کی تحریروں کے پیچھے یہی حقیقت کارفرما تھی کہ ہم اور ہمارا سماج اخلاقی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی معاملات میں اخلاقی طور دیوالیہ پن کا شکار ہوا ہے۔مسکراہٹوں کی پھلجھڑیوں کے لبادے میں سماجی برائیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وقتی ہنسی اور دیرپا سوچ کے دروازے کھلنے کی توقعات موجود ہیں۔

(خرافات۔ص۵)

ڈاکٹر محمد شفیع ایازؔ کے انشائیوں کے اسلوب میں حسن کاری کی شعوری کوشش جا بجا ملتی ہے۔ان کے اکثر انشائیے حسن و جمال کے ماحول کی عکاسی لئے ہوئے ہیں جن سے ان کے طرز نگارش میں جدّت سی نظر آتی ہے۔خرافات، اور نیتا بن گئے، اَن پڑھ گریجویٹ، شاعر اور شاعری، دال میں کچھ کالا ہے، اور 'عوام کون' ان کے وہ انشائیے ہیں جو ایک باذوق قاری کو انشائیہ کے متنوع زاویوں سے روشناس کرا کے انہیں مطالعہ کرنے پر اُکساتے ہیں اور بار بار کئی نئے زاویوں کی جستجو لئے ہوئے ہیں۔ان کے انشائیوں میں حِس مزاح بدرجۂ اُتم موجود ہے۔ان کا مزاج انشائیہ کے لئے موزوں ہے۔انہوں نے کہیں کہیں اپنی ذات کو مختلف النوع تجربوں کی صورت میں پیش کیا ہے جس سے ان انشائیوں کی زمینی حقیقت میں اور زیادہ قوت و استحکام پیدا ہوا ہے۔

محمد سلیم سالک: محمد سلیم سالک بنیادی طور پر افسانہ کی پرکھ اور سوجھ بوجھ

رکھتے ہیں اوراس جانب ان کا ذہنی وفکری میلان نظر آتا ہے۔ابتداً روزنامہ " کشمیر عظمی" کی وساطت سے کالم نگاری کی طرف آئے اور یہاں سے انہیں اظہار کا بھرپور موقع حاصل ہوا۔انہوں نے کالم نگاری میں بہت کم وقت میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انشائیہ نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے اوراس وسیلے سے وہ اپنی بات قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔اس صنف میں وہ بغیر جھجک من کی بات کہہ لیتے ہیں۔ان کی انشائیہ نگاری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ معاشرے کے زوال آمادہ ماحول کا ادبی آپریشن کرتے ہیں۔آپ کے انشائیوں میں ظرافت کی تہہ سے طنز کے صدف اچھلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور برمحل موضوع کے ساتھ ساتھ ان ناگفتہ بہہ حالات کی عکاسی کرتے ہیں جس کی پشت پر اصلی حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔اس ضمن میں بالخصوص ان کے انشائیے جن میں ''ابلیس:فن اور شخصیت' ،کرونا ادب ،من نہ دانم فاعلاتن فاعلات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔مذکورہ انشائیوں میں طنز کے نشتر پائے جاتے ہیں جو زوال آمادہ معاشرے کے سینے میں پیوست دیکھے جاسکتے ہیں۔ان میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ ظرافت کے ذریعے عام قارئین تک پہنچ جاتے ہیں۔سلیم سالک کے انشائیوں سے جموں وکشمیر کی انشائیہ نگاری میں ایک نئی وسعت آ گئی ہے۔آپ کے سیدھے سادے بیاں اورمنفرد اسلوب سے یہاں انشائیہ نگاری کو مناسب ماحول فراہم ہوا ہے اور ایک نئی جلا دیکھنے کو ملتی ہے۔

ایس معشوق احمد کا ایک مجموعہ ''کوتاہیاں'' زیورطبع سے آراستہ وپیراستہ ہوا ہے۔آپ اکثر یہاں کے رسالوں اوراخبارات کی زینت بنتے ہیں اور ہر ہفتہ آپ کی کوئی نہ کوئی تحریر قارئین کو پڑھنے کو مل جاتی ہے۔وہ نہ صرف اپنی تحریروں سے بلکہ اپنی گفتگو میں بھی اسی اسلوب کو اپنائے ہوئے ہیں۔اُن کی مذکورہ صنف کی اسی ہم آہنگی

کے سبب انہیں تکنیکی طور پر راس آئی ہے اور کہیں کہیں طنزیہ اسلوب ان کے مزاح والے اسلوب پر غالب آجاتا ہے۔

ڈاکٹر الطاف شاہین: ڈاکٹر الطاف ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی مذکورہ صنف کے حوالے سے بھی پایۂ تکمیل تک پہنچائی ہے۔ جموں وکشمیر میں اردو انشائیہ وانشائیہ نگاری، کے موضوع پر انہوں نے بہت اچھا تحقیقی کام سرانجام دیا ہے تو اس حوالے سے اُن کی ذاتی تخلیقی دلچسپی بھی انشائیہ کی جانب بڑھنے لگی اور کئی کامیاب انشائیے تخلیق کئے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ کبھی طنزیہ اسلوب بھی اختیار کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے تجربوں سے انشائیہ کی تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ ابھی تک اُن کا اس صنف کے حوالے سے اگرچہ کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے مگر تخلیقی عمل کو جاری رکھتے ہوئے رسالوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

۲۰۱۰ء میں خاکسار یعنی گلزار احمد وانی کا مجموعہ ''وادیٔ امکاں'' منظرِ عام پر آیا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں ۱۰ انشائیے اور چند افسانے بھی موجود ہیں۔ ابھی تک میرے دو انشائیوں کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پھر ۲۰۲۱ء میں اُن کا ایک اور مجموعہ ''دہلیز'' شائع ہوا ہے جس میں ۲۲ انشائیے شامل ہیں۔ پروفیسر منظر حسین رقمطراز ہیں:

> ''دہلیز ایک استعارہ ہے جو معاشرتی زندگی کے کیف وکم کا مشاہدہ سنجیدگی سے کرنے کا ہے۔ اس میں عصری زندگی کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کا ادبی آپریشن کیا گیا ہے۔ اسی کا ثمرہ کہیئے کہ ڈاکٹر گلزار احمد وانی کے یہاں موضوعات کے انتخاب اوراس کی فن کارانہ پیش کش میں جدّت وندرت بھی ہے۔

غبارے، تحلیل، کُرسی، روزنِ دیوار و در، ٹی وی انٹینا، دہلیز، خواب، نمک،

سایہ اور آئینہ وغیرہ راقم کے مشہور انشائیے ہیں۔

گزشتہ صدی سے لے کر موجودہ صدی کے عشرہ دوم تک جن قلم کاروں نے انشائیہ کی جانب توجہ مبذول کرائی اُن کے یہاں مقصد پسندی کا غالب رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہیں کہیں ظرافت طنزیہ اسلوب لئے ہوئے ہے جس سے انشائیہ کی باگ ڈور بندھی ہوئی ہے اور یہ اسلوب اکثر انشائیہ نگاوں کے زیرِنظر رہا ہے اور ادب برائے زندگی اور اس کے جلیل القدر مقاصد کے حدود کا تعین بھی کرتے ہیں۔

اس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ طنز و مزاح کے مقابلے میں انشائیہ نگاری کی صنف کافی مقبول تصّور کی جاسکتی ہے جہاں تک جموں وکشمیر کی بات ہے، تو اس کے سمت و رفتار میں مزید سرعت لانے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ طنز و مزاح کی صورت حال میں کچھ زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے مگر یہ مایوس کن بھی نہیں ہے۔ یہی صورت حال ملکی سطح پر بھی ان اصناف کی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ انشائیہ نگار ایسے بھی ہوں جو باضابطہ طور پر تخلیقیت کے عمل سے گزر رہے ہوں۔

مختصر یہ کہ اکیسویں صدی میں جہاں ایک طرف ایک قاری کے لئے کُتب بنی کے مراحل سے گزرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے وہیں اُس تناظر میں بھی تخلیق کار تخلیقیت کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ اس سب کے باوجود جموں وکشمیر میں اردو انشائیہ ایک ایسی سمت کی طرف رواں دواں ہے جہاں وہ کسی بھی حائل رکاوٹ کو ایک طرفہ چھوڑ کر آگے آگے سیل رواں کی مثل دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بھی ذرخیز ہے ساقی

☆:...... پروفیسر محمد زمان آزردہؔ

شرافت

شرافت کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اگر مجھے کسی آدمی کے بارے میں ذرا بھی شک ہو جائے کہ یہ شریف ہے تو مجھے ہنسی ضرور آتی ہے۔ دراصل اس 'قدر' پر اتنے پردے چڑھتے ہیں کہ اس کا اصلی چہرہ ہی نظروں سے مفقود ہو کے رہ گیا ہے۔ جب سے ہندوستان میں شریف آدمی جنٹل مین ہو گیا ہے اس زمانے سے اس کا مفہوم اور بھی بدل گیا ہے۔ شریف آدمی اگر آپ کے سامنے کھڑا ہو، سامنے کیا، چپکے سے تصور میں بھی آ جائے تو آپ ضرور ہنسیں گے۔ اس کے ایک گال پر تھپڑ مار کر آپ دل ہی دل میں لطف اندوز ہوں گے اور جب وہ دوسرا گال بھی پیش کرے گا تو آپ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دوسرا تھپڑ بھی رسید کر دیں گے اور یہ آپ کا اس پر احسان ہوگا کہ آپ نے اس کی ضرورت پوری کر دی ورنہ آج کل کے زمانے میں کون بغیر فیس کے ہاتھ اٹھاتا ہے۔

کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جب اپنا سب کچھ دے کر فقط کچھ گالیاں یا اپنے خلاف دو چار مضامین یا دو چار جوتے لے لیتے ہیں تو اوروں کی نظر میں شریف ہو جاتے ہیں۔ گالیوں کا جواب کوئی کیا دے مگر مضامین سے شہرت ہو جاتی ہے اور جوتوں کے بوجھ سے تو سر واقعی جھکا رہتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اور شرافت آ گئی۔

شرافت کو جو ایک ہی لفظ سمجھا جاتا ہے، یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ اصل میں یہ دو الفاظ ''شر'' اور ''آفت'' کا مرکب ہے۔ ممکن ہے یہ ایک دوسرے کو Neutralise

کرتے ہوں یا ایک دوسرے کے انٹی ڈوٹ ''Antidote'' ہوں۔ پرانی کہاوت ہے کہ ''ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔'' Diamond cuts diamond اسی لئے اب بھی اس اصطلاح کے ساتھ ہی ایک حسین تصویر ذہن میں اُبھرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ باشرافت ''شر'' اور ''آفت'' اپنے لئے ہوتا ہے۔ یا دوسروں پر اس انداز سے نازل ہو جاتا ہے۔ بھلا ہو پریم چند کا جس نے گدھے کی نشاندہی کر کے شرافت کے ایک خاص پہلو سے لوگوں کو واقف کرایا تھا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ شریف پر خدا کا فضل ہوتا ہے پھر یہ کہنا عجیب ہے کہ اس پر لوگوں کی پھٹکار کیوں ہوتی ہے۔ خدا کے پیاروں پر لوگ کب مہربان ہوتے ہیں۔ انھیں تو اسی سے پیار ہوتا ہے، جس پر خدا کی پھٹکار ہو۔

مثلاً لوگ شیطان پر دل و جان سے فریفتہ ہیں لیکن خدا نے اسے اپنے سے دور کر دیا۔ باعزت عہدے سے ہٹا دیا۔ اس دربار کا سزا یافتہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے کہ خدا دل میں رہتا ہے تو یہ بھی جھوٹ نہیں کہ شیطان انسان کی رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔ ہمارے ڈاکٹر بے چارے کیا جانیں انھیں تو خوردبین میں صرف ریڈ بلڈ سیلز R.B.C اور وائٹ بلڈ سیلز W.B. C نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں اتنا پاورفُل میگنفائنگ گلاس Magnifying glass کہاں سے آئے جو اس کو دیکھ سکے۔ شیطانی سیل تو ہمارے اس میگنفائنگ گلاس کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ کبھی سرخ اور اور کبھی سفید لباس میں رہتے ہیں برا ہو اس شیطان کا' دیکھئے چپکے سے حملہ کر دیا اور میں شرافت سے دور ہونے لگا۔ اچھا ہوا کہ جلدی یاد آ گیا ورنہ یہ کہاں چھوڑتا۔

کچھ لوگ شریف آدمی اس کو سمجھتے ہیں جو اُن سے کلاس میں سوال نہ کرے اور اگر کرتے بھی تو اسی جواب پر اطمینان کا اظہار کرے جو پروفیسر دے سکے۔ آفیسر کے

سامنے وہی ماتحت شریف ہوتا ہے جو چھٹی کم لے اور آفیسر کی ہر بات مان لے، کبھی بحث نہ کرے، صبح سویرے آئے اور رات کو دیر سے گھر جائے، دن بھر کام کرتا رہے اور اپنے آفیسر کی شریفانہ افسری کی قسمیں کھاتا رہے۔ آج کل تو جمہوریت کا زمانہ ہے، جس کے ساتھ جتنے زیادہ لوگ ہوں وہ اسی قدر شریف اور عقلمند مانا جاتا ہے۔ اب اگر ہمارے نوجوان طالب علم لیڈروں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، وزارت کی فکر میں رہتے ہیں، وزیرانہ ٹھاٹ چاہتے ہیں تو یہ کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں۔

شاعروں کے نزدیک تو شریف وہی ہے جو ان کے ہر مصرعے کی داد دے۔ اس کی انھیں پروا نہیں کہ وہ بعد میں ان سے شعر کا مفہوم کیوں پوچھتا ہے۔ لڑکیوں کے آگے شریف آدمی کا تصور کچھ اور ہی ہے جو آدمی محفل میں آنکھیں نیچی کئے رہے، باتیں کم کرے اور اداکاری زیادہ اور پھر بھری بزم میں کبھی کبھی کنکھیوں سے دوسروں کی نظر بچا کر کسی ایک کی طرف دیکھے اور بعد میں موقع پا کر علاحدہ سے ان کے حسن کی تعریف کرے، وہ شریف ہے۔ وہ دوسری لڑکیوں سے بھی ایسی ہی باتیں کیوں نہ کرتا ہو، ایسے ہی اشاروں سے ان کو بھی ممنون احسان کیوں نہ کرتا ہو۔ مگر یہاں شرافت کا معیار یہ ہے کہ وہ لڑکیاں ایک دوسرے کی باتوں سے بے خبر ہوں۔ پھر شرافت کا بھرم اور وقار قائم ہے اور جب یہ راز بھی فاش ہو تو یہی آدمی ''شر'' اور ''آفت'' بن کر کسی اور شہر کا رخ کرتا ہے۔ بیگمات کی Vocabulary میں تو یہ موصوف ایک اور ہی انداز میں بسا ہوتا ہے۔ جو آدمی آپ کو راستے میں گود میں ایک بچہ لئے اور دوسرے کی انگلی تھامے چلتا نظر آئے اور آگے آگے اس کی بیگم ایک رنگین ساڑی میں ملبوس، قلوپطرہ، کا خیالی روپ دھار کر چل رہی ہو اور کبھی کبھی مُڑ مُڑ کر تبسّم فرما رہی ہوں تو جان لیجئے کہ یہ اس کی شرافت کا خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا ہے اور وہ اس کی شرافت پر دل و جان سے فریفتہ ہے۔ نوجوان لڑکے تو خیر کافی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، انھیں ہر جوان لڑکی شریف نظر آتی ہے لیکن جس سے ان میں

سے کسی ایک کی شادی ہو جاتی ہے، وہ ذرا غیر شریف سی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ دوسروں کی بیویاں اس کو پھر بھی شریف محسوس ہوتی ہیں مگر گھر کی مرغی تو دال برابر ہوتی ہے۔ دال مزیدار ہوسکتی ہے، مرغوب ہوسکتی ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے تو خاص طور پر بھوک پیدا کرنے والی ایک ایجنٹ ہوسکتی ہے مگر اس کے گلنے میں جو دیر لگتی ہے، پھر شریف کیسے ہو سکتی ہے۔

مولویوں اور برہمنوں کی کچھ نہ پوچھئے۔ ان کے سامنے شرافت اور بیوقوفی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس آدمی میں ذرا سی عقل ہوتی ہے وہ ان کے علم میں غیر شریف ہو گیا۔ امرأ اور وزرا کے نزدیک تو شریف وہ ہیں جو کبھی اپنے مطلب کی بات نہیں کریں گے بلکہ ووٹ دے دے کر ان کی مطلب براری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ پیسے والوں کو اسی لئے آدمی سے زیادہ مشین پسند ہے جو بٹن پر چلتی ہے۔ کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اگر کہیں کوئی پرزہ ٹوٹ گیا تو ان کی نظر میں وہ بھی کسی آدمی کی کوئی غیر شریفانہ حرکت ہوتی ہے۔

انسان تو ہڑتال کرتے ہیں۔ انھیں بھوک لگتی ہے۔ بازار کی مہنگائی انھیں متاثر کرتی ہے۔ وہ آبادی بڑھاتے ہیں۔ مشینوں کے لئے ایسا کوئی مسئلہ نہیں اور جس روز کام کرنے والے مزدور بھی لوہے کی مشین بن جائیں گے، اس دن سب شریف ہوں گے اور مالک بھی انھیں پسند کریں گے۔

میرے خیال میں جتنا Exploit شرافت کو کیا گیا ہے، شاید اتنا کسی اور ''قدر'' کو نہیں کیا گیا ہے۔ خیر ایک بات ہے کہ اس طرح عقلمندوں کی تفریح کا سامان بن گیا ہے، وہ ہر شریف آدمی میں ایک Comic Character دیکھ لیتے ہیں۔

●●●

☆:...... پروفیسر محمد زمان آزردہ

شامتِ اعمال

ایک زمانے سے میں اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ جب گناہ اور ثواب کا دارو مدار نیت پر ہے تو لوگ شامتِ اعمال کیوں کہتے ہیں، شامتِ نیت کہنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟ لیکن کبھی اس کا تشفی بخش جواب ڈھونڈنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات کسی شادی شدہ آدمی کے منہ سے نکلی ہے۔ اس لئے کہ انسان جب دنیا کی تمام پریشانیوں سے فراغت حاصل کرنا چاہتا ہے تو شادی کی نیت باندھتا ہے اور جب شادی کر لیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس نے ایک ایسی پریشانی سے ناطہ جوڑا ہے جو نہ صرف مستقل ہے بلکہ دنیا بھر کی پریشانیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور ہر عمل پر شامتِ اعمال کی مالا جپنا پڑتی ہے۔

شادی سے پہلے کہی ہوئی غزلیں شادی کے بعد کچھ دن تک قصیدوں میں بدلتی ہیں۔ ان کو اونچی آواز ہی میں دہرانا پڑتا ہے۔ خواہ خلوت میں ہی سہی۔ ایسے قصیدے پڑھتے ہوئے اداکاری سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ ممدوح کوئی راجہ، مہاراجہ یا ملکہ وکٹوریہ نہیں بلکہ وہ شخصیت ہوتی ہے جسے عرفِ عام میں تو بیوی کہتے ہیں لیکن بعض لوگ پیار سے جیلر، ڈکٹیٹر وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ ایسے قصیدوں کے حسنِ طلب میں بجائے کچھ مانگنے کے اپنے آپ کو پیش کیا جاتا ہے۔ تجدیدِ عہدِ وفا ہوتی ہے اور اگر کوئی مانگے بھی تو شامتِ اعمال سے زیادہ مانگنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آگے چل کر تو دولہا اور اصنافِ سخن کو بھول کر صرف اپنے ارمانوں کا مرثیہ کہتا ہے پرانی کہاوت ہے کہ ”بگڑا شاعر، مرثیہ

گو...........اس پر مجھے یقین تو نہیں ہے مگر دولہا کی شاعری کو سامنے رکھا جائے تو اس میں شک کی بھی بہت کم گنجائش نظر آتی ہے......اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں شاعری بعد میں بگڑتی ہے اور شاعر پہلے بگڑتا نظر آتا ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ عقل کے دروازے انسان پر اس جرم کی سزا پانے کے بعد ہی وا ہوتے ہیں جسے عرف عام میں ''شادی'' کہتے ہیں۔ شادی سے پہلے عام طور پر انسان خواب دیکھتا ہے اور اس کے بعد ان کی تعبیر کے لئے نیت باندھتا ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس معاملے میں، میں نے تعبیر پہلے دیکھی ہے خواب بعد میں۔

وہ یوں کہ ابھی خواب دیکھنے کی عمر ہی نہیں ہوئی تھی کہ بزرگوں نے میری شادی کی نیت باندھی۔ ظاہر ہے کہ خود ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ نابالغ کی نیت شرعاً درست نہیں۔ البتہ ریہرسل کے طور پر میں نے ان تمام رسوم کو ادا کیا جن کی مجھ سے توقع کی جا سکتی تھی اور جب خواب دیکھنے کے لائق ہوا، یعنی ہوش سنبھالا تو معلوم ہوا کہ وہ ریہرسل ہی فائنل شو تھا اور اسٹیج پر ایسے پکڑا گیا کہ اب تک اداکاری کا وہ سلسلہ برابر چل رہا ہے۔ چچا غالبؔ نے اسی حالت کو یوں بیان کیا تھا۔ ع

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

کئی مرتبہ جو میں نے تماشائیوں کو چھوڑ کر دامن جھاڑنے کی ٹھانی تو معلوم ہوا کہ ریہرسل کے وقت جس کنٹریکٹ پر میں نے دستخط کر دیئے ہیں اس کو توڑنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے کم سے کم دوسرا جنم لینا پڑے گا۔

گویا میری شادی رسل (B.Russel) کے مطابق اصل فلسفہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصلی فلسفہ وہ ہے جو معلول سے علت کی طرف سفر کرے۔ البتہ ان کا فلسفی ممکن ہے یہ سفر پورا کر بھی لے مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں جس معلول Effect سے چلا ہوں اس کی علت Cause بھی پاؤں گا یا نہیں۔ ابھی تک تو یہی سمجھ میں نہیں آیا کہ

شادی کر کے جو پریشانیاں اپنے سر لے لی ہیں کیا واقعی میں ان کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔

ہمارے معاشرے میں اکثر شادیاں آنکھ بند کر کے کی جاتی ہیں۔ میں اپنے معاملے میں اتنا کہوں گا کہ یہ میری بلائنڈ (Blind) چال تھی جس میں اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے ہار بیٹھا۔ جب پتے (Card) دیکھنے کی نوبت آئی تو بساط اُلٹ چکی تھی اور عام طور پر چونکہ یہ بازی عمر میں ایک ہی مرتبہ کھیلی جاتی ہے اور زندگی بھر کا سٹہ ہوتا ہے، اس لئے جیتے تو عمر بھر کے لئے اور ہارے تو ہمیشہ کے لئے۔ کچھ لوگ ضرور جان بوجھ کہ بلائنڈ کھیلتے ہیں تاکہ چال ڈبل ہو۔ لیکن اس سے شادی اور جوئے میں فرق ہی نہیں رہتا۔

میں نے ایک مرتبہ اپنی ایک نشری تقریر میں یہ کہا تھا کہ مرد اور عورت دونوں فطرتاً آزاد ہیں مگر اس میں شادی کو بھی خاصا دخل ہے۔ وہ اس طرح کہ عورت کا احساسِ آزادی شادی کے بعد جاگتا ہے اور مرد کا یہ احساس شادی کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ شادی سے پہلے مرد کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، ہر ایک پر دھونس جماتا ہے۔ مگر شادی کے بعد بھیگی بلی۔ اس کے لئے پانی بھی درکار نہیں ہوتا۔ پسینہ یہ کام خود ہی پورا کر دیتا ہے۔ لڑکی شادی سے پہلے شرمائی، لجائی، سر جھکائے رہتی ہے۔ گفتگو ایسی کہ جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ ہر حرکت میں نزاکت۔ بس سمجھ لیجئے کہ گل کی ٹہنی۔ مگر شادی کے بعد یہی شاخ گل، پھلجھڑی میں بدل جاتی ہے جس میں شاخ گل کی تمام رنگینیاں نظر آتی ہیں مگر پارے کی خصوصیات بھی شامل ہو جاتی ہیں اور حرارت بھی بڑھ جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شادی کے بعد لڑکی کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس بات میں تو شک کی گنجائش بہت کم ہے کہ شادی کے بعد لڑکے کی عقل ماری جاتی ہے۔ وہ جزوی طور پر اندھا، بہرا، اپاہج، سب ہی کچھ ہو جاتا ہے۔ بیوی کی عینک سے دیکھنا، اس کے کانوں سے سننا، اس کے ارادے سے سفر کرنا، خود اعتمادی میں کمی آنا۔

شادی کے بعد یہ دولہا کا معمول ہو جاتا ہے۔ بیوی کی مرضی سے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنا، ان کی درجہ بندی کرنا اور خاطر مدارات میں اپنے آپ کو لٹا دینا۔ شادی کے بعد یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔ سب سے دلچسپ بات جس پر میاں شامتِ اعمال کی گردان کرتا رہتا ہے، یہ ہے کہ گھر عدالت میں بدل جاتا ہے اور روز ہی کوئی نہ کوئی مقدمہ دائر ہوتا ہے۔ جرح، صفائی، سب ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ البتہ یہاں مدعی یعنی بیوی خود ہی منصف بھی ہوتی ہے۔ اگر کہیں میاں نے صفائی پیش کرنے میں مستعدی دکھائی تو منصف اپنا فیصلہ چند آنسوؤں سے یا روٹھ جانے سے سنا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دعویٰ سچا اور دلیل جھوٹی۔

آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں، وہ یہ کہ میرا ایک دوست کالج میں ہمیشہ انگلستان جانے کی باتیں کیا کرتا تھا کہ کالج سے چھوٹتے ہی ولایت جا کر بار ایٹ لا کریں گے۔ جب کالج سے فراغت ہوئی تو وہ واقعی غائب ہو گئے۔ دوستوں نے یہی خیال کیا کہ ولایت گئے ہوں گے۔ کوئی دو سال کے بعد میں نے ایک دن ان کو ایک دوکان سے بے بی فیڈر خریدتے دیکھا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے دوران میں نے یہ پوچھا کہ انگلستان سے کب لوٹے تو ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولے۔ بھئی جس کام سے وہاں جا رہا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ وہ یہیں ہو رہا ہے۔ میں نے کہا وہ کیا؟ تو بولے بھئی میں نے شادی کر لی۔ اس پر میں نے طنزاً کہا۔ اچھا تو شادی کے لئے انگلستان جانے کا ارادہ تھا۔ یہ سن کر وہ بولے۔

''ارے بھئی جانا تو وکالت کے لئے تھا، مگر ابا جان نے کچہری گھر ہی بلا لی۔ دھیرے دھیرے وہیں سیکھ رہا ہوں۔ شادی کے بعد کچھ دن تک تو خیال تھا جانے کا، مگر بیوی نے تنہا جانے نہیں دیا۔۔ بعد میں بزرگوں نے سمجھایا کہ جب بیوی کے ساتھ ہی رہنا ہے تو انگلستان جانے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ زندگی میں کامیاب وکیل بننا ہے تو

بیوی سے جرح کرو۔ میرا خیال ہے اب تک کافی وکالت سیکھ لی ہے اور قانون کا مطالعہ کرنے سے بھی بچ گیا۔ آج کل میں کوئی پندرہ فیصد تک اپنی صفائی پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ بس یہ تمنا ہے کہ کبھی جرح میں بیوی کو ہرا سکوں۔ اس کے بعد کوئی وکیل مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں بھی پھر پیشہ ور وکیل ہونے کا اعلان کر دوں گا۔ دعویٰ تو کوئی بھی کر سکتا ہے البتہ دلیل تراشنا اور اچھی خاصی دلیل کو رد کرنا اصل چیز ہے اور اس میں بیوی سے زیادہ ماہر کوئی نہیں ہو سکتا۔''

شادی کے بعد مرد کی ترجیحات کا مسئلہ بھی اس کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ اپنے لنگوٹیے یاروں سے بھی ملنے کا وقت نہیں ملتا۔ جب آپ کا کوئی دوست اچانک آپ سے ملنا ترک کرے تو یہ خیال نہ کیجئے کہ کوئی دفتری مصروفیت ہو گی یا متکبر ہوا ہو گا۔ البتہ اپنی سوچ کا سلسلہ یہاں سے شروع کیجئے کہ شادی ہوئی ہو گی۔ دفتر میں آپ کا کوئی ساتھی دیر سے آنا شروع کرے اور آئے دن رخصت مانگے تو یہ خیال ہرگز مت کیجیے کہ کوئی پارٹ ٹائم (جز وقتی) نوکری یا سائیڈ بزنس کر رہا ہے بلکہ پہلے اس بات کی تحقیق کیجئے کہ بے چارے کی شادی تو نہیں ہو گئی۔

شادی کے بعد زبان کا مزہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اچھے بھلے کھانے میں کیڑے نکالنے والا چپ چاپ کھانا نگل لیتا ہے۔ والدہ، بہن، بھائی یہاں تک کہ نوکروں سے بھی کھانے کے معاملے میں اُلجھنے والا بیکار کھانے کی بھی تعریف کرتا ہے۔

میں ایک مرتبہ اپنے ایک دوست سے بات کر رہا تھا کہ برسبیل تذکرہ ہوسٹل کے کھانے کا ذکر آیا تو کہنے لگے کتنے پاگل تھے ہم لوگ! اچھے بھلے کھانے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ ہم نے ایک کیٹرنگ انسٹی ٹیوٹ Cattering institute کھول رکھا ہے اور ہماری بیوی اسٹوڈنٹ Student کی حیثیت سے آ گئی ہیں روز ہی ایک دوہرا پریکٹیکل Practical ہوتا۔ ایک طرف کھانے والوں کی gn

قوتِ برداشت کو آزمایا جا رہا ہے اور دوسری طرف کھانا پکانے کی مشق بھی ہوتی ہے۔ ہمیں اس سے یہ بھی فائدہ ہوا کہ نصف سے زیادہ سادھو ہو گئے۔ ترک لذات کے بعد ترک دنیا میں کافی آسانی ہوگی۔ اتنے میں چائے آ گئی تو دیکھا کہ شکر نہ چائے میں ہے اور نہ ٹرے میں۔ چمچ بھی نہیں جو اندازہ ہوا کہ چلائی نہیں گئی۔ زبان تو کہہ رہی ہے کہ ؏

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا...... اور پھر میاں کی طرف دیکھا۔ جوڑے مزے سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے تو میں نے بھی اس تجربے میں اپنی شرکت کو نامناسب خیال نہ کیا۔

شادی کے بعد کتنے ہی باتونی انسانوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ دل تو چاہتا ہے مگر ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' والی بات ہو جاتی ہے۔ میاں کی حالت تو یہ ہو جاتی ہے کہ ؏

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پرانی کہاوت ہے کہ خاموشی بہتر ہے۔ یہ مشورہ دراصل شادی شدہ لوگوں کے لئے نسخۂ کیمیا کے برابر ہے۔ کیونکہ بعد میں تو بولنے کی تمنا ہی رہ جاتی ہے۔ اس لئے شادی سے قبل خاموش نہ رہا جائے تو بہتر ہے۔

خیر میں ٹھہرا شادی شدہ آدمی۔ میرے لئے اس نسخہ کو آزمانا، پگڑی سنبھالنے کے لئے بھی ضروری ہے اور گھر واپس جانے کے لئے بھی! ۔ ورنہ لوٹتے ہی ایسی جواب طلبی ہوگی کہ بغیر ''شامتِ اعمال'' کہے کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

●●●

☆۔۔۔پروفیسر محمد زماں آزردہ

چاند سے عید تک

یہ عنوان سننے میں کچھ عجیب ضرور ہے مگر ان دولفظوں میں سے کوئی ایک بھی سنئے تو ذہن میں دوسرے کے خطوط ضرور اُبھر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں کے معنوی تعلق کی وجہ سے محاورے وضع ہوئے ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص اگر کافی مدت تک نظر نہیں آتا تو کہا جاتا ہے کہ آں صاحب یا فلاں صاحب عید کا چاند ہو گئے اور یقین کیجئے اکثر عید کا چاند بننا بھی انسان کو بہت لطف دیتا ہے۔ مفت میں لوگ آسمانوں پر سجا دیتے ہیں۔ عورتیں چاند دیکھتے ہی دعا مانگتی ہیں کہ یہ عید کا چاند ثابت ہو حتیٰ کہ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کے لئے عید کا چاند باعث مسرت کم اور تکلیف کا باعث زیادہ ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ دونوں لفظ مل کر دلوں کو گرمانے اور دماغ کو خیالی خوشیوں سے بھرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ عید الفطر کا جہاں تک تعلق ہے یہ دونوں ایک ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ ادھر چاند نکلا۔ اُدھر عید آئی۔ ایسا ساتھ تو بس اسی ایک موقع پر نظر آتا ہے۔ آسمان پر چاند نظر آتا ہے اور زمین پر اس کی چاندنی ہر صاحب دل کو جگمگا دیتی ہے۔ کسی کی چاندی ہوتی ہے اور چاندی کے لئے سونا بنا جاتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ چوں کہ بہت جلدی میں ہو جاتا ہے اس لئے زود فہم اور حد درجہ کے حساس ہی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر ان دونوں میں کچھ فاصلہ ہوتا تو چاند اور عید میں پورے نو دن کا راستہ ہے۔ چاند سے عید تک ممکنہ اثرات کچھ اور ہوتے۔ خیر خدا نے دُنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں رکھی ہے۔ بقر عید کو لیجئے۔ اصل عید کا خیال تو

اسے بہرصورت نو کے نو دن گھیرے رہتا ہے۔ کچھ بے تاب بچے چاہتے ہیں کہ عید جلد سے جلد آ جائے۔ اکثر نوجوان بھی اس میں ان کے ساتھ اگر آواز نہیں تو خیال ضرور ملائے ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں گا گا کر عید کی رفتار کو تیز کرنا چاہتی ہیں مگر بڑے بوڑھے یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتے ہیں۔ کبھی تو وہ اپنی کھوئی ہوئی رفتار کی وجہ سے عید کو بھی نشست رو بنانا چاہتے ہیں لیکن جب اپنی نوجوانی کی عیدیں یاد آتی ہیں تو چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ عید کے بارے میں جو تیرہ سو سال سے زیادہ کی عمر ہونے پر بھی جوان لگتی ہے سوچنے پر ایک حسرت بھری آہ نکال کے رہ جاتی ہے۔ اس کی آن بان وہی ہے اور وہ چند ہی برس میں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مگر گزرا ہوا زمانہ ان سے اور دور ہوتا نظر آ رہا ہے اور عید نزدیک۔ اُن کو وہ سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے جس کو دیکھ کر ان کی زندگی کی کتاب کے کتنے ہی اوراق اُن کے سامنے اُلٹ کے رہ جاتے ہیں۔ کاش! ایسے بھی انہیں اُن کے پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔

یکم ذی الحج کو جوں ہی عید چاند کے جہاز سے پیراشوٹ کے ذریعہ اُڑنے کی خبر دیتی ہے تو بھیڑوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قصائی اپنی چھریوں کو تیز کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ لوگوں کے دل قربانی کے جذبے پر قربان ہونے لگتے ہیں۔ جس طرح زمین پر اپالو گیارہ کے چاند پر اترنے کا انتظار کیا گیا تھا بالکل اسی طرح لوگ چاند کے اس خوش کن مہمان کے خوش آمدید کے لئے دن رات تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

دوکاندار خوش رنگ لیبل لگا کر اپنی چیزیں اس کی راہوں میں بچھا دیتے ہیں۔ کتب فروش اور ناشر عمدہ سے عمدہ عید کارڈ چھپوا کر اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومتیں عام تعطیلات اور دیگر رعایات سے اس آسمانی مہمان کو

اپنی نیک خواہشات کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ بیک وقت سرکاری مہمان بھی ہوتا ہے اورعوامی مہمان بھی۔اس کے لئے کسی خاص عمارت کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ ہر گھر کے دروازے اس کے لئے کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔اگر چہ کسی بھی حکومت یا سلطنت میں دلوں کی حفاظت کو فرض اولین سمجھا جاتا ہے مگر اس پر دلوں کی دنیا بھی وقف ہوتی ہے جس طرح چاہئے دلوں پر حکومت کرسکتا ہے اوران سے کھیل سکتا ہے۔

جوں جوں یہ مہمان زمین سے قریب ہوتا جاتا ہے دلوں کی دھڑکن اور تیز ہو جاتی ہے۔لوگوں کے کان خوش کن آوازوں کو سننے لگتے ہیں۔ بچے اس کے انتظار میں اُکتاہٹ تو محسوس کرتے ہیں مگر بغیر انتظار کے چارہ بھی کیا ہے۔عورتیں اپنے گھروں کو اپنی ذات سے زیادہ سجاتی ہیں۔شاید اس خیال سے کہ عید گھر میں ہی آتی ہے اور انسان کی ذات کے اندر کم ہی گھسنے پاتی ہے۔کھلونے بیچنے والے تو عید کے بارے میں عجیب خیال رکھتے ہیں۔ باقی اسے کچھ بھی سمجھیں مگر ان کے سامنے تو یہ ایک بچہ ہی ہے۔ اس لئے ہر قسم کے کھلونوں سے اپنی دکان کو سجائے بیٹھتے ہیں۔ وہ لوگ جو اعتدال پسند ہوتے ہیں،اس سے گھبراتے تو نہیں،البتہ استقبال میں بھی زیادہ منہمک نظر نہیں آتے۔زیادہ دور اندیش لوگ اس مہمان کے استقبال سے پہلے ہی اس کے اثرات کا شکار ہو کر سوکھنے لگتے ہیں۔لیکن عام نوجوان تو بہر حال اس بات میں بھی نوجوانی ہی دکھاتے ہیں۔جس طرح وہ ہر مہمان کے لئے دیدہ و دل فروش راہ کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ اس آسمانی مہمان کے لئے پیکر انتظار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس تقریب سعید کو یادگار بنانے کے لئے وہ اس کے اعزاز میں اتنی ہی محفلوں کا انتظام کرتے ہیں۔ دوستوں اور رفیقوں سے ملنے کے وعدے ہوتے ہیں۔مسرت کے پیغامات بھیج کر رشتہ داروں کو عید سے اپنی عقیدت کا یقین دلاتے ہیں۔

غرض چاند سے عید تک کا یہ راستہ اتنی مصروفیات کے ساتھ طے ہوتا ہے کہ

لوگوں کی اکثریت اپنے لئے بھی عید کا چاند بن جاتی ہے۔ صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی لگن اور وہ ہوتی ہے اس اڑھائی دن کے مہمان کے خیر مقدم کی۔

لیجئے اب عید کی سواری کرۂ ارض میں داخل ہو رہی ہے لوگ بڑھ بڑھ کے اس کو چُوم رہے ہیں۔ کوئی گلے مل رہا ہے کوئی حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ اب میں بھی استقبال کرنے والوں میں شامل ہوتا ہوں۔

●●●

☆۔۔۔راجہ نذر بونیاری

خواب نامہ

خواب کئی طرح کے ہوتے ہیں ۔سہانے خواب، ڈراؤنے خواب، رنجیدہ خواب، سنجیدہ خواب،طویل مدتی خواب،قلیل مدتی خواب، بھیانک خواب،نحس خواب، سعدخواب،مبارک خواب،رنگین خواب،سنگین خواب،خوابِ سحر،خوابِ نیم شب،خوابِ پریشان،نادیدہ خواب،خوابِ نامکمل،یعنی ادھورے خواب،خوابِ غفلت،خوابِ خرگوش، ہلکے پھُلکے خواب، گہرے خواب، بانجھ خواب، سچے خواب.............خواب ہی دنیا میں ایک ایسی واحد شئے ہے، جسے آنکھیں بند کر کے بھی''دیکھا'' جا سکتا ہے۔جب کوئی محوِ خواب ہوتو ضروری نہیں کہ وہ کچھ دیکھ بھی رہا ہو بلکہ خواب نیند کو بھی کہتے ہیں۔میں نے اپنے کئی دوستوں سے یہ سوال کیا کہ جب آنکھیں بند ہوں اوپر سے صاحبِ خواب بے ہوش یا بے سدھ ہوتو وہ کیسے کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔؟ایک دوست مجھے اپنے ایک پروفیسر دوست کے پاس لے گیا، جو یونیورسٹی میں''نفسیات'' پڑھاتے ہیں۔فاضل پروفیسر نے اس موضوع پر کم سے کم اڑھائی گھنٹے فلسفہ بگھار دیااور ڈریم، سومنلزم، مسمر ازم،اور ہپناٹزم جیسے غیر مطلوبہ موضوعات پر اپنا سارا علم انڈیل ڈالا،لیکن اصل موضوع جوں کا توں رہا کہ آنکھیں بند کر کے یا پھر مست نیند میں ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اُس رات نہ مجھے نیند آئی، نہ میں نے کوئی خواب دیکھا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ساٹھ ستر سال پہلے دنیا میں کسی بھی جگہ صرف بلیک اینڈ وائٹ فلمیں بنتی تھیں اور کیمرے میں جو فلم ڈالی جاتی تھی وہ بھی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو

ہی بناتی تھی،لیکن ''خواب''،تخلیقِ آدم کے وقت سے ہی بلیک اینڈ وائٹ،ٹیکنی کلر یا پھر کلرڈ دیکھے جاتے تھے یعنی چیز کو اُس کی اصل ماہیت میں دیکھا جاتا تھا۔

خواب دیکھنے کے بعد جب صاحب یا صاحبِ خواب کی بھاری پلکوں کے دروازے وا ہوتے ہیں تو اندر کچھ نہیں ہوتا، وہ یہ بتانے سے قاصر ہوتا ہے کہ اُس نے جو خواب دیکھا، وہ بلیک اینڈ وائٹ تھا، یا کلرڈ (رنگین) پھر وہ Recollect کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے خواب میں کیا دیکھا۔ ذرا آپ بھی یاد کرنے کی کوشش کیجئے کہ گزشتہ شب آپ نے جو خواب دیکھا تھا، اُس میں کیا دیکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ جو چیز ہم دن کو جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں، وہی چیز رات کو دورانِ خواب دیکھتے ہیں، کیونکہ اس کا عکس لاشعور کے تہہ خانے میں جا کر سٹور ہو جاتا ہے۔

آج کل جو چیزیں ہم آئے دن کھُلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، یہ ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ جب ہم سو جاتے ہیں تو یہی چیزیں ہمارے ذہن کے پردے پر آ کر متحرک ہو جاتی ہیں۔ تو بتایئے پھر آپ نے جو ساگر دیکھا، اُس کا رنگ کیسا تھا۔ آسمان کا رنگ کیسا تھا۔ دودھ کا رنگ کیسا تھا؟ جس محبوبہ کے ساتھ آپ ایکو پارک میں بیٹھے پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے، اُس کی آنکھوں کا رنگ کیسا تھا؟۔ خود محبوبہ گوری تھی یا چٹی یا پھر سیاہ فام۔ اس کے ہونٹ گلابی تھے یا عنابی، اس کی نیم وا آنکھیں شرابی تھیں یا.......؟ اس کے گیسوئے خم دار سیاہ تھے یا بھورے وغیرہ وغیرہ ذرا یاد کیجئے۔

اپنے ایک فاضل دوست جسے دور کی سوجھتی ہے، جب میں نے اپنی تحقیق کے ایک حصے کے طور پر یہ سوال پوچھا کہ کیا اندھا بھی خواب دیکھ سکتا ہے۔ کیا اس کی ایک حس Visual Sensation کی عدمِ موجودگی میں اس کے دیگر چار حواس پر کوئی فرق پڑتا ہوگا تو ہمارے دوست نے اس سوال کا جواب تو نہیں دیا البتہ اتنا ضرور کہا کہ ''بہتر ہے یہ سوال آپ اندھے سے ہی پوچھیں''۔ جب اسی سوال کو ذرا (

الفاظ کو آگے پیچھے کر کے) ایک پیدائشی نابینا کے سامنے دہرایا (دوسرے معنوں میں اس سے پوچھنے کی جسارت کی) تو اس نے ایک مختصر سے فقرے میں اس کا جواب دیا" ہاں........میں خواب دیکھتا ہوں..........." پھر کچھ دیر توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا" لیکن ہم جیسوں کے خواب اور آپ کے خواب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ میں دوطرح کے خواب دیکھتا ہوں، ایک وہ خواب جو دورانِ نیند دیکھا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو میرے جیسے لوگ جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔حالانکہ دونوں صورتوں میں میری آنکھوں کا اس میں کوئی رول نہیں ہوتا۔اس اندھے دوست کے جواب سے مجھے اپنے پہلے سوال کا جواب مل گیا، جو میں نے نفسیات کے پروفیسر سے پوچھا تھا۔میرے پہلے کے سوال کا جواب مجھے یہ ملا کہ "خواب آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا"۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی اور بھی خفیہ آلہ ہمارے وجود کے اندر موجود رہتا ہے، جو وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے، جو ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔

اندھے دوست سے میرا اگلا سوال یہ تھا کہ "کیا اندھا رنگین "Coloured" خواب دیکھ سکتا ہے؟ اُس نے کہا "ہاں" اس کے جواب نے میری پریشانی میں اضافہ کر دیا اور اس پریشانی کی کوکھ سے میرے اگلے سوال نے جنم لیا۔" کیا آپ کو رنگوں کا تصور ہے؟" اس مافوق الفطرت انسان نما اندھے نے کہا "ہاں"۔میں نے جھٹ اگلا سوال داغ دیا۔"اگر آپ نے کسی چیز کو دیکھا ہی نہیں، تو پھر اس چیز کی ساخت، نقشے اور رنگوں کا تصور آپ کے پاس کیسے آ گیا؟"

اگر یہی سوال میں نے سائیکولوجی کے ایچ۔او۔ڈی سے کیا ہوتا تو وہ اس سوال کا جواب دو گھنٹے میں بھی نہ دے پاتے اور اُلٹا دماغ چاٹ جاتے، لیکن میرے اندھے دوست نے صرف ایک ہی جملے میں جواب دے دیا۔"میں نے آپ کو کہا کہ آنکھوں کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔دل کی آنکھوں سے......"

"پھر بتایئے کہ آسمان کا رنگ کیسا ہے"؟ میں نے سوچا شاید اندھا اُلٹا مجھ سے ہی پوچھے

گا۔ ''پھر بتائیے کہ آسمان کیا ہوتا ہے''۔لیکن اُس نے میری شرٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' ایسا....... یاد رہے کہ میری شرٹ کا رنگ نیلا تھا۔'' خون کا رنگ کیسا ہوتا ہے'' بوڑھی مرچ جیسا''اور دودھ کا؟'' برف جیسا........''اس سے پہلے کہ میں پاگل ہو جاتا، میں نے وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔........ چلتے چلتے کئی قسم کے خیالات میرے ذہن کے ناقص پردے پر ابھرنے لگے۔'' آخران آنکھوں کا پھر کیا فائدہ؟ جب ہم آنکھیں بند کر کے یا آنکھوں کے بغیر بھی دیکھ سکتے ہیں.......خواب میں نہ جانے کیا کیا دیکھ سکتے ہیں........وہ سب کچھ بھی دیکھ سکتے ہیں، جو ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتے۔جب ایک اندھا بھی خواب دیکھ سکتا ہے اور وہ بھی ملٹی کلر.....تو........(میں نے اپنی آنکھوں کو چھو کر دیکھا اور رُک کر ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں یہ اپنی توہین اور بے عزتی برداشت نہ کرتے ہوئے روٹھ نہ گئی ہوں)لیکن اُس وقت مجھے سب کچھ نظر آیا تو اُس رّبِ کریم کا شکریہ ادا کیا، جس نے ہمیں اس نعمت سے نوازا ہے۔

ذکر خواب کا چل رہا تھا۔پس ثابت ہوا کہ خواب بنا آنکھوں کے بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور جاگتے ہوئے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔میرا خیال تو یہ ہے کہ اس دنیا میں زیادہ خواب جاگتے ہوئے اور کھلی آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں......... ہاں یہ سچ ہے۔میں اور مجھ جیسے ان گنت آنکھوں والے جاگتے ہوئے خواب دیکھتے ہیں......وہ خواب جن کی تعبیر کوئی نہیں بتا سکتا...... یا پھر ایسے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہی نہیں..... یا پھر ایسے خواب جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے...اور ایسے خواب جنہیں ہم نے شرمندۂ تکمیل ہوتے دیکھا ہے۔

ایسے خواب جو صرف نادان، احمق، کم ہمت، شکست خوردہ، مایوس اور سادہ لوگ دیکھتے ہیں، جب ان کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، وہ محوِ خواب ہوتے ہیں۔ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے اُن کے سپنے ہوتے ہیں، ارمان ہوتے ہیں آرزوئیں ،تمنائیں اور خواہشات ہوتی ہیں۔وہ محوِ خواب ہوتے ہیں اور جب وہ پلک جھپکتے ہیں تو

یہ خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں: ریزہ ریزہ شب، پارہ پارہ خواب

اور اپنی جاگتی آنکھوں کے سپنوں کا حشر دیکھ کر وہ ان کی کرچیاں اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں چبھتی ہوئی محسوس کرتے ہیں اور اُس وقت اُن کی خشک مری ہوئی آنکھوں سے ساوَن بھادوں کی جھڑی لگ جاتی ہے، جن میں پانی کی بجائے لہو ٹپکتا ہے۔ یا وہ پچھلے موسم کا سوکھا تالاب لگتی ہیں، جس میں ناکام حسرتوں کی خشک بطخیں نہا رہی ہوں۔ یہ حسرت ناک خواب اور اس کے حسرت ناک انجام (تعبیر) کو ہم اُن آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، جو خواب نہیں دیکھ سکتیں.........مردہ........پتھرا گئیں آنکھیں......ایک سیانے کا قول ہے کہ دنیا میں ۹۹ فی صد ''چشم بینا رکھنے والے لوگ مرتے ہیں تو اپنے خوابوں کو آنسوؤں کا کفن اوڑھ کر پلکوں کے اندر ایک گہری تاریک اور تنگ قبر میں سُلا دیتے ہیں۔ خوابوں کی دنیا کے باسی جو خوابوں کے سہارے جیتے ہیں، وہ بیک وقت جاگ بھی رہے ہوتے ہیں اور سو بھی رہے ہوتے ہیں۔ خواب جو صرف زندہ لوگ ہی دیکھ سکتے ہیں، خواہ وہ جاگ رہے ہوں یا سو رہے ہوں، ان کی کھلی آنکھیں کھلی ہوں یا بند......وہ خواب، خوابِ پریشان ہوں یا سہانے سپنے، طویل ہوں یا مختصر.........رنگین ہوں یا سادہ خواب، نیم شب کے ہوں.......خوابِ نادیدہ ہوں یا سراب ہوں......ان کا انحصار اہلِ خواب پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جتنی آنکھیں اتنے خواب.....نسلِ آدم سے تعلق رکھنے والے ہر ذی روح فرد کے خواب الگ الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جیسے بے شمار خواہشیں رکھنے والا شخص، جس کا ہر خواہش کے بعد دم نکلتا ہے اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر میں بے خواب آنکھوں میں بے کفن لاش کو آنسوؤں کے تالاب میں تلاش کرتے ہیں مگر بدبو میں لپٹی بانجھ دن کی لاش کو پہلو میں لے کے سونے والے خواب کیا دیکھیں۔ ارمان پھر بھی باقی ہوتے ہیں۔ اہلِ خواب کا اپنا اپنا معیار ہوتا ہے خواب دیکھنے کا... . بادشاہ، حکمران، عالم، تاجر، دانشور، سیاست دان، کسان، محنت کش، مزدور، بھکاری،

اندھا، چور، رہزن، مرد، عورت اور بچہ............سب خواب دیکھتے ہیں۔ایک مزدور یا محنت کش دن بھر تکان کما کر لاتا ہے۔اور اس تکان کو بچھا کر اور پھر خواب اوڑھ کر سو جاتا ہے۔بھوکے کا خوب ایک روٹی ہوتا ہے۔جیسے چکور کا خواب چاند، شاعر کا خواب اس کے زرخیز اور تخلیقی ذہن سے اُگنے والے پھولوں کی خوشبو جیسا ہوتا ہے۔ایک مظلوم اور محکوم انسان کا لہولہان خواب اُس کی مجبوری اور بے کسی کی داستان کا عنوان ہوتا ہے۔دانشور کا خواب کسی مقدس صحیفے کی عبارت جیسا ہوتا ہے۔جیسے حضرت انسان خواب دیکھنے کا تہمت بردار ہوتا ہے۔اسی طرح حیوان اور پرندے بھی اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مشہور محاورہ ہے کہ''بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے نظر آتے ہیں''۔

ایک معصوم بچہ جب دورانِ خواب مسکراتا ہے تو فرشتوں کو بھی رشک آتا ہے۔بھلا وہ خواب میں دیکھتا کیا ہے۔اس کا خواب اس کی ماں ہوتی ہے۔وہ ماں کی گود میں ہو یا پالنے میں یا کہیں اور جب 'لوری' کی میٹھی آواز اس کی معصوم اور نازک سماعت میں ڈوب جاتی ہے تو ماں کی گرماہٹ سے اُس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی جاتی ہیں اور وہ خود بوڑھی ماں کا''خواب بن جاتا ہے''۔جواں سال بیٹی کی بوڑھی ماں کا خواب.........جوان سال بیوہ بہو کی بوڑھی ساس کا خواب........اَن جنی نسل کے سارے خواب میری کوکھ میں ہیں۔

گویا بے ورق، بے لفظ، بے تحریر صدیوں کا عذاب میری آنکھوں سے کوئی دیکھے، سراب.....راستوں میں ریزہ ریزہ بے نشان جسموں کے خواب.....جب خواب کی ساری کتابیں بے ورق ہو جاتی ہیں.....تب ریزہ ریزہ شب کے سارے خواب سو جاتے ہیں پارہ پارہ خواب جو آنکھوں سے منسوب ہوتے ہیں......ہر خواب کسی نہ کسی حقیقت کا آئینہ ہوتا ہے.....یہ کسی ماہر نفسیات کا خیال ہے....لیکن شروع رات کا خواب محض خواب ہوتا ہے، جب کہ نیم شب کے خواب کی تعبیر کافی دیر کے بعد نکلتی ہے اور خوابِ سحر ٹوٹتے یا

کھلتے ہی پورا ہوتا ہے......واللہ اعلم!

نہ سہہ سکا جب مسافتوں کے عذاب سارے
تو کر گئے کوچ میری آنکھوں سے خواب سارے

کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ سے اُس کے خادم پہرے دار نے کہا ''بادشاہ سلامت مبارک ہو! میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کو چاند سا شہزادہ ہوتا ہے۔ خادم یہ سمجھ رہا تھا کہ بادشاہ یہ سن کر اسے انعام واکرام سے نوازے گا، لیکن بادشاہ نے حکم دیا کہ پہرے دار کو پھانسی پر لٹکایا جائے۔ یاد رہے کہ بادشاہ کو سات ملکاؤں میں سے کوئی اولاد نہ تھی۔ خادم حیران ہوا کہ بھلا اس سے کیا قصور سرزد ہوا!۔ اُس نے ایک خوش خبری کے بدلے سزائے موت کا سبب دریافت کیا تو بادشاہ نے کہا'' تمہارا کام رات کو جاگتے رہنا ہے، نہ کہ سونا، اور خواب تو سونے کے بعد آتا ہے۔ تم نے فرض میں کوتاہی کی ہے۔ اس لئے پہلے تجھے سزا ملے گی پھر انعام......''

خواب ایرا غیرا نتھو خیرا......بلا لحاظ، ، مذہب و ملت رنگ و نسل ، ذات و جماعت ، جنس و معیار دیکھ سکتا ہے۔ اس کے لئے جاگنا یا سونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اہلِ دانش کا خیال ہے کہ سب سے زیادہ خواب خاک نشین اور فقرا دیکھتے ہیں۔ ننگی زمین پر خالی پیٹ، خالی جیب گہری نیند آتی ہے۔ شہنشاہ اور حکمران بہت کم خواب دیکھتے ہیں، کیونکہ دبیز گدوں، ریشمی بچھونوں پر انہیں نیند نہیں آتی۔

القصہ خواب ایک بن بلائے مہمان کی طرح جب چاہے آجاتا ہے۔ اُسے کوئی نہیں روک سکتا محل کا بند دروازہ، نہ جھونپڑی کی کچی دیوار، نہ پہرے دار کی بندوق، نہ حکمران کا قہر نہ شام وسحر۔

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر
زندگی ہے خواب، اجل تعبیرِ خواب

☆......راجہ نذر بونیاری

چین

''چین'' .... پتہ نہیں کہ تین حروف کا یہ خوبصورت لفظ مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔ جب کبھی بھی یہ لفظ سنتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے میرے کان کے نزدیک سارنگی کی مہین تاروں کو چھیڑا ہو۔ اپنے محترم اُستادوں، علمائے کرام اور مولوی صاحبان کی زبانی سینکڑوں مرتبہ سنا اور کتابوں میں بھی پڑھا ''**اُطلبو العلم ولو کان بالسین**'' ''علم حاصل کرو...... اگر چہ اس کے لئے تمہیں چین بھی جانا پڑے''۔ علم کے حوالے سے بھی اس قول کو بار بار سن کر دل میں چین کے لئے عقیدت اور احترام کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں .... میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر، دیوار میں ایک چھوٹے سے سوراخ میں .... ایک چڑیا رہتی تھی............. ہر سال مئی کے مہینے میں وہ اس آشیانے میں انڈے دیتی تھیں اور تین ہفتوں کے بعد کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے ایک آواز گزر کر میرے کانوں میں رس گھولتی تھی.......... ''چیں چیں''۔ یہ اس چڑیا کے ننھے ننھے بچوں کی آواز ہوتی، جن سے میرے کان اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ جس دن یہ آوازیں میں نہ سنتا، عجیب بے قراری سی بڑھ جاتی۔ یوں بھی ایسے سینکڑوں پرندے ہیں، جن کی بولیاں چینی زبان کے مختلف Dialect Shade لگتی ہیں۔ پتہ نہیں اس موضوع پر لسانیات کے ماہرین کیوں خاموش ہیں۔ بچپن کے ایام خصوصاً طالب علمی کے زمانے میں جب ہم ''نوشتۂ دیوار'' پڑھنے کے لائق ہوئے، تو میں نے سکول کی ایک دیوار پر کچھ اس قسم کی معلومات پینٹ کی ہوئی دیکھیں۔ دنیا کا آبادی کے لحاظ

سب سے بڑا ملک ''چین'' ہے۔دنیا کا چھٹا عجوبہ...... دیوارِ چین.......... دنیا کا آبادی کے لحاظ سے بڑا شہر سنگھائی (چین میں) وغیرہ وغیرہ.......چین یوں بھی کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے ہر گھر میں موجود رہتا ہے۔رسوئی گھر میں جو پلیٹیں اور چائے دانی رکھی رہتی ہے وہ بھی ''چینی'' کہلاتی ہے۔....خواہ وہ کہیں بھی بنی ہو،لیکن اس Metal) کو چائنا یا چینی کہتے ہیں اور جب میری بیوی رسوئی گھر میں ہوتی ہے تو وہاں سے جو آوازیں آتی ہیں ،لگتا ہے کہ کوئی چینی بولی بول رہا ہے یا پھر چینی ''بھائیوں بہنوں'' کے ناموں کی فہرست پڑھ رہا ہے۔کھانڈ یعنی ''چینی''،جس شکر پاٹ میں ہے،وہ بھی چینی کی ہے۔

چین کے بارے میں سماجی علوم کی کتابوں میں بے حد اہم معلومات درج ہیں، مثلاً علمِ سماجیات اور علمِ العمرانیات کے ماہرین کی تحقیق کے مطابق دنیا کے قدیم ترین انسان چین میں رہتے تھے،جو ہاتھوں اور پیروں سے ایک ساتھ چلتے تھے،جیسے ریچھ یا بندر.........اسی لئے ''چینیوں'' کو دنیا کے قدیم ترین ثقافتی آثار کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔قدیم ترین مخلوق ہونے کے باوجود وہ موجودہ دنیا میں جدید ترین ترقی یافتہ اقوام میں شمار ہوتے ہیں ۔اپنے جسمانی خدوخال (Anthropolgical Features)اور ناک نقشے کے لحاظ سے وہ جنوبی مشرقی ایشیا کے دوسرے لوگوں جیسے ہی ہیں ۔اس کی وجوہات لکھتے ہوئے ایک امریکی سیاح نے اپنے سفرنامے میں ایک رونگٹھے کھڑا کر دینے والا انکشاف کیا ہے۔مائیکل تھامس نامی اس سیاح نے لکھا ہے کہ چینی دنیا کی واحد قوم ہے ،جو ویج اور نان ویج دونوں ایک ساتھ ہیں ،ہربی ورس (Herbivorous)اور کارنی ورس (Carnivorous)دونوں ہیں۔

سانپ، بچھو اور ہر زہریلے کیڑے مکوڑے کو بھون کر کھا جاتے ہیں ۔گھاس پھوس اور نبات تو وہ ہرا ہرا ہی چر جاتے ہیں،حیوان اور چرند و پرند کسی بھی جاندار سے پرہیز

نہیں کرتے، حتیٰ کہ ''آدمی'' اُن کا من بھاتا کھانا ہے۔انسانوں کے سری پائے ہر چینی کی من پسند غذا ہے۔اسی لئے ان کی عمریں بھی لمبی ہوتی ہیں۔مائیکل کا کہنا ہے کہ چین کے پڑوسی ممالک کے لوگوں کے خدوخال شاید اسی لئے چینیوں جیسے ہیں کہ وہ اپنے پڑوسی ممالک میں رہنے والوں کو کھا گئے اور خود اُن ممالک میں رہنے لگے۔اگر ایسا ہوتا تو ہندوستانیوں اور روسیوں کے خد و خال بھی ویسے ہی ہوتے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان اور روس کے ان علاقوں کے خدوخال بھی چینیوں جیسے ہی ہیں، جن کی سرحدیں چین سے ملتی ہیں۔بہر حال ہوسکتا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا رہا ہو، لیکن اب ایسا نہیں............ کیونکہ اب دنیا کی بہت سی قومیں اور افراد 'آدم خور' ثابت ہوئے ہیں۔کرشن چندر کے بارہ بنکی والے گدھے کو دیکھ کر ایک چینی سپاہی نے دوسرے چینی سپاہی سے کہا تھا'' پیں چائیں پنگ پیچی پیچی چونگ پائی....'' جس کا مطلب اردو میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ''یہ گدھا ہندوستانی آدمی سے صحت منداور مزیدار ہے'' اردو کی بات چلی تو مجھے اردو کا ایک محاورہ یاد آ گیا'' چیں بہ جبیں ہونا'' جس کا مطلب ہے، ناراض ہونا، ماتھے پر شکن آنا، غصہ آنا۔کہتے ہیں کہ چین کے لوگ کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتے، نہ انہیں غصہ آتا ہے۔اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آیئے چین چلیں........کیونکہ ابن انشاء بھی یہی کہتے ہیں کہ'' چلنا ہو تو چین کو چلئے............'' اس سفرنامے کو کھول کر پڑھئے تو آپ کو چین کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔

آیئے..........اس سفرنامے میں سے چند اقتباس میری زبانی سُنئے ۔''ایک عدالت میں گئے۔ایک خاتون وکیل سے ملاقات ہوئی۔اُس سے پوچھا'' یہ عدالت ہے یا........ یہاں تو ہو کا عالم ہے''۔خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔چین میں کرائم ہی نہیں ہوتا، اسلئے پولیس اور عدالتوں میں کام ہی نہیں''۔

''ہم نے پیکنگ کا ہوٹل چھوڑ دیا اور شنگھائی روانہ ہو گئے۔جب شنگھائی پہنچے

اور قیام کی غرض سے ایک ہوٹل میں پہنچے تو کاؤنٹر پر منیجر نے ہمیں ایک اخبار کا پیکٹ دیا۔کھول کر دیکھا تو اس میں سے نائیلون کا ایک باتھ روم سلیپر نکلا، جو ہمارے ایک ساتھی نے پیکنگ کے دوران ہوٹل کے باتھ روم میں چھوڑ دیا تھا۔کیونکہ یہ پرانا تھا۔منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا'' آپ کی یہ امانت ہمیں پیکنگ کے ہوٹل چی چو سا سے ملی ہے، جہاں آپ یہ بھول آئے تھے.......''۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے اسدؔ

دیانتداری اور امانتداری کی اس ''حد'' کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گئے۔اگر وہاں چلو بھر پانی ہوتا تو ہم ضرور اس میں ڈوب مرتے۔''ہوشا سانگ'' کے ایک ویٹر سے پوچھا'' تم کہاں رہتے ہو؟'' ....'' کمرے میں'' ....'' اکیلے.......'' '' اس میں ایک عورت بھی رہتی ہے۔'' کیا تم اور وہ عورت دونوں اس اکیلے کمرے میں رہتے ہو؟'' ''ہاں'' ....'' تو پھر ....عشق وشق اور محبت وغیرہ بھی ہوتی ہے'' '' ہاں ہوتی ہے.........'' '' کیا تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی!'' ....'' نہیں'' '' کیا تمہارے ملک میں یہ عیب نہیں مانا جاتا ہے۔''نہیں'' کیا تمہیں اس سے واقعی محبت ہے؟''ہاں ....کیونکہ وہ میری بیوی ہے..........''

''ایک چوراہے پر کچھ لوگ جمع تھے اور ہنس رہے تھے۔وہ ایک امریکن عورت کو گھیرے ہوئے تھے۔ہم نے پوچھا'' کیا معاملہ ہے؟'' وہاں موجود ایک شخص نے کہا ....'' اس عورت نے جو شرٹ پہن رکھی ہے........تھوڑا نیچے چھاتی پر چینی زبان میں معلوم ہے کیا لکھا ہے؟ ......'' مجھے کیسے معلوم ہوگا..........!'' ....'' یہاں گرم گرم دودھ ملتا ہے۔''

ایک ویٹر خاتون نے ہمارے کمرے میں آ کر ہم سے پوچھا'' نان ویج میں ....آپ کیا کھانا پسند کرتے ہیں''؟ ہم نے کہا'' بکرے کے کباب یا پھر مُرغا، لیکن وہ

بھی حلال.........''خوبصورت عورت نے کہا۔''تو پھر آج بھی ویج ہی کھانا پڑے گا''
ہم میں سے ایک دوست نے پوچھا'' ویسے آج نان ویج میں کیا پکا ہے''؟ خاتون نے
چھوٹے چھوٹے دانت دکھاتے کہا''.....چوہوں کی بریانی اور فرائی مینڈک........''۔

چین اور بنگال کا جادو بہت مشہور ہے۔چینی تو جادوگر نہیں ہوتے، ہاں محنتی ضرور ہوتے ہیں۔ ہزاروں میل طویل دیوار جادو سے نہیں بنتی۔ایٹم بم جادو سے نہیں بنتا۔ایٹمی توانائی جادو نہیں ہوتی۔امریکہ اگر دنیا میں کسی سے خائف ہے تو وہ چین ہے۔ساری دنیا کی تجارتی منڈیوں میں سب سے سستا مال میڈ اِن چینا ہوتا ہے۔دنیا بھر میں فروخت ہونے والی تسبیحیں، جائے نماز اور نماز کی ٹوپیاں چین میں بنتی ہیں۔مَین پاور میں چین دنیا کا پہلا ملک ہے۔کسی چینی دانشور، سیاست دان، یا سائنس دان نے کسی خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ جدید چین کے معمار اور محنت کش دانشور ماوزی تُنگ نے یہ کہا کہ'' اگر ہمارے ملک میں کھانے والے ڈیڑھ ارب منہ ہیں تو کمانے والے تین ارب ہاتھ بھی ہیں۔'' نظریہ خاندانی منصوبہ کو مسترد کر دیا۔چین کی سیاحت کرنے والوں اور چین شناسوں نے چینیوں کے ہاتھوں کو چومنے کی تمنا کی ہے۔ایک یورپی سیاح نے چین والوں کے ہیلتھ کانشس ہونے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے''میں نے شمالی چین میں ایک بوڑھے شخص کو ایک سائن بورڈ کے نیچے بیٹھے ہوئے دیکھا، جو رو رہا تھا۔میں نے پوچھا'' دادا جان! آپ کیوں رو رہے ہیں؟۔گرینڈ پا نے کہا'' مجھے ابا جان نے مارا ہے''......''ابا جان نے.........!''.......''کیا آپ کے ابا جان ابھی بقیدِ حیات ہیں''؟ اُس نے کہا''جی ہاں وہ تو ابھی جوان ہیں''میں نے پوچھا''...... اُن کی عمر کیا ہے.......''؟ بڑے میاں نے کہا'' دوسو سال'' ....''اور آپ کی ....ڈیڑھ سو سال''، لیکن آپ کے ابو نے آپ کو کیوں مارا ہے''؟.......'' کیونکہ میں نے دادا جان کے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ چوری کر کے نکال لیا تھا''۔......تو کیا آپ

کے دادا جان بھی........''!؟ اس سے پہلے کہ وہ اپنے دادا جان کے ابو کی کوئی کہانی سناتا، میں وہاں سے ڈر کے مارے بھاگا اور بھاگنے سے پہلے اس بڑھے کھوسٹ کے پیچھے لگے ہوئے سائن بورڈ پر لکھی تحریر کو پڑھ لیا۔

''اس علاقے میں آج تک نہ کوئی بیمار ہوا ہے اور نہ مرا ہے''۔ محکمۂ سیاحت چینیوں کی آنکھیں کرنجی اور پُرکشش ہوتی ہیں۔ چہرے پر ناک نام کی چیز برائے نام ہوتی ہے۔لیکن یہ ناک نہ کبھی کٹی ہے، نہ کٹے گی۔کیونکہ کٹنے کا خطرہ ہمیشہ اُس ناک کو ہوتا ہے، جو نہ صرف لمبی 'خطرناک'' ہوتی ہے۔کہتے ہیں اگلے زمانے میں چینی مردوں کو عورتوں کی طرح داڑھی نہیں آتی تھی،لیکن اب آنے لگی ہے۔پچاس فیصد چینی داڑھی مونچھ سے محروم ہوتے ہیں اور باقی پچاس فیصد کو چکھی داڑھی اور مونچھ کے نام پر دو تین بال ہوتے ہیں۔چائے ،کافی اور ریشم سب سے پہلے چین میں دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن چین کا کوئی مرد عورت اور بچہ نہ تو چائے پیتے ہیں، نہ کافی اور نہ ریشم کے کپڑے پہنتے ہیں بلکہ ''خواتین'' بھی جین یا موٹے ''زین'' کے کپڑے پہنتی ہیں۔قد میں اوسط سے بھی کم ۔چینی باسکٹ بال میں ساری دنیا میں اول نمبر کے کھلاڑی تسلیم کئے گئے ہیں۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ چینیوں کا صرف ایک چہرہ ہوتا ہے، وہ ہم جیسے ایشائیوں کی طرح دو چہرے نہیں رکھتے۔ایک ظاہر، دوسرا جیب میں۔اسی لئے چینی اچھے، سچے اور حق پرور مانے جاتے ہیں۔چینی کی ترجمانی اقبالؔ کے اس مصرعے سے ہوتی ہے۔

کہتا ہوں وہی بات، سمجھتا ہوں جسے حق

چینی نہ ہپوکریٹ ہیں، نہ اُن کے پاس دوہرا معیار۔مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں میرے گاؤں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ ''بونیار مندر سے کسی نے میرا جوتا چُرا لیا جو میں نے چین سے لایا تھا۔وہاں سے آگے مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا''۔میں ہیون سانگ سے معذرت خواہ ہوں۔ابن انشاء کی ٹوٹی پھوٹی پرانی چپل

پیکنگ کے ہوٹل کی منیجمنٹ نے کوڑادان میں پھینکنے کے بجائے اُسے واپس بھجوادی۔ لگتا ہے کہ انہوں نے ہیون سانگ کا وہ سفرنامہ پڑھ لیا ہے، جس میں اُس نے بونیار مندر سے جوتا چُرانے کے افسوس ناک واقعہ کا ذکر کرکے میری ناک کاٹ دی ہے۔

●●●

☆......راجہ نذر بونیاری

کرسی

کرسی عربی کا لفظ ہے، جو گرائمر کے حساب سے اسم ہے اور جنس کے لحاظ سے مؤنث۔ حالانکہ اس کا مذکر نہیں ہوتا۔ یہ چار حرفی لفظ دنیا چھوٹی بڑی زبانوں میں رائج ہے۔ ہم تو اسی دن سے اس لفظ کو بولنے لگے تھے، جب ہم نے بولنا شروع کیا۔ باقی ہر لفظ کو توتلی زبان میں بولتے تھے، لیکن ''کرسی'' کو کبھی ''کلسی'' نہیں کہا۔ اردو پڑھنا شروع کیا اور ''کرسی'' کی جب دوسری علاقائی زبان سے جان پہچان ہوئی تو وہاں بھی کرسی اپنی اصل شکل میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ البتہ فارسی میں کرسی کی جگہ صندلی دیکھ کر تعجب سا ہوا کہ پنجابی، کشمیری، سندھی، گجراتی، ہریانوی، اودھی، پشتو سب زبانیں جنوبی ایشیا میں بولی جاتی ہیں اور ان کے اور عربی کے بیچ میں فارسی ہے۔ پتہ نہیں کہ اس کرسی نے عرب سے کیسے اُڑ کر ہندوستان میں لینڈ کیا۔ دوسرے ممالک کی ہم بات نہیں کرتے۔ لیکن ہمارے ملک میں اس لفظ کو کچھ اس طرح اپنایا گیا ہے کہ یہ پسر پروردہ کی بجائے پسرِ حقیقی لگ رہا ہے اور اس میں بلا کی کشش اور اپنائیت موجود ہے۔ ہر بندۂ خدا بلا تفریق مذہب وملت، رنگ ونسل، ذات و جماعت اور جنس و زبان اس چیز سے بے حد پیار کرتا ہے اور اس کے حصول کے لئے سارے عالم کو تل پٹ کر سکتا ہے۔ اس کے چاہنے والے دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں، لیکن یہ ایک ایسی 'محبوبہ' ہے، جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر بندۂ خدا ''رقیبِ روسیاہ'' تک بھی بن جاتا ہے اور خون خرابے اور قتل و غارت سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ لیکن یہ ایسی ہرجائی محبوبہ ہے کہ یہ ہر ایک کی ہونے کے

باوجود کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ مشہور مقولہ ہے کہ زر، زمین اور زن فسادات کی جڑیں ہیں۔ اگر ان میں کرسی کو بھی شامل کیا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ کسی ماہرِ لسانیات نے کرسی کو چار الفاظ کا مرکب قرار دیا ہے۔ یہ چار الفاظ ''کرسی'' کے چار حروف سے شروع ہوتے ہیں مثلاً ''ک'' سے کٹنی ''ر'' سے ''رنڈی'' ''س'' سے ''سکی'' اور ''ی'' سے یاس۔ یہ چاروں الفاظ بھی مونث ہیں۔

جب ہم طالب علمی کے دور میں تھے، جسے ہم جبر کا دور کہتے تھے۔ ہمیں کہا جاتا تھا کہ گائے، بکری، گھوڑے اور کتے پر بیس بیس جملے لکھیں۔ ان چاروں حیوانات کو ہم نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ ان میں سے ایک یا دو ہمارے گھروں میں بھی پائے جاتے تھے۔ اردو کے استاد نے جب پہلی مرتبہ ہمیں گائے پر مضمون لکھوایا تو اس کا پہلا جملہ یہ تھا۔ گائے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اس کے دو کان، دو سینگ، دو آنکھیں اور چار تھن ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ الگ بات ہے کہ گھوڑے اور کتے پر مضمون لکھتے وقت ہم گائے کے بجائے گھوڑا لکھتے تھے، باقی وہی جو گائے والے مضمون میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اُستاد نے حکم دیا کہ ''کرسی'' پر بیس جملے لکھو۔ میں نے گائے والا مضمون دیکھا اور پہلا جملہ لکھا ''کرسی'' کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں'' یہ لکھ کر میں رُک گیا اور یاد کرنے لگا کہ کرسی میں کیا کیا ہوتا ہے۔ ''چار تھن'' ......نہیں .... ''دو سینگ'' ....نہیں، دو آنکھیں، دو کان، ......نہیں ......نہیں'' میرے بغل میں بیٹھے ہوئے کلاس میٹ نے میری کاپی کو دیکھتے ہوئے کہا'' آگے لکھو........ یار''....کیسا مضمون ہے!........دیکھو نا کرسی ہمارے سامنے موجود ہے اور ماسٹر جی اس پر بیٹھے ہوئے سو رہے ہیں، سنو خراٹے بھی لے رہے ہیں۔

ماسٹر جی ابھی جاگ جائیں گے اور ہماری خبر لیں گے۔ ارے یار آگے کچھ لکھو نا....'' ''تم ہی لکھو نا''۔

لکھواس کے دو بازو بھی ہوتے ہیں۔ یہ بیٹھنے کے کام آتی ہے۔ ماسٹر جی اس پر سو جاتے ہیں ۔ٹانگوں کے باوجود نہ حرکت کر سکتی ہے اور نہ چل سکتی ہے۔ اگر اس کی.........ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو ماسٹر جی گر جائیں گے''۔

ماسٹر جی نے آنکھیں کھولیں......'' کاپیاں دکھاؤ''......یہ جملہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے کہ'' ماسٹر جی اس پر سو جاتے ہیں۔......کہنے لگے '' بدمعاشو! کیا تمہیں اس کے آگے کچھ نہیں سُوجھا اور کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ اقبال نے ہمت کر کے پوچھ لیا'' اگر اس کا کوئی اور فائدہ ہو تو براہِ کرم ہمیں سمجھا دیجئے۔ ہمیں تو یہ ظلم، دھونس اور مار کی ایک خوفناک اور منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔ جناب آپ ہمیں کھڑے ہو کر پڑھاتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم کے سمندر سے ہمارا ریگستان جیسا دماغ سیراب ہو رہا ہے اور علم کی روشنی خاموشی سے خود بخود ہمارے اندر منتقل ہو رہی ہے۔ جونہی آپ کرسی پر بیٹھتے ہیں تو گویا ہماری شامت آجاتی ہے.........اسی لئے بشیر نے ایک ہفتہ پہلے اس کی ایک ٹانگ توڑ ڈالی تھی۔ جب ہم گائے پر مضمون لکھتے ہیں تو ہمیں گائے کے سینگوں سے ڈر نہیں لگتا۔ جب ہم دودھ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں پورے وجود میں ایک ممتا بھری گرماہٹ اور شیرینی گھل جاتی ہے۔ ہمیں گائے کی صورت میں ایک محسنہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ جب کتے کا ذکر ہوتا ہے تو نجس العین ہونے کے باوجود وفادار دوست کا مجسمہ ذہن کے قرطاس پر اُبھر آتا ہے اور میاں بخش کا یہ پنجابی شعر یاد آجاتا ہے:

جس دل اندر عشق نہ رچیا کُتے اُس تھیں چنگے
مالک دے کَہر راکھی کردے صابر بُھکھے ننگے

یعنی جس شخص کے دل میں وفاداری اور عشق نہ ہو، اُس سے کتے اچھے ہوتے ہیں ، جو صابر، بھوکے ننگے اپنے مالک کے گھر کی رکھوالی کرتے کرتے کبھی نہیں تھکتے،'' لیکن ہمیں کرسی کے اندر ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی''۔

ماسٹر جی نے غور سے سننے کے بعد کہا'' کون کہتا ہے کہ کرسی دودھ نہیں دیتی۔اس کے بے شک تھن نہیں ہوتے ،لیکن ہمیں کیا کیا نہیں دیتی ہے۔یہ عزت دیتی ہے،وقار اور دبدبہ دیتی ہے۔سرمایہ دیتی ہے۔بشرطیکہ اس پر بیٹھنے والا اس کے معنی جانتا ہو۔کرسی تو خدا کا عنایت کیا ہوا ایک انمول تحفہ ہے۔اس کے ساتھ جُڑی ہوئی اخلاقی اقدار کا تحفظ اور اسے اپنے خالق کی امانت سمجھ کر اس کا احترام اور صحیح استعمال سچی انسانیت کی دلیل ہے۔کرسی کا غلط اور ناجائز استعمال اس کی عظمت کو ہرگز کم نہیں کرتا۔اس پر بیٹھنے والے شخص کے کردار اور خصلت پر منحصر ہے کہ وہ اس کی بلندی کو پستی میں بدل دے یا پھر عرش کی بلندیوں تک پہنچائے۔کرسی لکڑی،فولاد یا پلاسٹک کی بنی ہوئی ایک چیز کا نام ہے،جس پر ہر طرح کے لوگ بیٹھتے ہیں۔ حاکم،صاحب اقتدار، منصف،ڈکٹیٹر،تھانیدار،نائی،امام اور یہ کرسی جس پر میں بیٹھا ہوں،یا پھر بقولِ تمہارے سوتا ہوں.......کوئی بھی شخص ہو.......کرسی صرف ایک ہوتی ہے۔صاحبِ کرسی اگر اپنی کرسی کی قدر نہیں کرتا تو یہ بے زبان اور بظاہر بے جان سی شئے اسے اس طرح سے فرش پر پٹک دیتی ہے تو وہ پھر دوبارہ اس پر بیٹھنے کا سپنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور ہم کرسیوں کے قصے نہ صرف سنتے رہے بلکہ اپنی آنکھوں سے گردشِ لیل ونہار کے ساتھ کرسی/تاج وتخت کی بے وفائیاں بھی دیکھیں اور کرسی کے لئے خون کی ندیاں بہتے ہوئے بھی دیکھیں۔انسانی اور اخلاقی اقدار کو سولی پر چڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔

باقی روزمرہ میں لائی جانے والی گھریلو اشیا میں کرسی بھی شامل ہے۔لیکن گھر کی کرسی سے نہ کوئی ڈرتا ہے نہ اس کی عزت کرتا ہے اور نہ اسے اہمیت دی جاتی ہے۔لیکن جب یہی کرسی ہم کسی اور جگہ دیکھتے ہیں مثلاً کسی سرکاری دفتر میں،اس پر بیٹھنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے ''صاحب'' کی اجازت کے بغیر اس پر بیٹھا

جائے یا......؟ صاحب کرسی کوئی بھی ہو،...وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے نیچے بچھی ہوئی کرسی اس کی جا گیرنہیں نہ وہ کرسی اس کے نیچے عمر بھر رہتی ہے اور نہ وہ اس کے اوپر عمر بھر رہ سکتا ہے۔بعض مثالیں ایسی بھی ہیں کہ کسی کو اللہ نے کرسی دی تو اس نے کرسی چھوڑ نے سے انکار کیا اور اسے اپنی داشتہ یا زرخرید لونڈی یا پھر ذاتی جا گیر سمجھ کر اس سے چمٹ کر رہ گیا۔ پھر اس کا انجام یہ ہوا کہ اسے اس کرسی سے بے آبرو ہو کے اُتارا گیا۔بعض نیک اور بے غرض لوگوں کو کرسی پیش کی گئی،لیکن انہوں نے اس پر بیٹھنے سے انکا کر دیا۔بعض کرسیاں ایسی بھی ہوتی ہیں،جن پر ان کا مالک بھی نہیں بیٹھتا۔مثلاً نائی کی کرسی اور بیوٹی پارلر میں رکھی ہوئی کرسی۔

مصر کے صدر ناصر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے پورے صدارتی زمانے میں صرف ایک سواسی بار صدر کی کرسی پر بیٹھا۔یہی بات پنڈت نہرو،انڈونیشیا کے صدر عبدالرحیم سوئکارنو،ماوزی تنگ اور یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کے بارے میں بھی مشہور ہے۔فارسی میں پرانی کہاوت ہے کہ ''صدر ہر جا کہ نشت ،صدر است'' یعنی صدر جہاں بھی بیٹھے ،صدر ہوتا ہے۔گلاب کا پھول اگر گندی نالی میں بھی اتفاقاً گر جائے ،تو اسے گلاب کا پھول ہی کہا جاتا ہے۔آپ ذرا اپنے زرخیز ذہن پر تھوڑا سا زور دیجئے تو آپ کوئی ایسے نام یاد آئیں گے جو کبھی کرسی پر نہیں بیٹھے نہ کبھی کرسی کی خواہش کی،لیکن قیمتی ہیرے جواہرات سے سجے تاج سر پر رکھے۔ایسی کئی شخصیات کے سر اُن کے قدموں میں جھکے رہتے تھے۔ایک کہاوت ہے'' دمس سا تی چھونمسکار'' یعنی جو لوگ صاحب ثروت،سرمایہ دار یا پھر صاحب اقتدار ہوتے ہیں،اُن کو اُسی لمحے تک سب سلام کیا جاتا ہے،جب تک کہ وہ اُس پوزیشن میں رہیں ۔ہم نے کئی ایسے حضرات کو دیکھا ہے،جو اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے،بسوں میں کھڑے کھڑے سفر کر رہے تھے یا پھر سبزی بازار میں آلو اور بھنڈی عام شہریوں کی طرح خرید رہے تھے۔ایک ریٹائرڈ جج

صاحب کو دیکھا، جو ایک ریڑے والے سے اُلجھ رہے تھے، جو بھنے ہوئے چنے بیچ رہا تھا۔ایک فوجی افسر جب ریٹائرڈ ہو کر گھر پہنچا تو اُسے نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہوتے ہوئے کئی سال لگ گئے۔ پہلے دن جب وہ صبح نیند سے جاگا تو وہاں کوئی اردلی تھا نہ سپاہی، نہ کسی نے سلیوٹ دیا، نہ وہ پروٹوکول جس کا وہ عادی تھا۔البتہ بیوی نے جھنجوڑتے ہوئے اُسے کہا ....'' جاؤ بازار سے انڈے اور سبزی لے آؤ ناشتے کے لئے .... پہلے تو اُسے بہت غصہ آیا،لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد اُسے یاد آیا کہ وہ اب کوئی افسر وفسر نہیں بلکہ ایک سادھارن قسم کا شوہر ہے۔ ایسے شوہر ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔

بہرکیف قصہ کرسی کا چل رہا تھا اور کرسی کبھی نہ ختم ہونے والی ایک داستان کا عنوان بن کر رہی ہے۔ جب تک زمین وآسمان باقی ہیں، یہ کرسی موجود رہے گی، خواہ اس پر کوئی بیٹھے یا خالی رہے۔ایک بس کے اندر پینٹ کیا ہوا یہ شعر حسبِ حال بھی ہے اور موضوع کے ساتھ کچھ میل بھی کھا رہا ہے۔

دنیا میں محبت والوں کی تقدیر بدلتی رہتی ہے

اُس تصویر کو بھی یاد کیجئے جو شیشے کے فریم میں لگی ہو۔شیشے سے مراد وہ فریم ہے، جس میں تصویر فٹ کی جاتی ہے۔میرا ایک دوست ہے، جو الیکشن کے آخری دنوں وزارت اعظمٰی کے امیدوار کے نام خط لکھ کر رکھ دیتا ہے، جس میں وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کے نام کی جگہ خالی چھوڑتا ہے، غرض جو بھی کامیاب ہو جائے.........خالی جگہ میں اُس کا نام لکھ دیتا ہے۔ایک دفتر کی دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے فریم میں، میں نے ہر دو چار سال کے بعد ایک نئی تصویر مُڑی ہوئی دیکھی ہے۔

ایک صاحب کو ایک دفتر میں دروازے کے پاس پڑے ہوئے ٹول پر بیٹھے دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا'' آپ یہاں کس کام سے آئے تھے''؟ اُس نے ایک لمبی

آہ کھینچ کر کہا'' آج سے دو ماہ پہلے میں اُس کرسی پر بیٹھا تھا،جس پر وہ بابو بیٹھے ہوئے ہیں ۔آج میں اپنے ایک ذاتی کام کے لئے آیا ہوں،لیکن جب وہ صاحب اپنے کام سے فارغ ہوں گے،تب میری طرف دیکھیں گے۔دراصل یہ کرسی.................!''

●●●

☆۔۔۔جاوید آذر

ایک کے ستّر

ماہ رمضان آیا ہے۔ رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ۔ گناہوں کو دھونے اور ہم جیسے گنہگاروں کو دھلوانے کا مہینہ۔ دلوں میں گداز اور مزاجوں میں نرمی پیدا کرنے کا مہینہ۔ شیطانیت کو پچھاڑنے اور شیطان کو زنجیروں میں جکڑنے کا مہینہ۔

بیشک اس ماہ مبارک میں ایسے گن ہے کہ انسان کھلی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ سال بھر معصیت کے بھنور میں غوطے کھانے والا شخص اس مہینے پر کاہ کی طرح پانی کے اوپر تیرتا ہے، ایک نورانی شان اور ملکوتی آن لئے۔

ہمارے ایک عزیز دوست ہیں، عام طور پر صبح دس بجے دفتر پہنچتے ہیں، دن بھر فائلوں میں سرکھپا کر سائلوں کے کام کر کے دعائیں لیتے ہیں۔ شام کو چپراسی، جو اپنے گاؤں تک دو گاڑیاں بدل کر ہمیشہ اندھیرے میں چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوتا ہے، کے بار بار کے اصرار سے مجبور ہو کر بادل نخواستہ کام بند کر کے دفتر سے باہر آتے ہیں۔ مگر ماہ رمضان کی برکتوں کے صدقے، آج کل عصر بھی محلے کی ہی مسجد میں پڑھتے ہیں اور چپراسی بے چارہ دن کی روشنی میں اپنے بیوی بچوں کے چہروں کے دیدار کی برکت سے مالا مال ہوتا ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ فرض رمضان کے ساتھ ہی فائلوں کا شیطان لوہے کے لاکر میں جکڑ دیا جاتا ہے، کیونکہ ان فائلوں کی ایک فطری خامی ہے! جب تک انہیں پیسے کی دھونی نہیں دے دی جاتی کھلتی نہیں ہیں۔ چونکہ اس مہینے میں دھونی دینا معیوب لگتا ہے لہٰذا اس شیطان کو ہی ایک مہینے کے لئے پابہ زنجیر کر

دیا جاتا ہے اور بیچارے سائل مہینہ گزرنے اور فائلوں کے کھلنے کے لئے دن رات دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔

ہمسائیگی میں ایک صاحب ہیں، بہت ہی نیک اور حق ہمسائیگی کی پاسداری میں پیش پیش۔ کسی کے پاؤں میں بھی کانٹا چبھے تو اپنی پلوں سے نکال لیتے ہیں۔ اپنے اہل وعیال کو فٹ رکھنے کے لئے دن رات محنت کرنا عبادت سمجھتے ہیں۔ دو دو تین تین دن کے بعد گھر لوٹتے ہیں کیونکہ اکثر صاحب کے ساتھ دوروں پر رہتے ہیں۔ تنخواہ کے علاوہ ٹی اے، ڈی اے بھی ملتا ہے۔ لاگ بک میں دو چار انٹریاں سوا لگ۔ ماہ مبارک آتے ہی اس طرح گھر بیٹھ جاتے ہیں جس طرح انڈوں پر مرغی۔ روزہ سے ہوں یا نہ ہوں، دفتر جانے کا نام نہیں لیتے۔ جن ہمسایوں کے لئے سال بھر کانگڑیاں اور کوئلے کی بوریاں ڈھوتے رہتے ہیں وہی چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وظیفہ کماتے ہیں، کسی کا خیال ہے کہ کسی پہنچے ہوئے بزرگ کے حکم پر اس برکت والے مہینے میں چلہ کھینچتے ہیں۔ ایک دن لالچوک میں ان کے آفیسر صاحب، جو کالج میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے ہیں، سے ملاقات ہوئی۔ وہ تھکن سے چور گھسٹ گھسٹ کر چل رہے تھے۔ ظاہر بات ہے بیت الخلا تک گاڑی میں جانے والا شخص جب پیدل چلتا ہوا ملے تو بات گاڑی اور ڈرائیور پر ہی ہوگی۔ تو صاحب نے کہا کہ ان کا ڈرائیور اور میرا ہمسایہ ماہ رمضان میں گاڑی گیراج میں بند کر کے لاگ بک ایک غلاف میں لپیٹ لیتے ہیں، کیونکہ اگر لاگ بک کا شیطان کھلا رہا تو ان کے روزہ، نماز کا کفارہ کون ادا کرے گا؟ لہٰذا وہ شیطان کی کارستانیوں سے بچنے کے لئے کارگہہ حیات سے ہی پنڈ چھڑا کر گھر میں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔

اس برکت والے مہینے کی برکت سے مسجدیں بھی برکت سے مالا مال ہو جاتی ہیں۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ نئے نئے چہرے اور نئی نئی آوازیں۔ نئے نئے

مسائل اور نئے نئے مشورے۔ گرما گرم صفہ پر نئے نئے عالم، نئے نئے علوم کے موتی جھڑتے رہتے ہیں، کبھی کبھی کسی رمضانی عالم کے فوارۂ علم میں اس قدر پریشر پیدا ہوتا ہے کہ سوڈے کی بوتل کے کاگ کی طرح ڈھکن اڑ جاتا ہے اور امریکی لہجہ میں انگریزی علم کبھی چھت سے ٹکراتا ہے تو کبھی دیواروں سے، کبھی مدمقابل کا منہ لتھیڑ دیتا ہے اور کبھی کبھی کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر باہر گلی میں راہ گیروں کو سیراب کرتا ہے۔

ایسے ہی ایک صاحب علم، جو سرکاری ملازم بھی ہیں، افطار کے وقت کو چھوڑ کر، چاروں وقت صفے پر کبھی اپنی ٹانگیں سینکتے ہیں اور کبھی اپنی کمر کو گرم گرم تریڑے دیتے رہتے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ماہ مبارک میں اپنا سارا کام کاج بند کر دیتے ہیں۔ کیونکہ گیارہ مہینے کمانے کے اور ایک مہینہ کھانے کا ہوتا ہے۔ اسی نسخے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ پورے ایک مہینے صفہ کے چبوترے کی گھسائی کرتے رہتے ہیں۔ البتہ دوپہر میں دفتر جا کر حاضری کی چڑی مار کر ضرور آتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک پٹواری صاحب سے کام پڑا۔ پٹوار خانہ پہنچے تو گیارہ مہینے بھی ڈھیرہ ڈھیرہ، کبھی فیلڈ میں، کبھی ڈی سی صاحب کے دفتر میں، کبھی تحصیلدار صاحب کے گھر پر، غرض ہر دم غائب رہنے والے، پٹواری صاحب کو حاضر پایا۔ ناک کی نوک پر آدھے شیشوں کی عینک جمائے، اپنی پیٹی کے اوپر ملیر کوٹلہ کی شہرۂ آفاق پیتل کی سکیل سے کاغذ کے اوپر لکیریں کھینچ کر جمع بندی اور گرداوری کے گوشوارے بنا رہے ہیں۔ ہم تو گھر سے یہ عندیہ لے کر چلے تھے کہ پٹواری صاحب نے قلم، کاغذ اور سکیل کے شیاطین صندوق میں مقفل کر دیئے ہوں گے مگر خلاف توقع انہیں کام میں اس قدر مصروف پایا کہ عینک کے اندر سے ہی آنکھیں اُٹھا کر ہماری طرف دیکھ کر اظہار مدعا کے لئے استفسار کیا۔ باتیں کم اور کام زیادہ۔ ماہ مبارک میں ان کا سلوگن یہی ہے۔ دراصل ان کا خیال ہے کہ ماہ مبارک میں اپنے اوپر سستی، کسل اور کاہلی

طاری کر کے کام کاج سے جی چرانا روزہ کی توہین کے مترادف ہے۔ چونکہ اس مہینے میں کثرت عبادات کا حکم ہے، لہٰذا اس سے کثرت کار کا بھی عندیہ لیا جاسکتا ہے۔ یہ کہتے کہتے انہوں نے فوراً ہمارا کام نپٹا لیا۔ ہم نے اس امید کے ساتھ جیب میں ہاتھ ڈالا کہ دل کو گداخت کرنے والے اس مہینہ کے حوالے سے وہ فوراً ہمارا ہاتھ روک لیں گے مگر جب نوٹ کھڑ اکھڑاتے ہوئے باہر آیا تو انہوں نے بڑی نرمی اور حلیمی سے کہا ''چائے نہیں! ہدیہ دے دیجئے! اللہ تعالیٰ ایک کے ستّر دیتا ہے آپ بھی تو کچھ شرم کریں''۔

●●●

☆۔۔۔جاوید آذر

گھریلو نوکر

گھریلو نوکر اتنا ہی پرانا ہے جتنا قدیم یہ ہمارا سماج۔ ہر علاقے اور ہر زمانے میں اس کی ضرورت رہی ہے۔ ہر گھر میں اس کی خواہش موجود ہے۔ ہر شخص ایک گھریلو نوکر رکھنا چاہتا ہے تا کہ اسے ایک امدادی ہاتھ ملے، جو ایسے موقعوں پر اپنا کاندھا پیش کرے جب بوجھ اٹھانے کی طبیعت نہیں ہوتی۔ جیسے بھارت اور پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ۔ جب فضا تنی ہوتی ہے، درجہ حرارت بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے اغلب کہ پارہ شیشہ توڑ کر باہر نکل آئے۔ کچن سے بی بی جی کی فرمائش آتی ہے ، بازار سے ہری مرچیں لادو۔ بس پارہ ایک دم گر کر نقطہ انجماد پر پہنچ جاتا ہے ایسے موقع پر اگر گھریلو نوکر موجود نہ ہو تو لاکھ کرکٹ شیدائی ہونے کے باوجود بادل نخواستہ بازار جائے گا۔ اس طرح آپ کے شوقِ کرکٹ بینی کا تاپ مان برقرار رہے گا۔ اب تو اس کا زیادہ امکان ہے کیونکہ سرحدوں پر غبار کی چادر تنی ہے لہٰذا جلد ہی کرکٹ کے میدانوں میں محاذ کھلنے کے بگل بجیں گے۔

گیلے دسمبر کی ابتدائی سُوں سُوں کے بعد جب معشوقہ کی طرح تھرکتے اور اٹھلاتے برف کے گالے گرنا شروع ہوتے ہیں اور آپ فرن کے اندر کانگڑی سینکتے سینکتے ٹی وی دیکھ رہے ہوں اور بی بی جی کو قومی شاہراہ بند ہونے اور بازار سے سبزیاں غائب ہو جانے کا خیال آئے تو وہ فوراً ہفتے بھر کے لئے ترکاری اور سلاد خرید کر لانے کا حکم نادری جاری کرتی ہیں۔ پیروں کے نیچے فرن کا دامن دبا کے، ہوا کے داخلے کے

تمام راستے مسدود کر کے کانگڑی ہلکی ہلکی سینک کے Protection Cover سے باہر نکلنا تو تکلیف دہ ہے ایسے میں گھریلو نوکر موجود ہو تو آپ انڈے سینک سکتے ہیں۔

رات کے گھُپ اندھیرے میں اگر آپ کے دروازے پر کوئی نامعلوم دستک ہوتی ہے تو خوف سے آپ کے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور کان بجنے لگتے ہیں۔ایسے میں آپ گھریلو نوکر کا طبلہ بجا کر نامعلوم موسیقی سننے کے لئے آگے کر سکتے ہیں۔آپ خود چین کی بنسی بجا کر سو سکتے ہیں۔

کسی نزدیکی تعلق دار کو خون کی ضرورت پڑے تو خون کی خیرات کے اجرو ثواب پر ایک لیکچر پلا کر سرخ سرخ خون کا ایک پوائنٹ اس کے بازو سے نکال کر تحفہ کے طور پر پیش کر کے اپنے نازک رشتہ داروں کے دائرے میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

گھریلو نوکر رکھنے کے ہزاروں گن ہیں،گناتے جائیں تو میر باقر علی داستان گو کی وہ داستان بھی فراموش ہو گی،جس میں شہزادے اور شہزادی کے وصل کا منظر اتنا طول کھینچ گیا کہ حجلہ عروسی کی دہلیز پر پہنچ کر شہزادہ ڈیڑھ سال تک دہلیز پار نہ کر سکا،آخر داستان گو کے مربی بادشاہ نے تھک کر کہا کہ ''آج تو شہزادے کا قدم دہلیز کے اندر جانا ہی چاہئے''۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر بجٹ ختم ہو جائے تو آپ گھر کے بجٹ میں کمی کرنے کے لئے ایش ٹرے سے سگریٹ کی راکھ چرانے کا الزام لگا کر نہ صرف اسے نوکری سے باہر کر سکتے ہیں بلکہ دو ایک مہینے کی تنخواہ بھی بطور سزا بحق بی بی جی ضبط کر سکتے ہیں،اسی طرح جس طرح پرانے وقتوں کے نانوائی انگلی پکڑ کر گاؤں سے لائے ہوئے نوکر کو تیس سال کے بعد کوئلوں کی چوری کے الزام میں گھر سے کھدیڑ دیتے تھے۔تیس سال کی تنخواہ تو ایک طرف جاتے وقت کپڑے جھٹکائے جاتے تاکہ راکھ کا کوئی ذرہ بھی ساتھ نہ لے جائے۔

ماضی میں گھریلو نوکر آہستہ آہستہ گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کرتا تھا۔ چولہا چکی کا حساب کتاب، رشتے ناطے والوں کا حفظ مراتب، پاس پڑوس والوں کے مسائل اور ان سے صاحب خانہ کے تعلقات کی حیثیت، غرض ہر چیز پر ان کی نظر ہوتی تھی، مگر آج سبزی کے لئے دیئے گئے پیسوں سے پیسے نکالنے کی فکر وقتاً فوقتاً کسی اچھی چیز کو اپنے ٹرنک میں رکھ کر گاؤں کے پنگھٹ پر کسی کے قدموں پر ارپن کرنے کی آرزو، بی بی جی اور پاپا جی کے درمیان اِدھر اُدھر کی باتوں کا سفارتی تبادلہ، ہمسائے کے آنگن میں کھر وڑوں کی ہڈیاں پھینک کر اپنے گھر کا راز فاش کرنے کی عجلت، مالکن سے بد کنے والی پڑوسن آنٹی جی کے ساتھ سلام دعا کے بہانے گھنٹوں باتیں کرنے کی بے تابی، دفتری کاموں کی غرض سے صاحب سے ملنے کے لئے آنے والے لوگوں کو صاحب کے موڈ کی خبر دے کر سگریٹ اور کبھی کبھی ماچس کی ڈبیا کے اندر مڑا توڑا نوٹ رکھنے کی رغبت۔ غرض آج کل گھریلو نوکروں کے سوچنے کے زاویئے اور عمل کے دائرے رنگا رنگ ہیں۔ نوکری سے جی بھر آئے تو فرار ہوتے وقت ساتھ لے جانے والے چھوٹے بڑے سامان کی فہرست انہوں نے نوکری جوائن کرنے کے فوراً بعد تیار کر لی ہوتی ہے۔

اب تو ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ مالک اور مالکن کے دفتر روانہ ہوتے ہی دن کے اُجالے میں ٹرک لگا کر چھوٹا بڑا سامان اٹھا کر روانہ ہو جاتا ہے اور پڑوسی آنٹی کو ٹاٹا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بی بی جی کے مائیکے میں شادی ہو رہی ہے وہیں یہ سامان لے کر جا رہا ہوں۔ اس طرح کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کرنے کی بجائے سونے کے ساگر میں ڈبکی لگا کر سنہری ہو جاتا ہے۔

اس خوف کے سبب لوگ چھوٹے چھوٹے، ننھے منے نوکر رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں جو بغیر کسی چون و چرا، حیلہ وحجت کے نہ صرف ہر ممکن کام کرتے ہیں بلکہ کم غذا کھا

کر کم تنخواہ بھی لیتے ہیں۔ اپنے بچوں سے بھی چھوٹے ایسے نوکر کو آپ گھر پر تالا لگا کر دن بھر گیٹ کے باہر بھی بٹھا سکتے ہیں یا پھر وہ دن بھر محلے کے آوارہ بچوں کے ساتھ ہلڑ مچا کے سہ پہر کو اپنی نوکری پر واپس حاضر ہوسکتا ہے۔ اس طرح نوکر کا دل بھی بہل جاتا ہے اور ڈرائنگ روم اور میک اپ روم میں رکھی ہوئی چیزیں بھی دست اندازی سے محفوظ رہتی ہیں۔ ہاں البتہ بہت سے مالکان خدا ترس اور انسان دوست بھی ہوتے ہیں۔ وہ ایسے طفل نوکروں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرانے کے لئے سرکاری سکول میں داخلہ دلاتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ بچہ گھر کے بچوں کے بستے اور لنچ بکس ان کے سکول تک چھوڑ کر پھر اپنے سرکاری سکول جاتا ہے۔ واپسی پر مالکن کے بچوں کو کھانا وغیرہ گرم کر کے پروستا ہے اور خود اُن بچوں کی گالیاں اور طعنے کھاتا ہے۔

دراصل کچھ لوگ نوکر رکھتے وقت طفل نوکر کے والدین سے تنخواہ کے علاوہ اسے تعلیم دے کر سرکاری ملازم رکھوانے کا وعدہ بھی کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں اکثر کم تنخواہ پر اور بعض اوقات مفت میں نوکر میسر ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچے شام کو ٹی وی سیریل دیکھتے دیکھتے بی بی جی کی چیخ سے سپرنگ کی طرح اچھل پڑتے ہیں اور کچن میں جھوٹے برتن دھونے میں لگ جاتے ہیں۔ آدھی نیند میں کمرے کمرے سامان لے جا کر سیڑھیوں پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ نوکری پر رکھنے کے چند ہی دن بعد جب طفل نوکر کا باپ منہ تڑکے گیٹ پر دکھائی دیتا ہے تو گھر کا ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ اسے بچے کی شفقت پدری نے بے قرار کر کے یہاں لا پھینکا ہے۔ کچن کی چوکی پر چائے پیتے پیتے وہ گاؤں کی خراب اقتصادی حالت کی داستان شروع کر کے دوسرے مہینے کی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ سامنے رکھتا ہے۔

●●●

☆۔۔۔جاوید آذر

ہمارا قومی اثاثہ

جب ہم چھوٹے تھے تو سکول میں گلا پھاڑ کر یہ رٹایا جاتا تھا کہ جنگلات ہمارا قومی اثاثہ ہیں، ان کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ غربت اور کثرت اولاد کے تفکرات میں پسے ہوئے ماسٹر ارجن ناتھ بھی اس چیخا چیخی میں ہمارے شریک کار رہتے تھے۔ رٹے کے زور سے جب کبھی ان کے گلے سے مسجد کے بگڑے ہوئے سپیکر جیسی آوازیں نکلنے لگتی تو کسی ایسے لڑکے کو، جو ہر پیریڈ میں پیشاب پھیرنے کے بہانے بازار کی سیر کر آنے کا تجربہ رکھتا ہو، کو یونانی ادویات کی مشہور دوکان ''الکوثر'' پر بھیج کر سفید رنگ کا کوئی سفوف منگوایا کرتے۔ منہ میں سفوف کی چٹکی بھر کے ٹھیکے کی صاف و شفاف بوتل، جس سے جے کے ایکسائز کے الفاظ چھن چھن کے نظر آتے، سے پانی کی لمبی اور پتلی دھار ٹپکا کے نگل لیتے۔ چونکہ ان دنوں جراثیم آمیز منرل واٹر کا رواج نہ تھا، اس لئے ٹھیکے کی بوتل میں سرکاری نل کا پانی ہی معیاری مشروب مانا جاتا تھا۔ جب ماسٹر جی کا گلا کچھ صاف ہو جاتا تو پھر اثاثوں کی اہمیت اور ان کی حفاظت کا پاٹھ پڑھانا شروع کرتے۔ اس گردان میں اپنے اثاث البیت یعنی چھتری، جوتے اور بوتل کے پیندے جیسے چشموں کی عینک کا خیال بھی ان کے ذہن سے محو ہو جاتا۔ جو بعد میں بھی سکول کے دارالاگربہ (Attic)، کبھی چپراسی کی کوٹھری اور کبھی کبھی بیت الخلا کی ٹینکی کے پیچھے ملتے تھے۔ پڑھتے پڑھتے یہ سبق اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ ایک بچے نے سکول کی بوسیدہ دیوڑھی پر بھٹے بننے والے بوڑھے بھڑ بھونجیے کے ٹوکرے سے مکئی کے

چند دانے اڑا کر اپنے گھر کے دس بائی پندرہ آنگن کے کونے میں پیوست زمین کر دیئے۔ کچھ دن بعد مکئی کے ننھے ننھے پودے ذرا بڑے اور گھنے ہونے لگے تو بچے کو ایک دم ماسٹر ارجن ناتھ کی پڑھائی ہوئی پٹی یاد آ گئی۔ محلے کے ہلکے بزار کا حقہ تازہ کرنے کے عوضانے میں تھان لپٹنے کا ڈنڈا اور گتے کا تختہ حاصل کر کے ایک پلے کارڈ تیار کیا۔ جس پر نرم کوئلے، جو خرافاتی کاموں میں بچوں کا اسٹینڈ رڈ روشنائی ہوا کرتی، اسے جلی حروف میں ماسٹر جی کا سلوگن تحریر کر کے اس زاویئے سے زمین میں گاڑ دیا کہ آنگن میں داخل ہونے والے ہر شخص کی پہلی نظر اس پلے کارڈ پر پڑتی جس پر لکھا تھا۔

جنگلات ہمارا قومی اثاثہ ہیں

ان کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے

بہرحال جب قومی اثاثوں کی حفاظت کا ذمہ تفویض ہوا تو ہم نے ماسٹر ارجن ناتھ کی محنت کو رائیگانی سے بچانے کے لئے بہت ہی آسان اور شستہ طریقہ اختیار کیا۔ مغربی تعلیم کی مہربانی سے شک کی تھیوری اختیار کر کے کسی پر بھروسہ کرنا ہی ترک کیا۔ اس لئے سارے اثاثے آہستہ آہستہ اپنے گھروں میں منتقل کر لئے تا کہ اور کوئی نہ سہی بے کار بوڑھے والدین ہی گھر بیٹھے ان کی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ یہ اثاثے بڑھتے گئے اور گھر پھولتے گئے مگر یہ گھر غریب کا پیٹ نہیں کہ دو نوالے زیادہ کھانے سے قولنج کی نوبت آئے۔ اگر کبھی ایسی صورت پیدا بھی ہوئی تو واٹر شیڈ پروجیکٹ کیلئے حاصل شدہ ورلڈ بینک کے قرض کی مے کے کیگ Keg کے کیگ چڑھا کر قومی اثاثوں کی ہڈیوں کا سرمہ بنانے کی ایسی مہارت مبہم پہنچائی کی نہ کہیں شیڈ رہا اور نہ شیڈ کے اندر واٹر ٹپکنے کی گنجائش رہی اور اس طرح نہ کہیں جنازہ اُٹھا اور کہیں مزار ہی بنا۔

اب جبکہ قومی اثاثوں کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت کی رٹّے کی ہانک بھی

ختم ہوگئی لہٰذا ہم بھی فقیروں کی طرح لمبی تان کر لیٹ گئے تھے مگر سڑکوں کو قومی اثاثہ اور ان کی حفاظت کو فرض عین قرار دے کر سب کے کان کھڑے کر دیئے گئے۔ کیونکہ سڑکوں کے دھول ،کیچڑ، خاک بجری اور کولتار سے تو راج باغ، گوگجی باغ، پیر باغ، بلبل باغ، الٰہی باغ، اس باغ اُس باغ غرض ہر قسم کے باغ میں ایسے ایسے محل سرا بن گئے کہ اگر آج شیداد دوبارہ زندہ ہو جائے تو اٹلیین ماربل پر ایسا پھسلے کی جنت دیکھنے کی تمنا ہی اس کے دل سے نکل جائے......اب پتہ نہیں انہیں اثاثہ کہنے کی کون سی اساس رہ گئی۔ سڑکیں پہلے گھر کی ہانڈی تھیں۔ ہاتھ ڈالا تو کھالیا مگر اب یہ قرض کی مے ہے۔ چار پیگ زیادہ چڑھائے تو قے ہوسکتی ہے۔قوم کے دروازے پر اسی طرح ڈھول پیٹیں گے جس طرح بینک والے کروڑ پتی اور ارب پتی ناہندگان کے دروازوں پر ڈھول پیٹتے ہیں۔ اس دن ہمارے پاس ماسٹر ارجن ناتھ کی کلاس کے پیوند لگے کھر درے ٹاٹوں جیسی ٹوٹی پھوٹی اور اوبڑکھابڑ پگڈنڈیوں پر کولتار کی مستطیل، مربع اور تکونی چٹائیاں بچھانے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

●●●

☆---زنفر کھوکھر

بیوی اور گاڑی

سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ''بیوی اور گاڑی'' دونوں میں سے کس کو کس پر ترجیح دوں۔ چاہت کے کس خانے میں کس کو رکھوں۔ یوں تو ایک بیوی ہی کافی ہوتی ہے، جیب ہلکی پھلکی کرنے کے لئے اور دیگر بہت کچھ بھی۔ دیکھا جائے تو بیوی کہاں کہاں نہیں گھماتی پھراتی ہے۔ ڈرائنگ روم سے کچن تک' صحن سے چھت تک۔ یہ کرؤوہ کرو۔ گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑاتی پھراتی ہے۔ خیر، گھر کو چھوڑیئے۔ ذرا باہر کی خبر لیتے ہیں۔ آئے دن مائکے، آئے دن ہسپتال، شاپنگ مالز، پکنک سپاٹس وغیرہ وغیرہ۔ اوران سب میں اگر کوئی کوتاہی اور کمی رہ جائے تو بسا اوقات برسوں کو محیط کورٹ کچہری کے چکر تک لگوا دیتی ہے اور جب ساتھ گاڑی بھی ہوتو پھر کیا کہنے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ جہاں نہیں جانا ہے وہاں بھی جانا ہے۔

ہمارے لئے ایک عدد بیوی ہی کافی تھی۔ مگر بیوی کی فرمائش کہ گاڑی چاہیے۔ اب جسے گھر میں امن وسکون چاہیے، وہ بیوی کی کوئی فرمائش ٹال ہی نہیں سکتا ہے اور بیوی کیا کیا فرمائش نہیں کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک چیز کو چھوڑ کے بیوی ہر چیز کی فرمائش کرسکتی ہے۔ ''مجھے یہ چاہیے۔ مجھے وہ چاہیے۔ فلاں کے پاس یہ ہے۔ فلاں کے گھر میں یہ ہے۔ وہ ہے۔ فلاں کی بیوی نے یہ پہنا ہے۔ ایسی جیولری ہے اس کے پاس وغیرہ وغیرہ۔ مگر کیا آپ نے کبھی یہ سنا ہے کہ کسی بیوی نے کہا ہو'' مجھے ایک عدد سوکن چاہیے۔'' یقیناً ہرگز نہیں۔ کیونکہ دبی کچلی یہ ایک اکیلی خواہش

صرف شوہر کی ہوتی ہے۔ بیوی کی ہرگز نہیں۔

گاڑی کی بات چلی تو ہم گاڑی کے بارے میں سوچنے لگے۔ سوچ سوچ کر آخر ہمیں گاڑی لینی ہی پڑی۔ گاڑی سے واسطہ پڑا تو کئی پردے اٹھے۔ ہم پر کئی راز منکشف ہوئے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بیوی اور گاڑی میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

نئی نئی گاڑی ہو یا نئی نویلی دلہن، دونوں ہی خوشی کا باعث ہوتی ہیں اور قدرِ مشترکہ کی حامل بھی۔ یعنی اپنی ذات اور صفات کے حوالے سے ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتی جلتی ہیں۔ پہلی مماثلت تو یہی ہے کہ دونوں اپنے آپ میں ایک خاص کشش اور چمک دمک رکھتی ہیں۔ اپنے ہوں یا پرائے، گھر والے ہوں یا باہر والے، سب ہی نئی گاڑی اور نئی دلہن کو دیکھنے کے متمنی اور خواہش مند ہوتے ہیں۔ دونوں کے وسیلے سے مٹھائی اور مبارک بادیوں کے سلسلے چل پڑتے ہیں۔ دونوں کے ذریعے اور وسیلے سے آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے۔ نئی نئی جگہوں پہ جانے اور بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ طرح طرح کے لوگوں سے میل ملاپ بڑھتا ہے۔ دونوں یعنی بیوی اور گاڑی ثابت قدم رہتی ہیں تو آدمی پہلے سے کچھ حد تک محترم اور معتبر بھی ہو جاتا ہے۔

گاڑی خرید کر آدمی بے حد خوش ہوتا ہے کہ اب وہ گاڑی والا ہو گیا ہے۔ بعد میں کیا ہوتا ہے، گاڑی کتنا خرچہ مانگتی ہے، کتنے چالان کٹواتی ہے۔ اس کی اسے مطلق پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح شادی کرنے والا بندہ بھی بوقتِ شادی بے حد خوش ہوتا ہے کہ وہ کامیاب رہا۔ اب وہ صرف صاحب نہیں بلکہ صاحبِ بیگم ہے۔ بعد میں کیا ہوتا ہے۔ بیوی نبھنے نبھانے میں کیسی نکلتی ہے۔ دیکھ ریکھ اور مینٹی نینس کے حوالے سے کتنی

مہنگی پڑتی ہے! ان سب باتوں کی اُسے بوقتِ شادی مطلق پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

دونوں یعنی بیوی ہو یا گاڑی، اِنہیں کسی دوسرے یا ایرے غیرے کے حوالے یا حفاظت میں نہیں دیا جاسکتا ہے۔ دونوں میں سے کسی کو بھی باعملِ مجبوری کہیں اکیلے یا کھلے میں چھوڑنا پڑے تو ایک نامعلوم سا خوف وخطرہ لاحق رہتا ہے۔ دل میں طرح طرح کے اور ناقابلِ بیان وسوسے آنے جانے لگتے ہیں۔

چوراچکوں اور بدمعاشوں کی دونوں پر نظریں رہتی ہیں علاوہ ازیں دونوں کو دیکھ بھال کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور بعض مخصوص حالات میں مرمّت کی بھی۔

دونوں کے میک اپ اور مینٹی نینس کے لئے آدمی کو اپنی آمدنی کا ایک مخصوص کوٹا ہر حال میں مختص رکھنا پڑتا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ کوئی جناب کسی کی بیگم صاحبہ کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ تبھی صاحبِ بیگم چُپکے سے جا کر اُن کے کان میں پھسپھسائے ''کسی دن میک اپ کے بغیر جو دیکھنا پڑا تو چیخ مار کر بھاگ نکلو گے۔''

ایسا ہی کچھ گاڑی سے بھی متعلق ہے۔ میلی کچیلی یا گرد آلود گاڑی بڑے شہروں میں نظر آئے تو جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا خوبصورت دِکھنے اور دکھانے کے لئے دونوں کو بنائے اور سجائے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اِسی لئے تو جگہ جگہ بیوٹی پارلر اور سروس سٹیشن بنائے گے ہیں۔ بس ضرورت ہوتی ہے ان کو بروئے کار لانے کی اور سو فیصد فیض اُٹھانے کی۔

ایک اور مماثلت جو دونوں میں پائی جاتی ہے اور جو سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کے معاملے میں احتیاط اور تدبیر بے حد ضروری ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہوئی نہیں کہ انسان دردناک انجام تک پہنچ سکتا ہے۔ ذرا سی آنکھ جھپکی نہیں کہ کوئی نہ کوئی حادثہ یقینی ہو گیا۔

ان خدشات سے بچنے کے لئے دونوں کا یعنی بیوی اور گاڑی کا مزاج آشنا

ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ مدتیں نہ سہی مگر ایک وقت تو درکار ہوتا ہی ہے مزاج آشنائی کے لئے۔ مگر ہم لوگوں سے چوک یہیں پر ہو جاتی ہے۔ بیوی ہو یا گاڑی، دونوں کے معاملے میں ہم بہت جلد باز اور اُتاولے واقع ہوئے ہیں۔ بغیر مزاج آشنائی کے ہواؤں میں اُڑنے، اُڑانے لگتے ہیں اور مات کھا جاتے ہیں۔

دراصل انسان کی اسی جلد بازی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آج دھوم دھام سے شادی ہوئی اور کل طلاق واقع ہو گئی۔ یا پھر نئی نویلی دلہن کی خودسوزی یا خودکشی کا الزام سر لے کر جناب معہ والدین، سلاخوں کے پیچھے رُوپوش پہنچ گئے۔ اخبارات ایسی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔

بھلا کون بے وقوف اپنے ہاتھوں سے اپنی نئی نویلی دلہن کو آگ لگاتا ہے۔ مگر ہم لوگ اپنے اُتاوَلے پن کی وجہ سے اور محض مزاج ناآشنائی کی وجہ سے، ایسے سنگین الزامات اپنے سر لینے کے حالات پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح گاڑی کے مزاج سے بھی ناآشنائی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ادھر گاڑی لی اور اُدھر چند دنوں یا ہفتوں کے اندر ہی اندر ٹوٹی پھوٹی اور چکنا چُور ہوئی۔ گاڑی مرمّت کے لئے ورک شاپ میں پہنچ گئی۔ اب بھلا جس دلہن کے ہاتھوں کی مہندی کے نقش و نگار پھیکے نہ پڑے ہوں، اور جس گاڑی کے ٹائر رائی برابر گھسے نہ ہوں۔ سیٹ کور تک میلے نہ ہوئے ہوں اور وہ حادثے کا شکار ہو جائے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے۔ مختصر یہ کہ دونوں ہی شعلہ مزاج واقع ہوئی ہیں۔ ذرا سی لاپرواہی اور بے احتیاطی برتی نہیں کہ یہ جا وہ جا، ہوئیں۔ ذرا سی لاپرواہی سے دونوں ہی بھڑک اٹھتی ہیں۔

دونوں کی ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنا پڑتا ہے اور دونوں اگر کنٹرول میں رہیں، بندے کے حکم کے تابع رہیں تو زندگی نہایت خوشحال اور آرام دہ ہیں۔

ورنہ............! دراصل دونوں کی عزت وآبرو اور سلامتی بس اسی میں ہے کہ وہ بندے کے کنٹرول اور بس میں رہیں۔ اگر بیوی کنٹرول سے باہر ہو جائے تو بندہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا ہے اور گاڑی جب کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہے تو وہ خود دیکھنے کے قابل نہیں رہتی ہے۔ کیونکہ جب گاڑی کنٹرول سے باہر ہوتی ہے تو وہ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی چیز سے ٹکرائے گی اور منہ کی کھائے گی۔ اس کا حلیہ اور چہرہ چکنا چور ہو جائے گا۔ اور یہ بالکل اچھا نہیں ہوتا ہے کہ نئی نئی گاڑی منہ کی چوٹ کھا کر ٹوٹ پھوٹ جائے۔ دراصل دونوں کی ایک خاص مماثلت یہ ہے کہ دونوں نہایت منہ زور ہوتی ہیں۔ نہایت ضبط اور کنٹرول کے باوجود اکثر بے قابو اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔

نئی نویلی دلہن جب بصد احترام اور ناز برداریوں کے باوجود اپنا کڑا رویّہ اپنائے رکھتی ہے اور اپنا بڑا پن اور دبدبہ قائم کرنے کے لئے بے قابو ہو کر بے لگام ہو جاتی ہے تو نتیجے میں اُس کے منہ پر پہلا چانٹا پڑتا ہے اور اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اب یہ بات بھی بڑی افسوس ناک ہوتی ہے کہ نئی نویلی دلہن کے منہ پر چانٹا پڑے۔ دونوں سے وابستہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ گاڑی ہو یا بیوی، منہ کی کھا کر نچلی ہو کر بیٹھنے والی نہیں ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ''چلتی کا نام گاڑی۔'' گاڑی کو چالُو رکھنے کے لئے اس کی مرمّت ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے اسے ورک شاپ میں لے جانا پڑتا ہے۔

بیوی چانٹا کھا کر نچلی ہو کر بیٹھ جائے تو وہ بیوی نہ ہوئی۔ گائے بھینس ہوئی۔ پہلے وقتوں میں بیوی بھاگ کر مائکے جاتی تھی۔ آج کل بیوی کے لئے وومین سیل کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ جہاں شوہر کو پائے انجام تک پہنچانے کے کئی سلسلے ہوتے ہیں اور جہاں پہنچ کر شوہر کو کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ بگڑ جائیں تو دونوں نہایت بُری۔ جینا اور چلنا پھرنا دوبھر کر کے رکھ دیں۔ بیوی بگڑ جائے تو گھر نہیں چلتا ہے۔ آدمی گھر میں رہتے ہوئے بھی گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ ساتھ چھوڑ دے تو بقیہ زندگی گزارنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ زندگی ہچکولے کھانے لگتی ہے اور آدمی رنڈوا کہلانے لگتا ہے۔ گاڑی بگڑ جائے تو سفر نہیں کٹتا ہے۔ آدمی گاڑی سمیت ہچکولے کھانے لگتا ہے۔

زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے۔ دونوں کے تئیں کوئی لغزش ہو جائے تو بندے کو ہر حال میں سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ دونوں سے کسی بھی صلے یا اچھائی کی توقع فضول ہوتی ہے۔

بہر حال ایسا بھی نہیں ہے کہ دونوں صرف قدرِ مشترکہ کی ہی حامل ہیں۔ چند صورتوں میں دونوں یعنی بیوی اور گاڑی ایک دوسرے کے بالکل برعکس بھی ہیں۔ مثلاً رات کے ایک دو بجے یا کسی بھی پہر آپ کا کوئی پروگرام بن گیا اور با عملِ مجبوری، کسی کام سے آپ کو کہیں نزدیک یا دور پار جانا ہے تو کیا مجال آپ کی گاڑی کو کوئی عُذر یا انکار ہو۔ آپ اپنی گاڑی کا رُخ جس طرف بھی موڑیں گے، وہ اُسی طرف دوڑنے لگے گی۔ آپ کو بیوی کی طرح گاڑی کو منانا نہیں پڑے گا۔ سو سو جتن اور خوشامدیں نہیں کرنی ہوں گی۔ کسی بھی طرح کے بہلاوے اور ماٹیویشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

علاوہ ازیں آپ جب چاہیں گاڑی سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ مگر بیوی سے با آسانی پیچھا نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ آپ اپنی گھسی پٹی گاڑی کے بدلے میں نئی خرید سکتے ہیں۔ مگر اپنی بیوی سے پلّو نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ گاڑی اونے پونے بھی بکے تو کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتی ہے مگر بیوی کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ پہلے تو اس سے جان ہی نہیں چھوٹتی اور اگر چھوٹ بھی جائے تو مہر سمیت، نان ونفقہ اور ساتھ میں بچے بھی دینے پڑ جاتے ہیں۔ یوں ایک اچھا بھلا انسان یتیم و مسکین سا ہو کر رہ جاتا

ہے۔مختصر یہ کہ گاڑی کچھ نہ کچھ دے کر جاتی ہے۔مگر بیوی سب کچھ لے کر جاتی ہے۔اگر کچھ دیتی ہے تو ڈھیر ساری رسوائیاں،تنہائیاں اور ڈھیر سارے الزام تا کہ بندہ کسی اور کے قابل نہ رہے۔لہٰذا دونوں کے معاملے میں از حد محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

●●●

☆---زنفر کھوکھر

برقعہ

برقعہ ایک معتبر لباس کا نام ہے جسے پرانے وقتوں میں پردے اور موجودہ وقت میں فیشن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے ایک نمائندہ لباس ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ کیونکہ یہ ایک منفرد اور مخصوص پہچان دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو منفرد ہونا کسے اچھا نہیں لگتا۔ لفظ ''منفرد'' ہی اپنے آپ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ لفظ ادب لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے خاص طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ آپ کی تخلیق منفرد ہے، آپ کی تحریر منفرد ہے، آپ کی شاعری منفرد ہے یا پھر یہ کہ آپ کا کام منفرد ہے تو یقین مانئے سننے والے کو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ کیوں کہ منفرد ہونے کا مطلب خاص ہونا ہوتا ہے۔ برقعے کو بھی ایک منفرد لباس ہونے کا شرف حاصل ہے۔

برقعہ یوں تو خواتین کا لباس ہے مگر کسی ضرورت کے تحت اسے مرد بھی استعمال میں لا سکتے ہیں۔ یوں بھی آج کل یہ فرق مٹتا جا رہا ہے کہ کون سا لباس کس کا ہے۔ کالے کا، گورے کا، بوڑھے کا، جوان کا، مرد کا یا خاتون کا۔ بعض نازک مواقع پر جان بچانے اور پہچان چھپانے کے لئے مرد حضرات بھی بصد شوق اور بصد احتیاط برقعہ اوڑھ سکتے ہیں۔ ایسا دیکھنے میں بھی آیا ہے کہ بعض حساس اور پکڑ دھکڑ کے موقعوں پر بڑی بڑی ہستیاں بھی صنفِ مخالف کا لباس پہن کر بچ نکلنے میں کامیاب رہی ہیں۔ بہت عرصہ تک پاجامہ مردوں کا لباس رہا۔ پھر خواتین نے بھی پہننا شروع کر دیا۔ کوئی

ہرج نہیں ہے۔ایسی باتیں تو سیکولر مزاج اور جمہوریت کو تقویت بخشتی ہیں۔ ہرج اگر ہے تو بس ننگا رہنے میں ہے۔

کہتے ہیں کہ قدیم انسان پتوں اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے جسم کو ڈھانپے رکھنے کے جتن کیا کرتا تھا۔ آج کل انسان کو قسم قسم کے لباس میّسر ہیں۔ پھر بھی بعض لوگ ننگا رہنا پسند کرتے ہیں۔ جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کو ہر حال میں باپردہ رہنا چاہئے۔ برقعہ پردے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف تحفظ فراہم کرتا ہے بلکہ عزت ورتبہ بڑھاتا ہے۔خود اعتمادی فراہم کرتا ہے۔ برقعہ ہر رنگ کا پہنا جاسکتا ہے۔مگر کالے رنگ کے برقعے میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ ویسے رنگ کوئی سا بھی ہو، برقعہ حسن کو چار چاند لگاتا ہے۔ بدصورت کو بھی خوب صورت بنا دیتا ہے۔اٹریکشن بھر دیتا ہے۔ دیکھنے والوں کا تجسس بڑھاتا ہے۔ بقول شاعر

برقعہ پہنا جب اک ادا سے لگنے لگے وہ جدا جدا سے

برقعہ پہن کر بہت سارے ضروری اور غیر ضروری کام بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں۔چھپ کر بھاگنا، چوری کرنا اور بھیک مانگنے جیسے کام برقعہ پہن کر بخوبی انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ برقعہ ایک ایسا لیبل ہے جس پر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی خاتون برقعہ اوڑھ لیتی ہے تو وہ آناًفاناً نہایت ہی محترم اور معتبر ہو جاتی ہے۔اس کا شمار شریف النفس اور پاک دامن خواتین میں ہونے لگتا ہے۔ کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ اسے پہچان سکے۔ کسی مائی کے لال کی یہ ہمت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اس سے آنکھیں ملا سکے یا آنکھیں چار کر سکے۔ کیوں کہ وہ عزت ورتبے کے اس مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں کسی ایرے غیرے کی نظریں بھی پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں۔خود وہ کیا دیکھتی ہے؟ اسے کچھ دکھائی بھی دیتا ہے یا نہیں؟

اگر دیکھتی ہے تو کس کس کو اور کس انداز میں دیکھتی ہے؟ ان سبھی باتوں کی کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہو پاتی ہے۔ ہمارے خیال میں سبھی خواتین کو برقعہ پہننا چاہیئے۔ مگر اب اس بات کا کیا کیجئے کہ ہمارے ہاں اچھی بات میں بھی کیڑے نکالنے والے بن بلائے مہمان کی طرح آدھمکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ خواتین خود برقعہ اوڑھ کر اور اپنا چہرہ تک ڈھانپ کر ایروں غیروں کو دیکھتی اور ٹوہ لیتی پھریں۔

ایک صاحب نے برقعہ پہننے کا یہ فائدہ بتایا کہ آدمی بری صورتیں دیکھنے سے بچا رہتا ہے۔ دراصل ظریف طبع کے لوگ کچھ اسی طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ برقعہ ایک اضافی بوجھ ہے اور بھید بھرا ہے۔ پردے کے لئے لباس ہی کافی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ برقعہ سراسر دھوکہ ہے۔ یہ آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ اس سے بڑے مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر پہننا ہی ہے تو چہرہ نہ ڈھانپا جائے تا کہ اپنے پرائے اور رشتہ دار کی پہچان ہو سکے۔

جی ہاں! چہرہ آدمی کی پہچان ہے۔ آواز پہچان ہے اور چال بھی پہچان ہے۔ قدرت نے بندے کے ہر ایک عضو میں اس کی پہچان رکھی ہے۔ علاوہ ازیں وہ وہ کام بھی بندے کی پہچان ہوتے ہیں جو وہ اپنی مرضی سے سرانجام دیتا ہے۔ مگر کچھ لوگ پہچان سے اس قدر خائف ہوتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا کام ہی نہیں کرتے ہیں، جس سے ان کی پہچان بنے۔ اس لئے وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ بعض لوگ کچھ ایسے کام کرتے ہیں جو انہیں اجازت ہی نہیں دیتے ہیں کہ وہ پہچانے جائیں۔ مثلاً کہیں ڈاکہ ڈالنا، بھیک مانگنا، چوری کرنا، کوئی واردات انجام دینا یا اسی نوعیت کے دیگر کئی کام۔ ایسے کام کرنے والے لوگوں کے لئے بھی برقعہ بڑے کام کی چیز ہے۔ غرض یہ کہ ایک پنتھ اور دو کاج۔ پردے کا پردہ اور کام بھی حل۔ یہی وجہ ہے

کہ اپنی گونا گوں صلاحیتوں اور کارکردگی کی بدولت برقعہ اب خود کو بین الاقوامی توجہ کا مستحق ٹھہرا چکا ہے۔اب اس کی شہرت کو چار چاند لگ چکے ہیں۔

پرانے وقتوں میں برقعہ پہننے والیوں کو شریف النفس اور چھوئی موئی سمجھا جاتا تھا۔مگر اب روش بدل گئی ہے۔اب برقعہ پہننے والیوں کو نہایت ہی بہادر سمجھا جاتا ہے اور شیرنی کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔یہ ایک خوش آئند بات ہے اور برقعے کے استعمال میں توسیع لانے والی ہے۔سبھی خواتین کو اور بالخصوص ان خواتین کو جنہیں لباس میسر نہیں ہے اور وہ لگ بھگ ننگا رہنے پر مجبور ہیں ،ان کے لئے برقعہ اشد ضروری ہے۔شرط یہ ہے کہ برقعہ پہن کر اپنی پہچان کو باقی رکھا جائے تا کہ کسی بھی طرح کے مغالطے اور دھوکے سے بچا جا سکے۔

کہتے ہیں کہ ایک بندے نے اپنے کارندوں کو ایک جگہ کا ایڈرس بتاتے ہوئے کہا کہ فلاں بستی اور فلاں گلی سے نکلنے والی دو برقعہ پوشوں میں سے سیاہ برقعہ پوش کو اس انداز سے اٹھالایا جائے کہ اسے آنچ تک نہ آئے۔کئی دنوں کی کوشش کے بعد کارندے جب سیاہ برقعہ پوش کو اٹھالانے میں کامیاب ہوئے تو بندے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔اور وہ دہائی دے اٹھا۔

دراصل ہوا کچھ یوں تھا کہ اس روز دونوں سہیلیوں نے اپنے برقعے ادل بدل کے پہن لئے تھے۔

●●●

☆......زنفر کھوکھر

گالی

''گالی'' یہ وہ صنفِ گفتگو ہے جس میں ہر خاص و عام اپنے اپنے کمالات و جواہر دِکھا سکتے ہیں۔ یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ اِس میں کمال حاصل کرنے کے لئے ریاضت وریہرسل کی قطعی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ صرف موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے معمولی سی لغزش یا کوشش سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ مگر کچھ لوگ تو بغیر موقع و محل کے اپنی زبان کو گالی سے تر رکھتے ہیں۔ اپنی ہر بات کا آغاز گالی کی آمیزش سے کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی گالی میں وزن اور وقار باقی نہیں رہتا ہے اور اِن کی گالی کسی کو لہولہان نہیں کر سکتی ہے۔

دراصل گالی دینا فطری عمل ہے، جب حضرتِ انسان کو کسی طرح کی ٹھیس یا کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ردِ عمل کے طور پر وہ پہلا فریضہ گالی دینے کا ہی انجام دیتا ہے۔ یعنی کہ بوقتِ ضرورت یہ خداداد صلاحیت اپنے آپ اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اِس فن کے لین دین کرنے اور برتنے سے اِس میں جدّت اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی نوعیت کا یہ واحد خزانہ ہے جو استعمال کرنے سے ختم نہیں ہوتا ہے۔

کچھ لوگ تو گالی کے لین دین سے بچنے کی کوشش میں رہتے ہیں اور یوں خود کو شرفا میں شمار کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کے منہ میں گالی دینے والی زبان نہ ہو وہ ہر لحاظ سے شریف ہی ہو۔ بعض شرفا کی سیدھی سادھی باتیں ہی گالی جیسا دَم خم رکھتی ہیں بلکہ گالی سے بھی کہیں زیادہ پُر تاثیر ہوتی ہیں۔ گالی کی خصوصیت یہ ہے

کہ اِسے ادا کرتے وقت دانت پیسنے کی نوبت آجاتی ہے۔ممکن ہے انسان نے اپنی گفتگو کا آغاز ہی گالی سے کیا ہو۔گالی کا چلن ہر دور اور ہر تہذیب میں رَچا بسا رہتا ہے۔ اِسے صرف جہلا ہی نہیں، اُدبا و فضلا بھی بڑے شوق و رغبت سے برتتے ہیں۔

اَدب کی تخلیق میں جس نے جتنی بڑی گالی دی لوگوں نے اُسے اُتنا ہی بڑا رُتبہ دیا۔گالی دینے کا ایک اور معتبر نام ''کیچڑ اُچھالنا'' ہے۔آج کل کیچڑ اُچھالنے کا چلن عام طور پر حاکم اور سیاسی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔کیچڑ اُچھالنے کے پسِ پردہ دراصل گالیاں ہی دی جاتی ہیں۔اکثر لوگ گالی کا جواب گالی ہی سے دیتے ہیں اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔مگر جہلا قسم کے لوگ اینٹ کا جواب پتھر کے مصداق گالی کا جواب ڈنڈے سے دینے پہ اُتر آتے ہیں۔یہ طریقۂ کار نہ صرف گالی کی شان کے خلاف ہے بلکہ انتہائی غیر واجب اور نقصان دہ ہوتا ہے۔بعض لوگ کسی کی دی ہوئی گالی آرام سے ہضم کر لیتے ہیں۔گالی ہضم کرنا دراصل جگر گردے کا کام ہے۔ایسے لوگ بڑے فراخ دل کہلاتے ہیں۔

کچھ لوگ تو گالیاں پی بھی لیتے ہیں۔گالی پی جانا ہضم کرنے کی بہ نسبت زیادہ کٹھن کام ہوتا ہے۔گالی پی جانے کا دم خم صرف دیہاتی بیویاں ہی رکھتی ہیں، جو اُٹھتے بیٹھتے شوہر کی گالیاں سِسک سِسک کر پیتی رہتی ہیں اور اُف تک نہیں کرتی ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو گالی دینا اپنے اندر بے شمار فوائد لئے ہوئے ہے۔ جب فریقین کسی بات پر مشتعل ہو کر بہادری کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ایسے میں اُٹھایا ہوا ہر وہ ہاتھ زیادہ صحت بخش ہوتا ہے جس کے ساتھ گالی کی آمیزش ہو۔

دراصل گالی وہ کارگر ہتھیار ہے جو بغیر لائسنس کے ہمہ وقت آپ کے ساتھ رہتا ہے اور یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کب، کیسے اور کن مواقع پر اور کتنی مقدار میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔

دراصل ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ فائدہ منداورنقصان دہ۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہمیں گالی میں فوائد ہی فوائد نظر آتے ہیں۔ اگر نقصان ہیں بھی تو بہت ہی کم۔

مان لیا آپ کو اپنے حریف پر انتہائی غصہ ہے اور آپ اُس کے سَر پر پتھر دے مارنا چاہتے ہیں، مگر وہ کم بخت اتنے فاصلے پر ہے کہ آپ پتھر اُس تک نہیں پھینک سکتے ہیں، تو ایسی بے بسی کے موقع پر فوراً ایک موٹی سی گالی اُبھر کر آپ کی زبان پر آئے گی اور یکے بعد دیگرے کئی اور گالیاں آپ اپنے حریف پر اُچھال کر خود کو نہ صرف شانت بلکہ فاتحِ عالم محسوس کریں گے۔

کنڈکٹر آپ کا بقایا واپس کرنے میں پس و پیش کرتا رہا۔ آپ کی منزل آن پہنچی۔ آپ نے بقایا طلب کیا، اُس نے اپنے پاس ٹوٹا روپیہ نہ ہونے کا بہانہ کیا اور گاڑی چل پڑی۔ آپ پیچھے سے ایک موٹی سی گالی اُچھال دیجئے۔ بقایا نہ ملنے کا سارا غم جاتا رہے گا۔ آپ کو جب کہیں بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہو تو ساتھ گالی کو ملالیں۔ طاقت دوگنی بڑھ جائے گی۔

اگر طاقت ور کو کسی کمزور جان پہ جلال آجائے اور طاقت ور گالیوں سے پرہیز کرتے ہوئے کمزور پہ ہاتھ اُٹھالے تو ممکن ہے بے چارہ کمزور جان، جان سے جاتا رہے۔ یوں گالیاں بڑے حادثات کو ٹالنے کے کام بھی آتی ہیں۔ گالی کو بروئے کار لا کر ڈنڈا یا دیگر نوعیت کا کوئی ہتھیار اُٹھانے سے بچا جا سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اکثر موقعوں پر گالی آپ کی ہر طرح سے معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً جب کوئی گاڑی اِس انداز سے آپ کے پاس سے گزرے کہ آپ اپنی ہمت سے گاڑی کی لپیٹ میں آنے سے بال بال بچ گئے ہوں یا پھر برسات کے موسم میں کوئی تیز رفتار گاڑی آپ کے دُھلے کپڑوں پر گدلے پانی کی چھینٹے ڈال کر گزر جائے، ایسے ہی بے شمار موقعوں پر بھلا کوئی بتائے تو سہی کہ گالی دینے کے علاوہ آپ کے پاس اور کون

سا ہتھیار باقی رہ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ گالی ہی ایسا واحد ہتھیار ہے جس کے ذریعے آپ اپنے حریف کو اندر تک مجروح کر سکتے ہیں۔ اُس کا دِل وجگر تک لہولہان کر سکتے ہیں اوراس کے باوجود وہ آپ پرضربِ شدید کا مقدمہ درج کرنے میں ناکام ونامراد رہتا ہے۔ چونکہ پولیس کو دِکھانے کے لئے اُس کے پاس کوئی ظاہری ثبوت نہیں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ پولیس بغیر ثبوت کے آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتی ہے۔ یوں بھی لوگوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنا پولیس کے فرائض کے شایانِ شان نہیں ہے۔ پولیس تو اُسی وقت حرکت میں آ سکتی ہے جب وہ مجرم کو رنگے ہاتھوں پکڑے یا پھر ایسے چشم دید گواہ سر چڑھ کر بولیں جن کے ہاتھ جرم میں کلائیوں تک رنگے ہوں اور ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔اسی لئے تو اکثر دوشیزائیں اپنی عصمت گنوانے کے بعد جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں، چونکہ وہ خاطر خواہ ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔

بسا اوقات گالی بڑے جھگڑوں اور مار پیٹ جیسے نقصان دہ کارناموں کو روکنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ چونکہ عقل مند لوگ پٹنے اور پٹانے کے بجائے صرف گالیوں کے لین دین پر ہی اِکتفا کر لیتے ہیں۔

بڑے لوگوں کے پاس جہاں دولت وشہرت کی کمی نہیں ہوتی ہے وہیں اُن کی جھولی گالیوں سے بھی لبالب بھری رہتی ہے۔ یہ گالیاں اُنہیں اُن چھوٹے لوگوں کی طرف سے عطا ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنی طاقت کے بل پر نیچا دکھانے اور اپنی بات منوانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ خلیج کی جنگ میں عراق کے پاس جب لڑائی کے لئے ہتھیار اور سب کچھ ختم ہوگیا تو عراقیوں نے امریکی بمباری کا گالیوں سے منہ توڑ جواب دے کر امریکہ کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

مگر عام طور پر لوگ گالی کو معیوب سمجھتے ہیں اور گالی دینے والے کو قطعی پسند

نہیں کرتے ہیں اور بعض کو تو شریف ہونے کا خطاب محض اس بنا پر عطا کر دیتے ہیں کہ وہ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی گالی نہیں دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ دیگر کئی طرح کی برائیوں اور بداعمالیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی شریفوں اور پرہیزگاروں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

مگر اہلِ دانش عام لوگوں کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ وہ تو گالی کو معیوب سمجھتے ہیں اور نہ ہی گالی دینے والے کو۔ کچھ تجاوز کر کے بھی وہ گالی کو صرف ہوائی فائرنگ کے مترادف ٹھہراتے ہیں اور گالی دینے والے کو ایک بے ضرر سا سپاہی مانتے ہیں۔

اہلِ دانش کے مطابق یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ گالی کی زد میں آنے والا گالی دینے والے کی طرح کوئی باشعور ذی روح ہو۔ گالی جانوروں اور راستے میں پڑے پتھر کو بھی دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا جب گالی دی جاتی ہے تو اس کا مطلب کسی کو تکلیف پہنچانا، اس کی دل آزاری ہرگز نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ تو اپنی تکالیف اور اپنے رنج کا کھلم کھلا اظہار ہوتا ہے۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ گالی سے مشتعل ہو کر جوابی کارروائی پہ اُتر آتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی بھول ہے۔ گالی اپنے اوصاف میں دراصل پہلے سے ہی ایک قسم کی جوابی کارروائی ہوتی ہے جس پر مزید کارروائی کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ گالی بڑے بڑے جھگڑوں کو جنم دیتی ہے، دراصل وہ گالی کا مفہوم غلط طریقے سے نکالتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گالی دینے والا ہماری توہین کر رہا ہے، جبکہ حقیقت میں گالی دینے والا اپنے ہی غم و غصے کا اظہار کر کے خود کو شانت کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ لہٰذا گالی کے جواب میں مشتعل ہو کر جوابی کارروائی پہ اُتر آنا قطعی طور پر غیر دانشمندانہ فعل ہے۔

●●●

☆۔۔۔غلام حسن طالبؔ

انتظار

انتظار ایک ٹھہراؤ ہے جو بے قراری اور شتابی کے باوجود بے حس وحرکت رہتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ انتظار ذرائع ابلاغ کے مروجہ کمرشل بریک کی طرح ایک ایسا وقفہ ہے جو خود تو ساکت رہتا ہے لیکن اس کے دوران زندگی کی دوڑ جاری رہتی ہے۔ ایک تشنہ دل منتظر چاہئے کتنے ہی انتظاروں کے نتائج دیکھنے کے لئے پھڑ پھڑاتا ہو لیکن ان کے دوران وہ سہانے خواب دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ میرا یہ مشاہدہ ہے کہ بنی نوع انسان اُمید وبیم کی زندگی گزارنے کے دوران اپنے آگے مقدر کے خوش آئند لمحات دیکھنے کی آس لگاتا ہے۔ اس نوعیت کے اندازِ فکر کو انتظار سے ہی موسوم کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ لوگ اِس بات کو اکثر دہراتے ہیں کہ آگے کی خدا جانے، لیکن اندر ہی اندر وہ لامحالہ اچھائی کے منتظر ہوتے ہیں۔ دراصل مثبت سوچ رکھنے والے افراد میں جو تڑپ اور بے صبری ہوتی ہے وہ اظہار میں بہت کم آتی ہے کیونکہ ایسے لوگ وقت وقت پر دامنِ اُمید تھام لیتے ہیں۔ شعر ہے کہ:

زندگی، زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

انسانی زندگی کے سفر میں کئی مرحلے یا پڑاؤ آتے ہیں جنہیں طے کرنا ہوتا ہے۔ اس پورے سفر کے دوران ایک انسان منزل بہ منزل کے انتظاروں سے اُمیدوں کے سہارے گزرتا ہے۔ حالانکہ ان میں خوش بختی اور یاس وحسرت کی داستانیں بھی

ہوتی ہیں۔ آدم زاد یا آدم زادی کو بچپن سے ہی طویل سفر طے کرنے کے بعد جوانی کی دہلیز پر، زہے نصیب، قدم رنجہ ہونے کا انتظار اوراسی کے ساتھ بالغ یا بالغہ کو بیاہنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کی جوانیاں ڈھل جاتے ہی پیرانہ سالی کی طرف چارونا چار شفٹ ہو جانے کا انتظاراور پھر بڑھاپے میں آخری رختِ سفر باندھنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ایک انسان کو دنیاوی زندگی کے سفر میں بے شمار انتظاروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کامیاب ہونے کی صورت میں وہ خوش نصیب کہلاتا ہے جبکہ نامرادی کی صورت میں وہ بدقسمت کہلاتا ہے۔ فطرت نے دن رات کے آب وہوا اور ماہ وسال کے موسموں کا تغیر وتبدل دھرتی پر رہنے والے تمام جانداروں کی بھلائی کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ ایسی تبدیلیاں وقوع میں آنے کے دوران لگتا ہے گویا الادین کے چراغ کے کمالات ہیں۔ جب سے موسمیاتی ماہرین کی پیش گوئیاں صحیح ثابت ہونے لگی ہیں لوگوں نے فلکِ شعبدہ باز کی طرف نظریں جمانا اور آنکھوں دیکھی پر تکیہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ خدا نے سائنسی علوم پڑھنے والوں کو وہ قوت عطا کی جس کی بدولت لوگ ان کی موسم کے تغیر وتبدل سے متعلق خبروں پر اعتبار کرنے لگے ہیں۔

اب یہ خبرنامے جن کا شہر ودیہات میں انتظار ہوتا رہتا ہے، اتنے قابل اعتبار تصور ہونے لگے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان پر غیبی مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ ان خبرناموں کی اعتباریت اور مقبولیت سے مانوس ہوکر لوگ اب شادی بیاہ کی تقریبوں وغیرہ کے لئے ایام خاص مقرر کرتے وقت موسم کی تازہ جانکاری حاصل کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زراعت اور باغبانی سے وابستہ لوگ بیج بونے، فصل کاٹنے، دوائیاں چھڑکنے اور کھاد ڈالنے جیسے موقعوں پر پہلے موسمی اطلاعات سنتے ہیں اس کے بعد ہی کام دھندے کے دِن مقرر کرتے ہیں۔

داناؤں کا قول ہے لالچ بُری بلا ہے۔ مگر کیا کریں حرصا حرصی کا گراف بھی

منشیات کی وبا کے گراف سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے۔ لہٰذا ایک انسان کی دنیاوی تمنائیں جتنی کم ہوں گی، اتنے ہی حساب سے اس کے انتظاروں کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ کہتے ہیں سخن گوئی مشکل نہیں، سخن فہمی مشکل ہے۔ شعر وسخن کی دنیا کے لوگوں کی کبھی کبھی خدا سے استفہامیہ انداز میں مخاطبت ہوتی ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ایک سخنور کے حساب وکتاب کے مطابق چار دن کی یہ زندگانی ہم نے مانگ کر لائی تھی۔ اس میں دو دن آرزؤں میں اور پھر دو دن انتظار میں کٹ گئے۔ باقی غیر ممکن الوصول۔۔۔!

ایک قول ہے ''عشق ومُشک چھپائے نہیں چھپتے'' عشق مجازی میں عاشق ومعشوق کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کا انتظار جس کی دردگیں بےقراریاں اب داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں۔ فون کی آمد کیا ہوئی انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ ایک ویڈیو کال کے ملنے ملانے سے ملاقات میں دیر نہیں لگتی۔ عشق حقیقی کے موضوع پر میں کیا بات کروں، باریک بین ہوں نہیں! البتہ دریافت کرنے پر میرے ایک دوست نے مجھے کچھ دیر انتظار کرایا۔ رات کو فون پر شاعر مشرق کے ایک مصرعہ ''کبھی اے حقیقت منتظر آ لباسِ مجاز میں'' کا حوالہ دیا۔

بہر حال وقت کسی کا بھی انتظار نہیں کرتا۔ کہاوت بھی ہے کہ ہاتھ سے گیا ہوا وقت اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔ علامہ اقبالؔ نے کسے مجذوب کے حوالے سے لکھا یہ شعر مخاطب کے لئے انتظار میں رہے گا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

فارسی کے ایک عظیم شاعر شیخ سعدی شیرازی نے اس موضوع کے حوالے سے ایک پتے کی بات بیان کہی ہے۔

''ایک انسان کی ساری عمر اچھے دنوں کے انتظار میں گزر جاتی ہے، بعد میں پتا چلتا ہے کہ جو دِن گزر گئے، وہی اچھے تھے''۔ ویسے بھی لوگ موجودہ زمانے میں پرانی شراب نئی بوتلوں میں بیچتے ہیں۔ اکثر ہم ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے ''انتظار کی گھڑیاں ختم'' ہونے کے دبنگ اعلانات سماعت کرتے ہیں۔ بھلا ان ایجنسی یا کمپنی والوں سے کوئی پوچھے کہ لوگوں نے کب آپ کے نئے پروڈکٹ کی خبر سنی تھی یا مارکیٹ میں آنے کا انتظار کیا تھا؟ جو آپ کہتے ہیں کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔

ادھر سے انٹرنیٹ کے معرض وجود میں آنے سے انتظار کے دورانئے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ شاعروں کے لئے انتظار کی زبردست اہمیت تھی لیکن انٹرنیٹ کی برق رفتاری نے اس کی بھی نفی کر دی ہے۔

●●●

☆۔۔۔غلام حسن طالبؔ

جان پہچان

کسی شخص یا شئے کو جاننے کے لئے پوچھنا پاچھنا ہی کافی ہے لیکن پہچاننے کے لئے جاننے بوجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''ارسطو سے پوچھا گیا، عالم اور جاہل میں کیا فرق ہے؟ جواب دیا جاہل عالم کو نہیں جانتا، کیونکہ وہ کبھی عالم نہیں رہا لیکن عالم جاہل کو جانتا ہے کیونکہ وہ خود جاہل رہ چکا ہے''۔ میری سوچ میں یہ جان پہچان ایک نعمتِ ازلی ہے جو بنی آدم کے لئے پیدائشی ضرورت بن کر رہ گئی ہے۔ ایک نوزائد بچہ جب ماں کا دودھ پینا شروع کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اُسے اس کے رٹنے کی استعداد کے مطابق اپنے عزیز واقارب کے نام پکارنا سکھایا جاتا ہے۔ پتے کی بات تو یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے لے کر کوئی نہیں آتا۔ اگر دنیا میں جان پہچان پیدا کرنے کے عمل کا چلن نہیں ہوتا تو ہر طرف گھومتے پھرتے انجانے ہی انجانے نظر آتے۔ شہر و دیہات میں قبرستانی خاموشی کا سماں بندھا ہوا ہوتا۔ ویسے بھی خدا نے خاص حکمت عملی کے تحت بنی آدم کے جسم کو اعضائے رئیسہ سے بہرہ مند کیا ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ زبان شیرین مُلک گیری، زبان ٹیڑھی ملک بانکا۔ میرے خیال میں ''جان پہچان'' کا لفظ ''تعارف'' کا نعم البدل ہے جو عالمی سطح پر ہر کس و ناکس کے لئے نافذ العمل ہے۔ جان اور پہچان لفظوں کا تقابلی جائزہ یوں لینے کی جسارت کرتا ہے۔ جان سے مطلب کسی فرد یا چیز وغیرہ کو سرسری طور بادلِ نخواستہ جان لینا ہے جبکہ پہچان سے مراد حقیقتِ نفس الامری ہے۔ ایک شاعر نے اس موضوع کے حوالے سے اپنا مَن ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔

آخر تمہارا ناز کشیدہ ہے مصحفی
کیوں بن گئے ہو جان کے انجان یہ کہو

کسی سے ایک بار ملنے یا اس کا ایک دن کے لئے ہم سفر ہونے یا کسی محفل میں کسی غیر کے ساتھ گفتگو کے درمیان آنے سے سرسری جانکاری ہو ہی جاتی ہے جو کبھی کبھار یاد بھی آتی رہتی ہے لیکن غرض کا باولا اپنی ہی گاوے۔ چاہے اُسے اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بھی بنانا پڑے۔ ایسے میں دوطرفہ جان پہچان سرکاری فائل کی طرح داخل دفتر ہو جاتی ہے۔ البتہ جو جان پہچان رشتہ داری یا تجارتی شراکت یا دوستی یا کسی لمبے سفر پر جانے کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتی ہے وہ ہر لحاظ سے حقیقت کے قریب قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ ان اوقات کے دوران متعلقین کو ایک دوسرے کے مزاجوں تک کی رسائی آسانی سے ہو سکتی ہے۔

یوں تو لگتا ہے کہ مردشناس کا رتبہ ایک بھلا مانس، آدمی سے بھی بڑھ کر ہے مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مجھے مردوں کے اعزازی ناموں سے چڑ کیوں ہے۔ تاہم ایک وجہ صاف عیاں ہے کہ مردوں کے یک طرفہ فیصلے آدم زادیوں کو ناگوار گزرتے ہیں، اگر زن شناس کہنے کی اجازت نہیں ہے تو پھر آدم زادے کس کے ایما پر مردِ آہن، مردِ حق، مردِ میدان، مردِ خدا اور مرد بچہ جیسے ناموں سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آدم زادیوں کے معاملے پر جو مختصر سی بات میرے غور وفکر کرنے والے دل و دماغ نے جاری کی ہے۔ وہ اس طرح ہے چونکہ حضرت حوّا کی تخلیق حضرت آدم کی طرح الگ سے نہیں کی گئی ہے بلکہ مشیت ایزدی سے اس کی تخلیق حضرت آدم کی بائیں پسلی سے ہوئی۔ لہٰذا وہ ایک زندہ انسان سے تخلیق کی گئیں اس لئے حوا نام رکھا گیا۔ گویا آدم زادی خود یہ ذات نہیں ہے بلکہ مردِ حیات کا ایک جُز ہے۔

جان پہچان کو اس کے وسیع مفہوم کے تناظر میں دائرالمعارف یا مخزن العلوم

کی علمیت حاصل کرنے اور پھر پرکھنے جانچنے کے بعد ذہن نشین ہونے کا آلہ کار قرار دینے میں شاید کوئی قباحت نہیں ہے۔ دنیا میں انسانوں کی جان پہچان بڑھانے کے لیے بے شمار تعلیمی، سماجی، مذہبی، ادبی اور ثقافتی (سرکاری و نجی ادارے) درس و تدریس کا کام با قاعدگی سے چلاتے رہتے ہیں جس کے دوران متعلمین نئی پرانی جانکاریوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ معلمین خود کس حد تک سمجھا جانے والے علوم کی جان پہچان رکھتے ہیں اور ان کی طرف سے ڈیلیور کئے جارہے نظریات وغیرہ سمجھنے والوں کے لئے کتنے صحیح، کتنے غلط، کتنے مبہم اور کتنے متنازعہ ہوتے ہیں۔ یہی حال مساجد، خانقاہوں، امام باڑوں، مندروں اور گوردواروں کا ہے۔ ذرائع ابلاغ بھی کسی سے پیچھے نہیں، یہاں بھی کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان، سوشل میڈیا والے کہتے ہیں ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ البتہ فلمی دنیا کے جانے مانے ہر فن مولا فنکار امتیابھ بچن جی اپنے پلیٹ فارم ''کون بنے گا کروڑ پتی'' پر کوئز ماسٹری کا لوہا منوا چکے ہیں۔ چنانچہ بالمشافہ ہونے والے مہمانوں میں سے آٹے میں نمک کے برابر شرکا جان پہچان کی کسوٹی پر کھرے اُترنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہم ابتدا سے ہی بدیسی کاریگروں کے مال کے شائقین رہے ہیں لہٰذا سرکار سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ باہر کے اُستاد کار لوگوں کی خدمات حاصل کر کے جان پہچان کو بڑھاوا دینے کو اپنی اولین ترجیحات میں شامل کریں۔ ادھر سے جان پہچان کے عمل میں بھی دھاندلیاں ہونے کی معتبر اطلاعات ہیں۔ خبر ملی ہے کہ بعض حضرات کی راہ روِش میں اس حد تک کھوٹ آئی ہے کہ وہ اکثر معاملات میں جان کر بھی انجان بننے کا سوانگ رچاتے ہیں۔ یہ بھی اطلاع ہے کہ جن لوگوں کو معروف یا ذمہ دار شخصیات تک رسائی کرنے میں دشواری پیش آتی ہے وہ خواہ مخواہ کی دوستی جتانے سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ''جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام'' والی مِثل فِٹ آتی ہے۔

جب کسی جوان مرد کی نیت کسی غیر محرم عورت کو دیکھ کر ڈانواں ڈول ہونے لگتی ہے تو وہ اس سے بالمشافہ از نظرِ التفات جان پہچان بنائے رکھنے کی چال چلتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جان پہچان ایک قد آور درخت کی مانند ہے جس کی خوبصورت شاخیں، آدھار کارڈ، الیکشن کارڈ، شناختی کارڈ، راشن کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ کی صورت میں ہر کسی فرد پر سایہ افگن ہیں۔ موبائل فون کے کیا کہنے اِسے تو جیون ساتھی ثانی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ عیاں راچہ بیاں؟

کون کہتا ہے کہ جان پہچان کا عمل سہل الحصول ہے۔ اس عربی قول کے تناظر میں کچھ اپنی بھی خبر لیں، مَن عَرَفَ نفسَہ فَقَد عرفَہ ربہ۔۔۔ ''جس نے اپنے نفس کو پہچانا گویا اس نے خدا کو پہچانا''۔ نفس سے مراد ذات، وجود، حقیقت، لُب لباب، خواہشاتِ نفسانی، ہستی جیسے مترادف الفاظ ہیں۔ کیا آپ نے مشاہدہ نہیں کیا ہے کہ ہماری جان پہچان زیادہ تر ایک دوسرے کے سرسری طور جاننے تک محدود ہوتی ہے، پہچاننے کے لئے پہلے مشاہدہ کرنے کی خاطر فرصت ہونی چاہیئے جو ہمارے پاس ہوتی ہی نہیں۔ اخلاقیاتِ زندگی کے اجزا میں سے نیت، ارادہ، مرضی، منصوبہ، منشا، خواہش، اچھائی وغیرہ بنی آدم کے داخلی اعمال ہیں۔ خدا کے بعد بندگانِ خدا ہی جانتے ہیں کہ ان کے اندر کی کہانیوں میں کیا درج ہے۔ کچھ کچھ تو طبیعتوں کی اعتدالیوں اور بے اعتدالیوں پر بھی منحصر ہے۔

اس صورتِ حال کے ہوتے ہوئے باپ بیٹے، ماں بیٹی، بھائی بہن، بھائی بھائی، میاں بیوی کے درمیان خلیج پڑ جانا اور پھر ایک دوسرے سے مُتنفّر ہونا دراصل اسی جان پہچان کرنے میں اُتاوَلے پن سے سوچنے کے باعث ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس دنیا سے بہت سارے لوگ ایک دوسرے کو پوری طرح جانے پہچانے بغیر رحمتِ حق ہو جاتے ہیں۔

●●●

☆۔۔۔۔غلام حسن طالبؔ

قصّہ کُرسی کا

نسوانی نزاکت والے نام سے مشابہ بے جان کرسی جو ایک زمانے میں صندلی کے نام سے چرچا میں تھی، نے عالمِ اسباب میں ہر دل عزیز ہونے کا اعزاز پانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ کون سا دربار یا ایوان یا ادارہ ہوگا جہاں کرسی نے اپنے لئے پہلے ہی جگہ نہیں بنائی ہو۔ سرکاری اور نجی دونوں سطحوں پر اشرف المخلوقات کی عزت وتوقیر کو چار چاند لگانے میں اس کا ایک بڑا کردار رہا ہے۔ دراصل اس کے عالمی رتبہ ہونے میں حکمت الٰہی کی وہ کرشمہ سازی کارفرما ہے جس کے تحت عرش سے فرش تک اپنا جاہ وجلال قائم کرنے کے لئے پروردگار عالم نے عرش اعظم اور کرسی کی تخلیق آناً فاناً کر کے رکھ دی، جنہیں فرشتگاں سہارا دینے پر مامور ہیں۔ خالق کائنات نے لوح وقلم، عرش وکرسی اور ارض وسماوات وغیرہ معرض وجود میں لانے کے ساتھ ساتھ بنی آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنائی کرسی کے ساتھ میز یا ٹی پائے کا بالمشافہ ہونے کے شرف نیاز سے نوازا ہے۔ کرسی کے معانی میں جہاں چوکی، تخت، مسند، گدی اور سنگھاسن جیسی طرح طرح کی اصطلاحیں بیان ہوئی ہیں وہاں چندن کا معرّب صندلی کی دورنگی (سرخ وسفید) خوشبودار لکڑی سے بنائی گئی کرسی کو کچھ مدت تک صندلی سے موسوم کیا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم فرشِ خاک پر پیدا ہوئے انسان، چاہے دِکھاوے کے لئے ہی سہی، کتنا ہی فرش فروش کریں، کرسی یا صوفے پر بیٹھنے اور بیڈ یا پلنگ پر سونے کا ایک الگ ہی مزہ ہے۔ امیروں نے اپنی نام نہاد بلند پایگی قائم ودائم

رکھنے کے لئے کرسی کی آرام رساں سیٹ صوفہ کو اپنے محلوں کی زینت بنانے کو ترجیح دے رکھی ہے۔ جہاں ہم سب کو صوفہ کی نرم ملائم سیٹ اور حد سے زیادہ پست قد ہونے کی واقفیت ہے وہیں ہمیں اس کے بھاری پن کا بھی بخوبی احساس ہے۔ اگر ہم غور کریں تو کرسی اور صوفہ کے بارے میں یہ بات عیاں ہوجائے گی کہ گویا پرانے ماڈل کے مقابلے میں جدید ماڈل کی آرام رساں کرسی مارکیٹ میں لانچ ہوگئی ہے۔ مگر دیگر کیفیات کے سبب صوفے کا ہی پلڑا بھاری رہتا ہے۔ وہ اس لئے کہ ایک صوفہ آسانی سے اٹھایا نہیں جاسکتا جبکہ ایک کرسی کو کندھے یا سر پر اٹھانے کے لئے محنت بھی کرنا پڑتی ہے اور راحت بھی نصیب ہوتی ہے۔

یوں تو کئی قسم کی کرسیاں بازاروں میں دیکھی جاسکتی ہیں لیکن جب سے پلاسٹک سے بنائی گئی رنگارنگ کرسیاں مارکیٹ میں پانیوں کی طرح ٹھاٹھیں مارنے لگی ہیں، لکڑی کی کرسیوں کے معاشرے کا رنگ دِگرگوں ہوگیا ہے۔ جہاں لکڑی کا کچرا راکھ ہوجاتا ہے وہیں پلاسٹک کی کرسیوں کے کچرے کا زائل ہونا بعید از قیاس ہے۔ ہم بھی زمانہ دیکھے بیٹھے ہیں، جب کسی غریب انسان پر امیری کا بھوت سوار ہوجاتا ہے وہ پھر خواب دیکھنے لگتا ہے۔ آناً فاناً اپنے گھر کے آنگن میں ایک چھوٹا سا پارک بنانے کی سوچتا ہے اور اس میں ایک دو کرسیاں رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ الغرض اِس کرسی کا عمل دخل سرکاری اداروں وغیرہ کے ساتھ ساتھ نجی اداروں وغیرہ میں بھی بڑھنے لگا ہے۔ کسی بھی ہیر کٹنگ سیلون پر خاص انواع کی آرام رساں کرسیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ڈینٹل کلینکوں پر بھی آرام دہ کرسیاں ہوتی ہیں تاکہ بیماروں کا علاج آسانی سے ہو اور دردآگیں دانت نکالتے وقت ایک مریض کو نفسیاتی طور بھی سہولیتیں میسر رہیں تاکہ اسے کسی قسم کی کوفت اٹھاتے وقت سہلایا جائے۔

شادیوں کی تقریبات کے دوران دُلہن دُلہے کو مہندی لگانے کی رسم کرسی پر

انجام دینے کے علاوہ میک اَپ کرنے، مہمانوں کی مجالس میں دلہا کو بٹھانے اور برأت آنے کے موقعے پر دلہا کی بھرپور آؤبھگت کرنے کے لئے بھی کرسیاں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ تعلیمی اداروں اور تمام قسم کے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں میں کام کرنے والے انسانوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں ایک زمانے سے مروج ہیں۔ دراصل یہ کرسی انگریزوں کی دین ہے کیونکہ وائٹ کالر بابوؤں کے لئے کرسی ایک مناسب بیٹھک قرار پائی ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض ٹے پتلون پہنے ہوئے سرکاری افسروں کا دماغ فرش پر لگی کرسیوں پر بیٹھ کر عرش پر ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ وہ اقتدار کے نشے میں ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے ''چیئر شوز دی مین'' جس کا مطلب ہے کہ ایک انسان کی پہچان کرسی سے ہوتی ہے۔ اس تناظر میں سرکاری و نیم سرکاری سربراہان کی کرسیاں اکثر زیر بحث آتی رہتی ہیں۔ پرانے زمانے میں بادشاہت نے جانشینی کو عروج بخشا تھا۔ اب یہ زمانہ کہ لوگوں کے منتخبہ نمائندے ایک چنیدہ کو اعلیٰ اقتدار کا مالک بناتے ہیں اور وہ کرسی نشین ہو جاتا ہے۔ مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب ایک وزیر اعظم کی کرسی پر سالہا سال تک بیٹھنے والی شخصیت کو وزیر اعلیٰ کی چھوٹی کرسی میں ٹھُسنا پڑا تھا۔ کرسی کے لئے رسہ کشی یا جنگ فی الحقیقت اقتدار حاصل کرنے کی لڑائی ہوتی ہے۔ کبھی کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے کرسی کو لات ماری۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ لاتیں اقتدار پر چلائی جاتی ہیں، کرسی پر نہیں کیونکہ یہ ہر وقت اس کی ہوتی ہے جو حسبِ ضابطہ اس کا جائز حق دار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ کرسی کسی کے اپنے اوپر براجماں رہنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ جب کبھی کسی ملازم یا افسر کا کسی عہدے پر معیاد ملازمت سے قبل تبادلہ کیا جاتا ہے اور وہ عدالتِ عالیہ میں رِٹ دائر کرتا ہے تو وہ اپنا مقدمہ لڑنے کے دوران اپنی پرانی کرسی سے لِپٹ جاتا ہے تا کہ اپنے بدلے آنے والے کو کرسی پر قبضہ کرنے کا فی الحال چانس

نہ مل پائے۔

ادبی، سماجی اور مذہبی تقریبات کے دوران سب سے پہلے ایوانِ صدارت یا پریزیڈیم کرسیوں، ٹیبلوں اور صوفوں سے سجائے جاتے ہیں۔ کسی بھی مجلس کی صدارتی کرسی معظم اور مقتدر شخصیت کے لئے مختص کی جاتی ہے۔ ویسے تو فارسی زبان کی ایک کہاوت ہے ''صدر ہر جا کہ بنشیند صدر است'' گویا صدر جس کرسی پر بھی بیٹھتا ہے صدر ہی کہلاتا ہے۔

کسی کی عزت افزائی کرنے کے لئے اُسے سب سے پہلے کرسی دی جاتی ہے۔ دنیا میں حکمرانی یا اقتدار کے لئے جو جنگ و جدل چلتی رہتی ہے اس کو خواہ مخواہ کرسی اقتدار کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ اب تو ہمارا یہ حال ہے کہ ایک بار جو سیاست دان کرسی نشین ہو جاتا ہے وہ پھر کبھی بھی اس سے اترنا نہیں چاہتا۔ شاید اس لئے کہ سیاست دانوں کے مقدر میں ریٹائرمنٹ یا بڑھاپا لکھا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ جب جب بادشاہت کے دور میں کوئی انقلاب آیا تو تختہ الٹنے کی خبریں پھیلتی تھیں لیکن کرسی الٹنے کی خبر آج تک سُنی ہے نہ سنیں گے

●●●

☆......ایس۔معشوق احمد

اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ

صاحبو! پچھلے چند سال سے ہمیں عجیب صورتِ حال کا سامنا ہے۔ہم جب بھی کسی گلی کوچے یا شاہراہِ عام پر کھڑے ہوتے ہیں تو ہمارا حلیہ، کپڑے اور چال چلن دیکھ کر جو بھی وہاں سے گزرتا ہے، رک کر ہماری طرف ضرور دیکھتا ہے جیسے میوزیم میں رکھی مجنون اور فرہاد کی تصویر پہلی بار دیکھ رہا ہو۔کچھ گزرنے والے فقط دیکھتے ہیں، لب نہیں کھولتے لیکن بعض سلام علیک کے بعد سرگوشی میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں کہ میاں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔یہ نصیحت سن کر ہم اکثر سوچتے ہیں کہ بارالٰہی نہ ہم لاٹھی ٹیک کر چلتے ہیں نہ ہم کسی کھمبے کے سہارے کھڑے ہیں پھر یہ مخلوق ہم سے ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔کہیں شہر میں آنکھوں کی بیماری تو نہیں پھیلی ہے کہ مخلوق کو ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں۔مرزا کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا فرمانے لگے نادان اپنے پیروں پر کھڑا ہونا محاورہ ہے۔اس کا مطلب ہے خود کفیل ہونا۔تم جو یہ مجنون بنے پھرتے ہو، ناخن بڑے ہوئے، بال لمبے اور بے ڈھنگ، پھٹے پرانے کپڑے، جن کو دیکھ کر کتے صبح سے شام تک بھونکتے رہتے ہیں، تم اس وضع کو فوراً ترک کر دو تا کہ کتوں کو تو سکون آئے۔ہم نے مرزا کی بات گرہ باندھ لی اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سعی کرنے لگے۔مرزا کی بات سے ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ ــــــ

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں

سو ہم نے سب سے پہلے لباس تبدیل کیا، اپنا حلیہ درست کیا، مونچھوں کو کتر

ڈالا، بالوں میں کنگھی کرنے لگے اور کام کی تلاش ادھر ادھر کرنے لگے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے ؎

لیلیٰ گھر میں سلائی کرنے لگی
قیس دلی میں کام کرنے لگا

صاحبو! ہم دلی تو نہیں گئے البتہ اپنے شہر میں ہر سرکاری وغیر سرکاری محکمے میں عرضی دی کہ صاحب ہمیں کام دیجیے تاکہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں لیکن ہماری فریاد صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ جہاں جاتے تھے، وہاں ہنر سے پہلے سفارش کا سکہ مانگتے جو ہماری جیب سے برآمد نہ ہوتا تھا تو اپنی راہ چلنے کا مشورہ ملتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ اس دور میں اگر کوئی لڑکا بے روزگار ہے تو اس بچارے کی اس میں اتنی سی خطا ہے کہ وہ لڑکی نہیں۔ قابلیت، صلاحیت، واقفیت، تقدیر، تدبیر، ہمت، ہنرمندی، تجربہ کاری اور اہلیت کو اگر کوئی شکست دے سکتا ہے تو وہ سفارش اور بے ہنر خوبصورت لڑکی ہے۔

بغیر سفارش چند سال لگاتار اور بے شمار ٹھوکریں کھانے کے بعد ہم نے پختہ ارادہ کیا کہ کوئی اپنا کاروبار شروع کریں گے جس سے ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ پیشہ ایسا ہو جس سے ہمارا نام بھی ہو اور ہمہ وقت جیب بھی بھری رہے۔ بڑے بزرگوں سے مشورے کئے، خود تحقیق کی، بازار دیکھے، لوگوں کی پسند ناپسند پر دھیان دیا، لوگوں کا رجحان دیکھا تو ذہن پر انیک خیالات نے دستک دی۔ اب کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کریں تو کریں کیا۔ ایک کام دیکھا پرکھا ہوتا تو وہی کر لیتے۔ ہم نے تو دو سال فقط تحقیق کی اور تیسرے سال کوئی کام شروع کرنے کی نیت باندھی لیکن معاملہ اس لئے ٹھنڈا پڑا کہ کوئی کاروبار شروع کرنے کے لئے آئیڈیا، ہمت اور تحقیق سے پہلے زر کی ضرورت پڑتی ہے۔ زر ہی وہ ہتھیار ہے جس سے غربت کے خلاف میدانِ جنگ میں اتر کر اسے شکست دی جا سکتی ہے۔ مرزا سے پوچھا تو فرمانے لگے

کہ میاں جس کے پاس زر ہو وہ بھلا کاروبار کیوں کرے، بڑے مان سمان سے گھر بیٹھےاور شان سے کھائے۔

صاحبو! جینے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت پڑتی ہےعزت اور پیسہ۔ پیسہ ہوتو دوسرےعزت کرنے پر مجبور ہوہی جاتے ہیں۔مرزا کہتے ہیں کہ جس کے پاس پیسے کا تالانہیں اس کے پاس عزت کی چابی بھی نہیں ہوتی۔عزت کمانے کے لئے پیسہ کمانا ضروری تھا،سوہم نے جتن کرنے شروع کئے۔بینک سے رجوع کیا تا کہ ان سے قرض لے کران روپیوں کومقناطیس بنائیں تا کہ وہ لوگوں کی جیبوں سے پیسوں کو اپنی طرف کھینچےلیکن بینک نے یہ کہہ کر ہماری نینداورخواب خراب کئے کہ ہم انہیں قرضہ نہیں دیتے جن کے پاس پیسےنہیں۔ یہ گارنٹی تو ہو کہ جس کو ہم ایک لاکھ کا قرضہ دے رہے ہیں اس کے پاس کم سے کم دولاکھ ہوں تا کہ ہماری رقم کنارے ہی رہے ڈوب نہ جائے۔بینک سے ناامید لوٹے تو عزیزوں پر نظر ٹھہری۔ہم نے بارہا مشکل وقت میں عزیزوں کو پکارا تا کہ ہماری ڈوبتی کشتی کنارے لگےاور کامیاب ہوکر ہم بھی ڈوبتی کشتیوں کو اچھالا دے دیں لیکن کسی نے ہماری پکار نہ سنی۔تھک ہار کر ہم ادیب بنے لیکن یہاں بھی گزارا نہ ہوا۔اس سمندر میں اترے تو پایا کہ شوقیہ اور کماؤ ادیب میں بڑا فرق ہے۔اس میدان میں کوئی فاتح ایسا نہ پایا جو اپنی تخلیق کی بدولت کچھ کمائے اور بال بچوں کو کھلائے۔ یہ بس تعارف اور تعریفوں کی دنیا ہے جہاں ایک دوسرے کی تعریف کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔جو جتنا بڑا آدمی اس کی اتنی تعریفیں۔بعض تو اپنی شان میں قصیدے لکھواتے ہیں اور کچھ اپنے قلم سے ہی خود کو شہنشاہ غزل اور آبرو افسانہ کی مسند پر بٹھاتے ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ اپنی تعریف آپ کرنے کے دو فائدے ہیں۔ایک یہ کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندہ پڑھا لکھا ہےاور دوسرا یہ کہ جھوٹ بولنے سے خود ہی سزا کا حقدار ہوجاتا ہے۔فاضل مصنف باضمیر ہوا تو زندگی

پھر نادم اور شرمندہ رہتا ہے جس سے تخلیقی ادب کا معیار بہتر ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ بڑے بڑے مصنفین نے خود ہی اپنی تعریفیں لکھ کر اپنے زمانے میں بدنام اور رسوائی پائی لیکن خیر یہ رہی کہ اگلی نسل ان کے جھوٹ سے خاصی متاثر ہوئی۔ منطق اور دلائل کے ساتھ اپنی تعریف کرنے سے یقیناً شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو اپنی تعریف کرنے اور سننے کے نشے میں ایک دو کتابیں لکھ لیتے ہیں تاکہ ان کی شہرت اور نام دور دور تک جائے۔ اس جہاں سے بھی ناامید ہوئے تو صبر پر اکتفا کیا لیکن جتن جاری ہے اور قوی امید ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہوں گے کہ اس مہنگائی کے دور میں اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔

●●●

☆......ایس معشوق احمد

کاٹ کھانا

بقول مرزا"__ ابھی کچھ لوگ باقی ہے جو اخبار پڑھ لیتے ہیں" اِن پڑھے لکھے خوش نصیب لوگوں نے یہ سرخی ضرور پڑھی ہوگی کہ فلاں جگہ کتوں نے ہڑبونگ مچا رکھی ہے اور معتدد لوگوں کو زخمی کیا ہے۔ کسی کی ٹانگ کاٹ کھائی ہے تو کسی کا پیر زخمی کر دیا اور کسی کسی کی ران پر بھی حملہ ہوا ہے۔ جو اخبار نہیں پڑھتے اور سوشل میڈیا پر دن رات سوشل ہونے میں سرگرداں ہیں وہ بھی اس صورت حال سے آشنا ہوں گے اور ان تک بھی ایسی خبریں آتی ہوں گی۔ صاحبو! آدمی بھوکا ہو تو کھانا کھاتا ہے تو بچارا بھوکا کتا کسی انسان کی ٹانگ بھی نہیں کھا سکتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ کتا ٹانگ نہ کاٹ کھائے اور تھانیدار رشوت نہ لے تو پہچان میں نہیں آتے کہ ٹانگ کھانے والا تھانیدار ہے اور رشوت کھانے والا کتا۔

ہمارے ہاں اکثر ایسی خبریں گشت کرتی ہیں کہ فلاں نے رشوت کا نوالہ کھا کر دوسروں کا حق کھایا ہے اور بعض کے پیٹ تو اتنے بڑے ہیں کہ باہر لٹک رہے ہیں لیکن پھر بھی کھانے میں احتیاط نہیں برتتے۔ جو مل جاتا ہے کھا لیتے ہیں یہاں تک کہ زمین، جائیداد، کرسی اور دوسروں کا حق تک کھا جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض موقعوں پر تو احتیاط برتی جاسکتی ہے کھانے کے معاملے میں نہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں نے کاٹ کھانے کے بارے میں پڑھا ہوگا اور کچھ نے دیکھا بھی ہوگا کہ کاٹا کیسے جاتا ہے اور کھانے کے لئے کیسی ہنرمندی درکار رہے۔ پچھلے دنوں یہ خبر ہمارے کانوں نے

بھی سنی کہ ایک استاد نے دوسرے استاد کا کان کاٹ کھایا۔کھانے پر ہمیں اعتراض نہیں جس کی جو مرضی ہے اور جس کا جتنا پیٹ بڑا ہے وہ اتنا کھائے لیکن وہ کھائے جو کھانے کی چیزیں ہیں ۔ بھلا انسان کا کان بھی کوئی کھانے کی شئے ہے۔اس واقعہ سے بدگماں ہونے کی ضرورت نہیں کہ استاد نے کان کیوں کاٹ کھایا۔استاد چونکہ تجربے کرتے رہتے ہیں اس لئے شاید کان کا مزہ اور اپنی زبان کا ذائقہ بدمزہ کرنے کے لئے تجربہ کیا ہو۔اغلبہ ہے کہ دوسرے استاد نے دعوت نامہ دیا ہو کہ آ بیل میرا کان کاٹ کھا۔ بہرحال جو بھی وجوہات رہی ہوں اس واقعہ سنگین سے چند اسباق یاد رکھنے کے ہیں۔

ا۔ ہمارے ہاں کان کٹے افراد بادشاہ وقت رہے ہیں۔اس لالچ میں ہوسکتا ہے استاد نے دوسرے استاد سے مشورے کے بعد اپنا کان کٹوایا ہوتا کہ بعد میں کان کٹا بادشاہ اور کھانے والا وزیر بن جائے۔ یوں بھی وزیروں کو کھانے کی عادت ہوتی ہے۔

۲۔ غصے پر قابو رکھنا چاہیئے ورنہ استاد جیسا اونچا مرتبہ رکھنے والا شخص بھی باؤلا ہوکر کان تک کاٹ کھا سکتا ہے۔

۳۔ ہوسکتا ہے کان نے بُرا سنا ہو اور سزا کے طور کٹ گیا ہو۔شکر ہے استاد کی زبان سے کچھ بُرا نہیں نکلا ورنہ تصور کیجیے زبان کاٹ کر کھا لیتے تو کیا ہوتا۔

۴۔ ہمارے ہاں کسی سے اختلاف کرنا ہو تو احتیاطی تدابیر اپنا کر کان، ناک، آنکھ بچا کر رکھنے چاہیئے کہ بات برداشت سے باہر ہو تو دوسرا کچھ بھی کاٹ کھا سکتا ہے۔

۵۔قوت برداشت نہ ہونے کے برابر ہے۔ بات طول پکڑ لے تو جھگڑے کی منزل پر دم لے گی اور دوران جھگڑا کچھ بھی کاٹ کھایا جا سکتا ہے۔

۶۔تاریخ میں نام زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ تجربات کئے جائیں اور کان کاٹ کھانے کا تجربہ نیا نیا ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ــــ

کھاتے ہیں استاد تک کان کاٹ کر
رہتے ہیں ہمارے ہاں ہنؔدہ مزاج لوگ

دانا لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں کچھ اصولوں پر انسان کو کاربند رہنا چاہیئے کہ بُرا مت سنو، بُرا مت کہو، بُرا مت دیکھو اور بُرا مت سوچو۔ جس کا کان کاٹا گیا وہ کم سے کم ایک اصول اپنی زندگی میں اپنا ہی سکتا ہے کہ وہ اب اچھا بُرا نہیں سن سکتا۔ البتہ بُرا کہہ، سوچ اور دیکھ سکتا ہے۔ جہاں تک کچھ کہنے کا سوال ہے تو بقول غالبؔ ___

بات پر واں زبان کٹتی ہے

واضح رہے کہ غالبؔ نے فقط بات لکھا ہے۔ انہیں حالات کا اندازہ تھا۔ ہم نے دیکھا ہے خیر سے آپ میں سے جو دانا و بینا ہیں وہ بھی دیکھ چکے ہوں گے کہ سچ بولنے پر واں ہی نہیں یہاں بھی اور جہاں جہاں بولا جاتا ہے وہاں زبان کٹتی ہے۔ اب رہا سوال بُرا مت دیکھو، صاحبو! اس سے بُرا ہم کیا دیکھ سکتے ہیں جو ہم نے دیکھا ہے۔ کبھی بُرے حالات، کبھی سنگین جرائم تو کبھی انسان کا وحشی پن کہ چھوٹی بچی کا جسم نوچا جارہا ہے تو کبھی کسی کا قتل کیا جاتا ہے اور جسم کے اتنے ٹکڑے کئے جاتے ہیں کہ سمیٹنا مشکل اور گننا ناممکن ہوجاتا ہے، کبھی سوشل میڈیا پر بے حیائی کا طوفان کہ تین سال کی بچی بھی ناچ رہی ہے اور چالیس سال کی عورت بھی برہنہ ہے۔ اس سے آگے دیکھنے کی اب تاب نہیں کہ اگر یوں ہی انسان کی حرکات جاری رہیں تو وہ دن دور نہیں جب جانور ہم پر ملامت کریں گے اور ہم اف تک نہ کرسکیں گے۔ مرزا کہتے ہیں کہ خدا وہ وقت نہ دکھائے کہ پھلے پھولے الٹا دھندہ اور اپنی کرتوتوں سے ہو بندہ شرمندہ۔

جانور انسان کی حرکات وسکنات دیکھ کر ملامت کرے تو بہ! تو بہ! ہم یہ کیا بُرا سوچ رہے ہیں۔ ایک اصول تو یہ بھی اپنانے کی تلقین کی گئی ہے کہ بُرا مت سوچو۔ جو بُرا سوچے گا اس کا دماغ۔۔۔ ارے صاحب دماغ کون کاٹ کھا سکتا ہے البتہ دماغ

چاٹ ضرور سکتے ہیں۔جس کے پاس بے وقوف دوست اور بیوی جیسی بلا ہو اس کا مغز سلامت کیسے رہ سکتا ہے۔ یہ دونوں بھیجا کھانے میں ماہر ہیں۔مرزا کہتے ہیں کہ سوچنا ہی ہے تو اچھا اچھا سوچنا چاہیے کہ کروڑ پتی کیسے بنا جا سکتا ہے، وزیر با تدبیر کیسے بنا جا سکتا ہے، جورو کا غلام اور حسینوں کا خادم کیسے بنا جا سکتا ہے اور بڑا آدمی بن کر دوسرں پر رعب اور دبدبہ کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔مرزا کہتے ہیں کہ امیر ہونے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی خوبیاں دیکھ کر تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں اور بُرائیوں پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔خاموشی سے یاد آیا ہم بھی کیسی الٹی سیدھی باتیں کر کے آپ کا قیمتی وقت اور بھیجا کھا رہے ہیں۔اس لئے خاموش ہو کر ہم وداع ہوتے ہیں کہ خاموشی ہزار نعمت ہے اور کاٹ کھانے کی بیماری بُری۔مرزا کہتے ہیں کہ کتے اور ڈاکٹر کے سوا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسان کو کاٹے البتہ جیب کاٹنے کا اختیار چور اور رشوت خور کو ہے۔

●●●

☆......ایس معشوق احمد

نام میں کیا رکھا ہے؟

صاحبو کسی بھی شئے یا شخص کا نام اہم ہوتا ہے لیکن کچھ داناؤں نے نادانی میں یہ شوشہ چھوڑا کہ نام میں کیا رکھا ہے؟ نام میں کچھ تو ضرور رکھا ہوگا جب ہی ہمارے بزرگ بسیار تلاش و جستجو کے بعد ہمارے لئے بہتر نام کا انتخاب کرتے ہیں۔ نامور ہونا ہو یا بدنام، نام ہی کو تو پر لگتے ہیں۔ آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی کچھ ناموں کو ہم فراموش نہیں کر سکے اور ہمارے ذہنوں میں ان شخصیات کے فقط نام تازہ ہیں جنہوں نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کی شکل وصورت، ان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے نین نقش ہمیں یاد نہیں۔ یہ نام کی کرامت ہی تو ہے۔ ذرا سوچیں ہمارے مشہور شعرائے کرام میر تقی میرؔ کا نام اگر تیر خطرناک تیر ہوتا تو اس کے اشعار دل کو سکون دینے کے بجائے زخمی کرتے، مرزا غالبؔ کا نام اگر وزیر مالب ہوتا تو اس کی شاعری وزیروں کے وعدوں کی طرح سراب ثابت ہوتی اور علامہ اقبالؔ کا نام اگر والی بال ہوتا تو ان کی شاعری سر کے اوپر سے گول گول ہی جاتی۔ ان کے مناسب نام یہ پیغام سناتے ہیں کہ نام میں ضرور کچھ رکھا ہے۔ شاعر اپنے لئے خوبصورت نام یعنی تخلص رکھتے ہیں جس کی مہربانی سے انہیں یہ چھوٹ ملتی ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی بہتر اور منفرد نام کا انتخاب کر سکتے ہیں لیکن منفرد نام رکھنے کے چکر میں شعرا حضرات نے اپنے لئے عجیب وغریب ناموں کا انتخاب کیا۔ یہ نام جتنے عجیب ہیں اس سے سوگنا غریب۔ شعرا کی تعداد لاتعداد ہوئی اور جب مناسب ناموں کی قلت ہوئی تو انہوں نے اپنی

کیفیات ،اعضا اور جسم پر لگے زخموں کو بطور نام منتخب کیا جگر، دل، غمگین ،نم ناک ،غم ناک ،شرم ناک،حسرت ، یاس ، درد، الجھن ، پریشانی ، زخمی ، گھائل ، باؤلا ،شوریدہ ، سودائی ، مجنون ،بسمل ، مجروح ،مضطر ، بے خبر وغیرہ لیکن کچھ شعرا کو غربت راس نہ آئی اور انہوں نے امیرانہ ناموں کو اپنے لئے منتخب کیا جیسے دل تاج محلی ،جگر قطب میناری ، گردہ لال قلعی ، آنکھ میدانی ، ذہن وسیعی اور سینہ کشادی ۔ بڑے ناموں کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ جلد مشہور ہوئے اور ان کی تتبع میں آج بھی امیرانہ ناموں کا انتخاب کیا جاتا ہے ۔بعض نام معنی کے بالکل برعکس ہوتے ہیں ۔ بہادر خان بزدل ،شیر خان ڈرپوک اور محنت خان کاہل ہو سکتے ہیں ۔اسی طرح ہیبت خان خوبصورت ، وحشت خان دلکش اور غضب خان خوش شکل ہوسکتا ہے ۔اس تضاد کے متعلق مرزا کہتے ہیں جمیل خان کی صورت جب دیکھنے کے قابل نہ ہو اور حسینہ کی صورت ہیبت ناک ہو تو ان کی شکلیں دیکھنے والوں نے خود کو اندھا نہ کیا اور نہ اپنی آنکھیں خراب کیں بلکہ یہ فارمولہ اپنایا کہ نام میں کیا رکھا ہے ۔

صاحبو! ایک وقت ہم پر ایسا بھی گزرا جب ہمیں بھی ایسے خوبصورت قلمی نام کی ضرورت پڑی جس کی دو خوبیاں ہوں اول جلد مقبول ہو اور دوم منفرد ہو ۔ بسیار تلاش کے باوجود ہمیں مناسب نام نہ ملا تو اپنی محبوبہ کے نام کا پہلا حرف اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر انہیں خوش کیا اور خود سرشار ہوئے ۔اس پر بہت سارے لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ کیسا نام ہے ۔ ہمارے پاس جواب موجود تھا جو ہم نے ان کے منہ پر دے مارا کہ حضور نام میں کیا رکھا ہے ۔ غالبؔ کا یہ شعر پڑھ کر ہمیں یہ احساس ہوا کہ نام میں ضرور کچھ رکھا ہے ؎

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

صاحبو! ہم معشوق ہوکر بھی " معشوق فریبی " نہیں کرتے۔ ہمارے آگے لیلیٰ کا مجنوں کو بُرا کہنا تو دور، آج تک کسی لیلیٰ نے ہم سے ہنس کر بات تک نہیں کی۔ ہمارے فقط نام کے معشوق ہونے کا اندازہ کیجیے اور افسوس کیجیے کہ جس معشوق کو کل شعرا نے سر آنکھوں پر بٹھایا، جس کے ناز اٹھانے کو عاشق ہمہ وقت تیار رہتے تھے، آج اس کا یہ حال ہے کہ ـــــــــ

حالات سے خوف کھا رہا ہوں
شیشے کے محل بنا رہا ہوں

محل جب تیار ہوا اور کسی نے پتھر مار کر چکنا چور کر دیا تو ہم سمجھ گئے کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ معشوق شعرا کی مہربانی سے مشہور تھا ہی دھیرے دھیرے اپنی کوتاہیوں سے بھی ہماری شہرت کو پر لگنے لگے اور اکثر فون آنے شروع ہوئے۔ فون پر بعض نیک دل حضرات نے ہمیں حوصلہ افزا کلمات سے نوازا لیکن اپنا نام مخفی رکھا۔ جب ہم نے ان نیک حضرات کے نام جاننے کی کوشش کی تو جواب ملا نام جان کر کیا کرو گے، نام میں رکھا ہی کیا ہے؟۔ ایک دن جب صبح سہانی تھی، بادِ صبا نے سب کے ذہن معطر کئے تھے، چڑھتے سورج نے خوشیوں کا سامان کیا تھا اور آفتاب شباب پر آنے ہی والا تھا کہ فون کے اسکرین پر کسی انجان شخص کا نمبر نمودار ہوا۔ فون اٹھا کر ہم نے سلام کیا، جواب آیا معشوق اپنی بیتی دوسروں کو کیوں سناتے ہو۔؟ عشقیہ کیفیات کا اظہار کیوں کرتے ہو؟

صاحب معشوق ہوں نا اس لئے۔
آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔
نام جان کر کیا کرو گے۔ نام میں کیا رکھا ہے؟
ہم نے خاموشی اختیار کی۔

معشوق کہاں رہتے ہو؟

صاحب میں اپنے گھر کے نزدیک ہی رہتا ہوں۔ دروازے سے باہر جب قدم رکھتا ہوں تو آنگن آتا ہے، آنگن سے باہر نکلوں تو سڑک آتی ہے جو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آتی ہے۔

رک جاؤ معشوق۔۔۔نام کیا ہے محلے کا؟

صاحب نام میں کیا رکھا ہے۔؟

نام میں کیا رکھا ہے؟ یہ سوال جب مختلف ذہنوں میں گردش کرنے لگا تو مرزا بھی اس بحث میں کود پڑے اور انہوں نے ایک نامور خاتون کا قصہ چھیڑا جو چند برسوں میں اتنی نامور ہوئی کہ اس کا ہر مداح، اس کا عاشق ہی نہیں شوہر نامدار بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ ایک عدد شوہر اور آدھ درجن بچوں کی ماں ہے۔ مرزا کہنے لگے کہ اس خاتون کے افسانے اس کی صورت سے بھی بُرے ہیں لیکن خاتون ہونے کی وجہ سے غالبؔ کو اپنے زمانے میں اتنی داد نہ ملی جتنی اسے ملتی ہے اور ادھر چند سال سے اس کے مداحوں، آرزومندوں اور عاشقوں میں بے تحاشا اضافہ ہورہا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اس خاتون کی پاک دامنی پر شک کرنا حماقت ہے۔ یہ الگ بات کہ اس نے اپنا نام بلند و بالا کرنے کا آسان راستہ چن لیا ہے اور وہ ہر نئے عشق کی شروعات بسم اللہ پڑھ کر کرتی ہے۔ جب اس کا نیا مداح اپنے پرانے رقیبوں کے بارے میں سنتا ہے تو اس کا اتنا ہی بُرا حال ہوتا ہے جتنے ویران اس کے افسانے ہیں جو اس نے خود نہیں لکھے بلکہ اپنے نئے فین یعنی زیادہ ہی نزدیک رہنے والے عاشق سے لکھوائے ہیں۔

صاحبو! چشم فلک کے علاوہ ہم نے بھی دیکھا کہ جس خاتون کا ذکر مرزا چاؤ اور محبت سے کر رہے تھے، چند ماہ میں اس کا نام اتنا چمکا اور اس کی کتاب کی اتنی تعریفیں

ہوئیں کہ اب وہ جوان عاشقوں سے مرعوب نہیں ہوتی بلکہ اپنے نام کی وجہ سے وہ جہاں جس محفل میں چاہتی ہے اپنے جلوے بکھیرتی ہے اور آج کل تو بقول مرزا اس کے بوڑھے عشاق اس کے لئے کرسی صدارت تک خالی رکھتے ہیں۔ نام کے لئے انسان ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے کہ بدنام ہوجاتا ہے لیکن نام کما ہی لیتا ہے۔ نام میں کچھ نہ رکھا ہوتا تو نام نامی ہونے کے اتنے جتن اور تدبیریں انسان ہرگز نہ کرتا۔ بقول شاعر ــــــــ

نیک نامی میں کچھ نہیں رکھا
نام بدنام ہو تبھی اچھا

مرزا کہتے ہیں کہ ولیم شیکسپیئر کو جب رقیب کے نام سے نفرت ہوئی اور اس کے کانوں میں اس کا نام زہر گھولنے لگا تو انہوں نے یہ فقرہ کہا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ جب کسی محفل میں ان کی ملاقات رقیب سے ہوتی تھی اور وہ اپنا تعارف کرانے ہی والا ہوتا تھا کہ میرا نام۔۔۔ ولیم شیکسپیئر فوراً کہتے، اجی چھوڑیئے نام میں کیا رکھا ہے۔ اگر آپ کو کسی کا نام بُرا لگتا ہے یا ناپسند ہے تو جب وہ اپنا نام بتانے کی کوشش کریں تو فارمولہ آزمایا ہوا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے۔

●●●

☆......شفیع احمد

کلینڈر

ابن آدم نے دنوں، ہفتوں، مہینوں، برسوں کا حساب قائم کرنے کے لئے کلینڈر ایجاد کیا ہے۔ مانا کہ بنیادی طور کلینڈر کا کام ایک جیسا ہے لیکن شکل وصورت اس کی مختلف ہے۔ مثال کے طور پر پاکٹ یعنی جیبی کلینڈر یہ تو چھوٹا مانو دودھ پیتا بچہ ہے۔ یہ بڑی مشکل سے پڑھے جانے والے حروف میں تاریخ اور دنوں کا حساب دکھاتا ہے۔ اس کے ساتھ کاغذ کے چند اوراق بھی ہوتے ہیں جن پر صاحب کلینڈر اپنے تاثرات لکھتا رہتا ہے جو روزانہ ڈائری کا بھی کام دیتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس پر روزانہ گزرنے والے واقعات قلم بند ہوتے ہیں جن میں کسی کے ساتھ جھگڑے کی تفصیل، کہیں پولیس والے کے ہاتھوں بلا وجہ پٹنے کی روداد، خریداری کرنے کی فہرست اور کسی بازار سے نادار ہوکر چلنے کا اظہار غم۔ یہ تاریخوں کے حساب سمیت چھوٹی چھوٹی تصاویر بھی ساتھ رکھتا ہے۔ یہ کلینڈر جیب میں رکھے ہوئے نوٹ بیچ بیچ میں ورق در ورق سنبھالنے کے کام آتا ہے۔ اس سے یہ نوٹ بری طرح مسل نہیں جاتے، ساتھ میں کلینڈر کا وزن محسوس کرا کے نوٹ جیب کترے کے قہر سے بچے رہنے کی خوشی کا اعلان بھی کرتا ہے۔

ٹیبل کلینڈر یعنی جوان، خوبرو مگر مزاج سے تند۔ یہ دفتری میز کے اوپر یا گھروں میں جہاں کہیں جگہ ملے ایسے ایستادہ ہو جاتا ہے کہ اتنا رعب افسر کا نہیں بیٹھتا جتنا اس کا۔ ہر صبح دفتر کا چپراسی اتنا پونچھا میز کرسی پر نہیں مارتا جتنا اس کی صفائی، اس کا دباؤ اس

وجہ سے دفتر کے چھوٹے ملازمین پر پڑتا ہے کیونکہ صاحب کی ضروری میٹنگ کا حال احوال اسی میں تحریر ہوتا ہے۔ اگر صاحب دفتر پہنچے اور وہاں پتہ چلا کہ غلطی کے سبب میٹنگ میں نہیں جا سکے تو ملازمین ملزمین بن جاتے ہیں اور یوں صاحب کی کلنڈرانہ غلطی کی سزا کلرک اور چپراسی کو مل جاتی ہے۔

وال کلینڈر بزرگ مگر وسیع القلب۔ بڑے حروف میں تاریخ، دن اور لمبی چوڑی تصویریں بھی اپنے شانوں پر اٹھائے رکھتا ہے۔ تصاویر کے حوالے سے کلینڈر کی شخصیت دلچسپی سے خالی نہیں کہ تصاویر اسے نئی جدت پیدا کرتے ہیں۔ کئی وال کلینڈروں پر تصاویر اس قدر خوبصورت ہوتی ہیں کہ انسان چاہتا ہے کہ سال ختم ہوتے ہی ان تصاویر کو فریم کر کے محفوظ کیا جائے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ایسا ہی ہوتا تھا لیکن ان دنوں معاشی بدحالی کے سبب تصاویر تو محفوظ کر لیتے البتہ ان پر شیشے کے فریم چڑھا نہ پاتے۔ ان ایام میں دال روٹی کے حصول کے لئے جتن کرنے پڑتے تھے بھلا کلینڈر محفوظ رکھنا کارے دارد والی آزمائش ہوتی۔ مطلب صاف ہے کہ معاشی مدد کے بغیر یہ ممکن نہ تھا اور ان دنوں کسی بھی ادارے یا مملکت کی طرف سے Economic Package کا حصول ناممکن تھا۔ کسے نہیں معلوم کہ طاقتور ممالک کمزور اور چھوٹے ممالک کی معاشی مدد تب ہی کرتے ہیں جب انہی ممالک سے جان لیوا ہتھیاروں کی خریداری کا آپسی معاہدہ ہو جائے۔ مطلب صاف ہے مدد کر کے چھوٹے ممالک کی پریشانی دور کر دیں لیکن ساتھ میں معاہدہ کر کے وہ ہتھیار استعمال کروائیں جن کے سبب ان کی زندگیاں مختصر ہوں۔ ان حالات میں دل کو چھو لینی والی تصاویر کو محفوظ رکھنا بھلا کس معاہدے کی زینت بن جاتا۔ یہ بھی کہ ہماری زندگی میں کبھی امداد کی ضرورت پڑتی تو وہ بڑے بھائی یا کسی دوست وغیرہ سے ملتی۔ پھر یہ مدد واپس لوٹاتے لوٹاتے زندگی کے بہترین سال چھپا چھپی یا نہ معلوم کتنی عیدی کی رقم ملا

کر پوری ہوجاتی، البتہ آخر پر یہ جملہ قرضے کے طور گردن پر لٹکتا رہتا کہ چلو تم بھی کیا یاد کروگے کہ کسی رئیس سے قرضہ لیا تھا اب آدھے پیسے چھوڑ دیتا ہوں۔

کلینڈر اس مقصد سے آویزاں رکھا جاتا ہے کہ دن اور تاریخ کی نشاندہی کرنے میں کوئی مغالط نہ ہوجائے کیوں کہ ایسا ہوا تو اتوار کے دن سارے مہمان ضیافت اڑا کر گھر کو جا چکے ہوں گے اور ہم پیر کو در بار میزبان میں حاضری دینے پہنچیں گے اور پھر شرمندہ ہوکر واپس نکلنے کی صورت بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ یا یوں بھی کہ نوکری کے لئے زبانی امتحان یعنی انٹرویو کب کا اختتام کو پہنچا ہوگا یا منتخب امیدواروں نے نوکری جائن بھی کی ہو اور ہم دربارِ سرکار میں ماتھا ٹیکنے پہنچ جائیں۔ بڑی کمپنیوں کے اعلیٰ حکام پہلے ہی کام کا کلینڈر تیار کر کے رکھتے ہیں کہ کس مہینے بلکہ کس ہفتے کتنی پروڈکشن اور منافع کا اندازہ ہے اور اگر کسی ہفتے یا مہینے کمی واقع ہوئی تو اس کی کس طرح بھرپائی کی جائے۔ اس بات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کلینڈر صاحب ثروت اور عام خام لوگوں کے لئے یکساں طور ضروری ہے۔

کسی ذہین انگریز نے بڑی پُر مغز بات کہی ہے کہ Death keeps no calender۔ ہم سب اس بات کے قائل ہیں کہ انگریز گہری سوچ رکھتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ گہری بات کرتے ہیں۔ کسے نہیں معلوم کہ موت کا فرشتہ وقت مقررہ پر دستک دیتا ہے اور کوئی کس قدر دروازے کھڑکیاں مقفل رکھے اور اندھیرے کمرے میں بھی چھپ جائے۔ یہ صاحب سب کچھ توڑ تاڑ کر متعین جگہ پر پہنچ کر پکڑ ہی لیتا ہے، مانو فرشتہ موت نہ ہو اسی کی فوٹو اسٹیٹ کاپی یعنی پولیس کا ٹاسک فورس ہو اور ان حالات میں یہ اپنے اسسٹنٹ کو ڈیوٹی پر مامور کرتا ہے۔ کسے نہیں معلوم اس کے ایجنٹ پس و پیش، چپ و راست اور خورد و کلان Body frame میں گھومتے رہتے ہیں۔ حالیہ ایام میں اس نے نئی بھرتی کے طور Covid19 کو اپنی صفوں میں

شامل کیا ہے جس کو ایک دو سے تسلی نہیں ملتی بلکہ درجنوں اور سینکڑوں سے اپنا اسکور بڑھا رہا ہے۔ ایک بات کی تفصیل ذرا واضح کردوں کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ موت کا فرشتہ اپنی دیواروں پر کلینڈر آویزان نہیں رکھتا تاکہ ضروری سروس کے وقت کوئی کنفیوژن سر نہ اٹھائے اور یہ نہ سہی چلو وہ اٹھا کر کام چلاتے ہیں۔ خیر ہمیں کسی اور کی دیواروں سے کیا لینا دینا کیونکہ کشمیر میں ہر کوئی گھر میں کلینڈر ضرور رکھتا ہے۔ کچن، اسٹور یا غسل خانے میں نہ سہی لیکن کہیں نہ کہیں کلینڈر ضرور آویزان ملے گا۔

ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق کلینڈر رکھتا ہے، کہیں مذہبی کلینڈر جن پر مساجد، خانقاہوں وغیرہ کی تصاویر چھپی ہوتی ہیں، یا منادر کی تصاویر جن میں ایک طرف شلوک وغیرہ چھپے ہوتے ہیں۔ دین پسند لوگ اپنے گھروں میں مذہبی کلینڈر رکھ کر ذہنی سکون پاتے ہیں تاہم ملازمین وہ کلینڈر رکھتے ہیں جن میں چھٹیوں کی نشاندہی لال روشنائی سے واضح کی ہوتی ہے تاکہ دور سے ہی نظر آئیں اور کسی مغالطے کی گنجائش نہ رہے۔ عاشق مزاج لوگ ان کلینڈروں کو چنتے ہیں جو ان کمپنیوں کے مالک جن کے روح رواں عاشق مزاج سی۔ای۔ اوCEO ہوں۔ ان کے کلینڈروں پر جنوری فروری میں بھی نظر دوڑائیں تو مزاج میں گرمی اور وجود میں حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ منہ سے رال ٹپکنا شروع ہوتی ہے اور دیر گئے تک جاری وساری رہتی ہے۔ عام طور پر بڑی بڑی کمپنیاں ان اشیا کے اشتہار کے لئے یہ کلینڈر چھاپتے ہیں تاکہ دور دور تک لوگ ان کی طرف مائل ہوجائیں۔

کمپنیوں کے کلینڈر کئی طریقوں سے دلچسپ ہوتے ہیں اور دیکھنے والے ذہن کی گہرائیوں تک ڈبکی لگاتے ہیں اور اشتہار کے کونوں کھدروں کی سیر کر آتے ہیں کہ یہ معمہ حل ہوجائے۔ چلئے مثالیں دے کر سمجھاتے ہیں۔ سیمنٹ بنانے والی کمپنی کے اہلکار زرخیز، سرسبز علاقوں، شفاف آبشاروں، سفید برف والی پہاڑی چوٹیوں کا

انتخاب کرکے انہی کے فوٹو چھاپتے ہیں۔انسان یہ دیکھ کر حیرانی ہی نہیں بلکہ پریشانی کی گہرائیوں میں غوط زن ہو کر سوچتا ہے کہ ایک طرف اس جیسی سیمنٹ کی کمپنیاں آلودگی پھیلانے میں پیش پیش ہیں تو دوسری طرف خوبصورت فوٹو چھاپ کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتی ہیں۔صابن ،واشنگ مشین بنانے والے اگر اپنے ایڈ میں کسی خوبصورت لڑکی کی تصویر چھاپیں تو گلے سے اتر نا جائز ہے مگر باغیچوں اور زمین داری میں کام آنے والے آلات کشاورزی کا بھلا عورت کی خوبصورتی سے کیا کام؟ آلات زمینداری کو ہاتھ میں اٹھاتے ہی نرم و نازک کلائیاں مڑسکتی ہیں، ہل سکتی ہیں یا کبھی ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔انشورنس کمپنیاں خوش حال چھوٹی فیملی کی تصویر چھاپتی ہیں لیکن عبارت پڑھ کر باقی فیملی پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے کیونکہ ناگہانی موت کی تصویر اور اس کا لرزہ وجود پر چھا جاتا ہے۔کمپنی کا قول کہ موت ہونے کے سبب ہماری کمپنی فقط پندرہواڑے میں کلیم سیٹل کرتی ہے۔کسی رکن کی موت اور انشورنس ادائیگی کو بھلا کون ایک ہی ترازو میں تولتا ہے۔ایسی تصویریں گھروں کے اندر فساد کا باعث بن جاتی ہیں کیونکہ فوٹو دیکھ کر خواتین کا تقاضہ ابھرتا ہے کہ ہماری فیملی اس قدر خوش حالی میں کیوں نہیں جیتی اور اس کا الزام بنا تحقیقات مرد کے چہرے پر مل دیا جاتا ہے۔پھر مرد بیچارہ شکایت بھی نہیں کر پاتا کہ اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں۔شاید حکومتِ وقت نے صنفِ نازک کی کڑواہٹ سے ڈر کر تمام ادارے ان ہی کی مدد کرنے کی غرض سے وجود میں لائے ہیں۔دوسری طرف بچے بھی تصویر میں موجود چمکتی دمکتی گاڑیوں اور دل موہ لینے والے مکانات کی تصویریں دیکھ کر ایسی ہی چیزوں کا تقاضہ کرتے ہیں۔کئی اشتہارات میں بے بی فوڈ اور نیپ کن کے لئے ہنستے کھیلتے بچے اپنے پالتو حیوانوں بلی، کتے وغیرہ کے ساتھ زندگی گزارتے دیکھے جاسکتے ہیں۔کئی کیسوں میں صاحب خانہ سے پرشن کیٹ Persian cat اور سفید بال والا

کتا خریدنے کا حکم نامہ اجرا ہوتا ہے اور اس کے سبب اس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے جس طرف کوئی بھی حکم نامہ اجرا کرنے والا زیادہ دھیان نہیں دیتا۔ کئی ایک کلینڈروں پر ایک طرف سگریٹ اور نشہ آور بوتلوں کے فوٹو چھپے ہوتے ہیں تو دوسری طرف معروف کھلاڑی یا فلمی اداکاروں کی تصاویر اور معصوم لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں آج پتہ چلا کہ یہ لوگ کس چیز کے استعمال کے سبب شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچ گئے۔ دوائی بنانے والی اشتہاری کلینڈر دیکھ کر بھی انسان شش و پنج میں پڑ جاتا ہے اور جب ویل مچھلیاں سمندر کے پانی سے خوبصورت انداز اپنا کر ہوا میں اچھل جاتی ہیں تو نیا مسلہ سر اٹھاتا ہے۔ حیرانی اس وجہ سے کہ پیٹ کا درد ٹھیک کرنے کی دوائی ایک طرف چھپی ہوتی ہے۔ دیکھنے والا پریشانی کے عالم میں سوچتا ہے کہ مستی میں آ کر بڑے سائز کی مچھلیوں نے یہ چھلانگ لگائی یا پیٹ کے درد نے مجبور کیا۔ سر درد مٹانے کی دوا اور دیوی دیوتا کی تصویر کلینڈر پر دیکھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ اگر دیوی دیوتا سے دعا کر کے سر درد مٹ جائے تو بھلا درد کی گولیاں کیوں خریدیں۔ سافٹ ڈرنک کے اشتہار میں کوئی بڑا کھلاڑی یا فلم ایکٹر جیتی ہوئی ٹرافی کو بے تحاشہ چومتا ہے اور ساتھ ہی اس کے منہ میں خشکی نیز سر میں درد کی شکایت کے سبب وہ سافٹ ڈرنک کے بارے میں سوچتا دیکھا جا سکتا ہے۔ دیکھنے والا تو سوچ میں پڑتا ہے کہ بس بیس تیس روپے کی بوتل کے لئے اس نے اپنے آپ کو اتنی محنت اور تھکاوٹ سے دوچار کر دیا۔ بھلا اتنا کیا ہے اس بوتل میں کہ بڑا کھلاڑی بھی مجبور ہوا کہ سٹنٹ کر دے۔ کپڑوں کے اشتہار میں خوب صورت لڑکی پاؤں سے اس قدر نیچے ڈریس پہن کر چلتی ہے کہ فرش پر مزید صفائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یعنی سوچھ ابھیان کی پریکٹیکل ٹریننگ خود ہی انجام پاتی ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر کوئی کمپنی کسی نہ کسی طرح کلینڈر سے اپنا کام نکالتی ہے۔ مگر اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ عام لوگ اس سلسلے میں پیچھے ہیں۔ مثال

کے طور جب شادی بیاہ کے موسم میں ہر طرف سے کارڈ پہنچ جاتے ہیں تو اس بات کا حساب رکھنا بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ انفارمیشن یاد رہے کہ فلاں دن کس جگہ جانا ہے۔ کارڈ موصول ہوا تو کلینڈر کے اوپر متعلقہ دن پر اس جگہ کا نام لکھ دیں جہاں اس روز جانا ہے کیونکہ مغالطے کے سبب وہ رشتہ دار ناراض ہوگا یا ایسا بھی ہو کہ انہوں نے اتوار کو دلہن بھی لائی اور ہم منگل کے روز وارد ہوئے پھر جھینپ کر واپسی کا موقع بھی دستیاب نہیں رہتا۔ اس طرح سپلائی سرشتہ سے کب چاول آٹا لے کے آنا ہے اس کی نسبت تاریخ مقرر ہو۔ نہیں تو لگے گا کہ اس مہینے اہل خانہ پر پیٹ کا عذاب ذرا زیادہ تھا کہ بیس دنوں میں ہی مہینے کا کوٹا ختم کر دیا۔ جو لوگ گھر سے دور نوکری اور بزنس میں مشغول رہتے ہیں ان کے لئے سبزی وغیرہ کا انتخاب مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ ایسے دوستوں کو کلینڈر بہت مفید دکھتا ہے کہ درج کرتے ہیں اتوار گوشت، پیر راجماش، بدھ پالک وغیرہ روز روز کی پریشانی سے بچ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار گھروں میں یہ مسٔلہ سر اٹھاتا ہے کہ دادا جان کب اس جہان فانی سے رخصت ہوئے، منو کا کب ختنہ کیا تھا، بھائی جان کی شادی کب کی تھی، ایسے معاملات پر جلتی ہوئی انفارمیشن پر کلینڈر ایک دم سے پانی پھینک دیتا ہے۔ عام طور پر گھر سنبھالنے والی خواتین کلینڈر پر دودھ کا پکا حساب رکھتی ہیں۔ سوموار دو کلو، بدھ دو کلو وغیرہ لکھ کر گوالے کی انفارمیشن کو ٹکر دی جا سکتی ہے۔ المختصر کلینڈر کا استعمال صاحب کلینڈر کو کامیابی کی ان گنت سیڑھیاں چڑھا جاتا ہے، ناکامیوں سے نجات دلاتا ہے۔ پھر تو چیخ بھی لیتا ہے بابا کلینڈر زندہ باد!!

●●●

☆......شفیع احمد

مارننگ واک

وہ بھی کیا دن تھے کہ ہمیں اس موضوع پر مضمون لکھنے کے لئے کہا جاتا جس کا تجربہ ہمیں تھا ہی نہیں، اور کیا دن ہیں کہ ہمیں اس بات کا باقاعدہ تجربہ ہے لیکن کوئی مضمون تحریر کرنے کے لئے نہیں کہتا۔ جی ہاں ان ایام کی بات ہے جب ہم اسکول میں زیر تعلیم تھے اور مارننگ واک پر جامع مضمون لکھنے کی ہدایت ملتی۔ ظاہر ہے کہ ذاتی تجربہ نہ ہونے کے سبب ہم لکھنے سے ہچکچاتے، ہمارے ہاتھ کانپتے اور دماغ میں کھلبلی مچ جاتی جیسے کرکٹ کے میدان میں تیز رفتار باؤلنگ کا سامنا کرنا ہو اور باؤنسر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتے یا ایک آدھ سر پر لگ جاتے۔ وجہ یہ کہ ہم لائق امتحان تھے ہی نہیں نہ ہی تیز باؤلنگ کا سامنا کرنے کے ماہر، مگر استاد محترم زبردستی ہماری ٹانگیں چپکائے رکھتے کہ بیٹا چڑھ جا سولی رام بھلی کرے گا۔ بس مرتا کیا نہ کرتا۔

استادِ محترم نے چابک بہت چلائے
اسپِ سخن کو لیکن آئی نہ تیز گامی

استاد محترم جو چابک چلانے میں مشہور تھے، ان کے سبب ہم میں بلکہ ہمارے اندر اسپ سخن میں لنگڑا کر ہی سہی تیز گامی آنا ضروری بن گیا۔ اگرچہ استاد محترم چابک چلانے میں بدنام تھے لیکن مشہور کا لفظ اس وجہ سے استعمال کیا گیا کیونکہ ان دنوں استاد کے خلاف یا ان کی شان میں گستاخی کرنے کا رواج نہیں تھا۔ وقت بدلنے کے ساتھ استاد کے تئیں گستاخی کوئی بڑی بات نہیں رہی بلکہ اب تو انہیں عدلیہ تک بھی

گھسیٹا جاتا ہے اور معمولی مار پیٹ کے نتیجے میں ان کے خلاف دھرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ بات بگڑ جائے تو تحریری معافی نامہ بھی انہیں اجرا کرنا پڑتا ہے۔

خیر بات مارننگ واک کی ہو رہی تھی، اس کا آج کل ہمیں ذاتی تجربہ ہو جاتا ہے۔ صبح کی سیر ہم مضمون لکھنے کے لئے نہیں کرتے نہ ہی ہمیں اس بات کا شوق ہے کہ پو پھٹتے ہی ماحول کا جائزہ لیا جائے۔ چرند و پرند کی خوش کن آوازیں سنیں یا صبح کی ڈھلتی خنک ہوا کا مزہ لیں بلکہ اس سلسلے میں ہم پانچ سو روپے فیس ادا کر چکے ہیں جس کے بدلے میں ہمارے معالج نے دوائیوں کی لمبی فہرست کے ساتھ ساتھ صبح کم از کم ایک گھنٹے کی سیر کا حکم صادر فرمایا ہے۔ ویسے تو ڈاکٹر حکم صادر نہیں فرماتے لیکن ہمارے کیس میں انہوں نے باضابطہ پندرہ دن کی مہلت دے رکھی ہے۔ گویا یہ ایک چیتاونی تھی کہ پندرہ دن میں سدھر جاؤ نہیں تو ہمارے پاس سدھارنے کے کئی طریقے موجود ہیں۔ اس سدھار والی دھمکی کے دوران ہمیں فلم ''شعلے'' والے سورما بھوپالی کا وہ ڈیلاگ یاد آیا کہ جب ہم نہیں سدھرے، یہ کیا سدھریں گے۔ سدھار لانے میں ناکامی کے سبب ہماری فہرست میں چند اور دوائیوں کا اضافہ کرنے کی دھمکی شامل تھی اور مزید جسمانی تجزیئے (ٹیسٹ) کروا کر اضافی رقم خرچ کرنے کا میزائل ہماری طرف داغنے کے لئے تیار دکھائی دیئے۔ یعنی ہماری گردن پر مزید دوائیوں کی تیز دھار والی تلوار رکھ کر ہمیں اس بات کے لئے مجبور کیا گیا کہ ہم صبح کی سیر کا مزہ لیں۔

پو پھٹتے ہی گھر سے نکل کر سیر کا مزہ لینا اب ہمارا معمول بن گیا ہے اور اگر مضمون لکھنے کی باری آئی تو سچ لکھیں گے اور سچ کے سوا کچھ نہیں لکھیں گے۔ صبح سویرے سیر کے دوران ہمیں کئی ایک شناسا یا غیر شناسا لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان میں مزہ لینے یا مضمون لکھنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہوتی ہے البتہ معالج کی دھمکی سے گھبرا کر نکلنے والوں کی تعداد کثیر ہوتی ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی بیماری

کا تذکرہ کرتا ہے۔ بات بڑھی تو ان بیماریوں کی وجہ بھی بتائی جاتی ہے۔ایک دو دن میں سرکار پر الزام بھی آتا ہے کہ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی روک تھام کی طرف آنکھ بند کرنے کے سبب بیماریاں پھیلتی جارہی ہیں اور خود متعلقہ وزیر با تدبیر پر نشانہ سادھا جاتا ہے کہ روپے پیسے کے لالچ میں وہ اَن سنی اور اَن دیکھی کا مرتکب ہوا جاتا ہے۔یعنی صبح کی سیر کا اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت وقت کی کارکردگی کسوٹی پر چڑھتی ہے۔اس دوران زبان خنجر کا استعمال بے دریغ کیا جاتا ہے۔ چچا غالبؔ سے معذرت کے ساتھ:

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

سیر کے دوران جسمانی ورزش کے دور سے بھی گزرہوتا ہے اور مختلف طریقوں سے کثرت کی جاتی ہے۔اٹھک بیٹھک کے دوران گمان یہ گزرتا ہے کہ عمر رفتہ کے دوران استاد محترم نے چابک لگانے کے بعد جو حکم صادر کیا تھا کہ پچاس بار اوپر نیچے کے دور سے گزرو، اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا کہ اب اس کی بھرپائی کی جارہی ہے۔مطلب اپنے گناہوں کا کفارہ اسی زندگی میں ادا کرنا ہے۔ بھلے اس کے لئے وقت کا تعین ضروری نہیں۔یعنی جو خطا بچپن میں کی تھی خمیازہ پچپن میں اٹھانا پڑ رہا ہے۔ بازو ہوا میں لہرا کر انگلیاں کھولنا بند کرنا ایک اور ورزش ہے جس کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ صاحب چڑیاں پکڑنے کی کوشش میں ہیں۔ بدن کو گھماتے ہلاتے ہڈیاں چٹخنے کی آوازوں سے سنگیت کی مدھر لے برآمد ہوتی ہے۔

صبح کی سیر کا لطف اب ہر عمر کی خواتین بھی اٹھاتی ہیں۔ظاہر ہے ہر عمر کے مرد حضرات بھی آس پاس گھومتے نظر آتے ہیں۔کچھ ڈاکٹر کی دھمکی، چند ایک کسرت کرتے اور کچھ تو روڈ رومیو کا ٹیگ بدن پر سجائے محو سفر ہیں۔ظاہر ہے روڈ رومیوز کے

ساتھ جو صفات چپکی ہیں ان کا بھی خوب مظاہرہ ہوتا ہے۔ سڑکوں، پارکوں، دکان کے تھڑوں اور پتھر کی دیواروں کے اوپر تھکی ہاری خواتین کے گروپ دکھائی دیتے ہیں جو محو گفتگو رہتے ہیں۔ تھکان کے سبب ان کے لئے چلنا پھرنا دوبھر ہو جاتا ہے اور ستانے کے لئے جو بیٹھیں تو گپ شپ کا سلسلہ نکل ہی جاتا ہے۔

روڑ رومیو کی آنکھ پھڑکتی ہے
انڈی کیٹر ہو جیسے گاڑی کا
جوتے چپل تو پڑتے رہتے ہیں
عشق ہو گر کسی اناڑی کا
سیر میں جسم نازک یوں بکھرا
جیسے ساماں کسی کباڑی کا

جب سے پانی کے پائپ مکانوں کے اندر تک چلے گئے، محلے کے نلکے کے پاس اب گفتگو کا رواج آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا جس کی بھرپائی صبح کی سیر نے کر ڈالی۔ اسی لئے بجلی کی کمی، ساس بہو کا جھگڑا، سبزیوں کی اضافی قیمتوں، بازاروں کا حال، فلاں ٹی وی سیریل جیسے کپڑوں سے متعلق سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صبح کی سیر کے دوران ہی تازہ خبریں بھی قوت سامعہ سے ٹکرا جاتی ہیں جو اخبارات میں ملنا عنقا ہے۔ البتہ ان خبروں سے متعلق حقیقت سے بعید یا نزدیک ہونے کی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی کیونکہ انہوں نے جو سنا، بیچ والے نفع نقصان سے قطع نظر، جو خریدا وہی بیچا۔ ان خبروں میں سیاسی معاشقہ، انتظامی ردوبدل، معاشی ہیر پھیر اور خود سماجی دھڑے بندی جیسے موضوعات چھائے رہتے ہیں۔ اس لئے ان حالات میں دروغ بر گردن راوی کا اطلاق بدرجہ اتم موجود رہتا ہے۔

صبح کی سیر کے دوران ان کتوں سے بھی ملاقات ہوتی ہے جو اَب پرانے

جیسے نہیں رہے۔ ماضی میں یہ کتے بمشکل مکینوں کی طرف سے پھینکے جانے والے باسی روٹیوں پر اکتفا کرتے تھے اور جسیم یا طاقتور نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اب انہیں چاول اور ہڈیوں کے علاوہ گوشت کی بوٹیاں بھی نصیب ہوتی ہیں۔ یعنی خوب خوب پروٹین، چربی اور طاقتی اجزا میسر رہتے ہیں۔ اس کے سبب یہ کتے انہی لوگوں کو صبح آنکھ دکھانے سے نہیں چوکتے جو یہ چیزیں فراہم کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں اور پھر یہ بھی شکایت کرتے ہیں کہ سرکار کتوں کی افزائش نسل کو قابو کرنے میں ناکام رہ گئی۔ میونسپلٹی کے ہر ڈسٹ بِن کے اردگرد کوئی ایک درجن کتے نظر آتے ہیں جو آپ کو ڈرانے کے لئے حرکت میں آتے ہیں۔ آپ کو سہما سہما وہاں سے گزرنا ہے، نہیں تو خیر نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر آپ ڈنڈا ساتھ رکھیں اور انہیں اس سے ڈرانے کی کوشش کریں تو اور بھڑک جاتے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہم تو آرام سے بیٹھے تھے ڈرا کر ہمیں للکارنے کی کیا ضرورت تھی؟

صبح کی سیر کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ محلے کے نانوائی کی دکان سے تازہ اور گرم گرم روٹیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ چونکہ زیادہ تر بزرگ افراد کو صبح کی سیر کی ڈاکٹر کی طرف سے دھمکی ملی ہوتی ہے اس لئے بزرگ افراد ہی گرم گرم روٹیاں خریدنے کے لئے لائن میں کھڑے ہو جاتے ہیں جب کہ جواں سال بہو بیٹے بستر میں آرام سے لیٹے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار تو سبزی خریدنے کی دِقت سے بھی بہوئیں بچ جاتی ہیں اور تازہ سبزی سیر کے دوران ہی میسر آ جاتی ہے۔ لگے ہاتھوں دودھ کی سپلائی بھی انجام پاتی ہے۔ اس لحاظ سے جن بزرگوں کو آپ صبح کی سیر کرتے دیکھتے ہیں کہیں نہ کہیں کپڑوں کے اندر ایک چھوٹا سا تھیلا اور لوٹا بھی چھپا یا رہتا ہے۔

صبح کی سیر کا بڑا فائدہ ان لوگوں کو مل سکتا ہے جو محکمہ بجلی سے وابستہ ہیں۔ انہیں بھی اس کا بھی براہ راست فائدہ ملنے کی امید ہے۔ محکمہ بجلی کے کارکن ان گھروں

کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو رات میں بجلی تاروں کے ہُک استعمال کرتے ہیں اور یوں بجلی میٹر کی رفتار کو قابو میں کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔تاہم جو خود سیر کرنے کے عادی ہوں وہ رات میں لگا ہُک صبح سویرے ہٹانے کا فریضہ اس سے پہلے انجام دے سکتے ہیں کہ بجلی والے کارندے شامل حال رہیں۔

صبح کی سیر سے متعلق یہ مضمون جو اس سال طلبا اور ڈاکٹروں کی دھمکیوں سے گھبرانے والے، دونوں کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے، اس لئے تحریر کیا ہے تا کہ سند رہے۔

●●●

☆۔۔۔۔شفیع احمد

میڈ

''میڈ''انگریزی زبان کا لفظ ہے لیکن اس کے کوئی ایک معنی نہیں کہ اسی کے اندر بند کر دیا جائے بلکہ اس کے اتنے معنی ہیں کہ خود معنی ڈھونڈنے اور ان کی تشریح کرنے والا بھی جکڑا جائے۔ظاہر ہے کہ بنی آدم ہی ایسا ہے جسے معنی تلاش کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔معنی بھی اس قدر کہ جینے کے لئے جو چار دن مانگ کر لائے تھے وہ معنی تلاش کرنے میں گزر جاتے ہیں اور پھر یہ مضحکہ خیز بات کہ دو آرزو میں کٹ گئے،دو انتظار میں۔پھر وہاں سے یہ معاملہ نکل آتا ہے کہ آخر انتظار کس چیز کا تھا۔بڑے ادیب کو Waiting For Godot سے کام نکالنا پڑتا ہے لیکن سیاست سے ہٹ کر عام آدمی بیچارہ ادھیڑ بن میں ہی دن گزارتا ہے کہ جو گزرے وہی واہ واہ۔اپنے سیاست کاروں کو کرسی کا انتظار ہوتا ہے،بے روزگاروں کو ذریعۂ معاش اور کنواروں کو تلاش بود و باش۔

میڈ کا ایک مطلب تیار شدہ ہے اور اس کے اتنے زاویئے ہیں کہ پریشان ہونا لازمی ہے۔چونکہ میڈ اِن،میڈ فرام،میڈ آف،میڈ وِد،میڈ ایز وغیرہ اتنی زیادہ ساتھ میں چلنی والی واکنگ اسٹک ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مدد کے لئے ہیں یا مار پیٹ کے لئے۔میڈ اِن کے لئے اس جگہ یا شہر کی تلاش شروع ہوتی ہے جہاں کوئی چیز تیار ہوئی ہے۔ایک زمانے میں میڈ اِن جاپان کی اصطلاح اس قدر قیمتی مانی جاتی تھی کہ چیز کا مالک اپنے گلے میں گارنٹی کارڈ ڈال کر چلتا کہ بھائی لوگو ہوشیار خبردار،

میرے پاس جاپانی ساخت کی چیزیں موجود ہیں اور چونکہ میڈ اِن جاپان بذات خود ایک سندِ تسلیم ہوتی کہ چیز بڑھیا ہے اس لیے دیکھنے اور سننے والے بھی فوراً تسلیم کرتے کہ صاحب نے پکا کام کیا ہے۔ میڈ ان جاپان زیادہ تر الیکٹرانک اشیا کے لئے مشہور تھا۔ دیکھتے دیکھتے میڈ اِن جاپان کو جعل سازوں نے میڈ ایز جاپان بنا دیا اور ایسی بے بھروسہ چیزیں میدان میں اتار دیں کہ جاپانی اشیا کے نام پر معصوم لوگوں کو بیچ کر اچھا نفع کمایا۔ میڈ ایز جاپان یعنی جاپان جیسا بنا ہوا، چیزوں کی کھپت بھی کچھ دیر چلی۔ لیکن اہم بات یہ بھی ہے کہ نقلی کو اصلی بنانے والے نے اپنی انگریزی زبان پر دسترس کو بھی اجاگر کیا۔

میڈ کی ایک اور شکل انسان کی صورت میں ہے جو کسی خاتون کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے گھروں میں کام کرنے کے لئے تنخواہ پر رکھا جائے۔ ان سے گھروں میں صفائی، جھاڑو پونچھا مارنے، ناشتے وغیرہ کی تیاری کا کام لیا جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ خواتین گھروں کا سارا کام کیا کرتی تھیں اور مانو صبح سے لے کر شام تک گھر کی پوری ذمہ داری اپنے سر اٹھاتیں۔ تاہم وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی اپنا وطیرہ بدلا۔ مثال کے طور پر اب صفائی کے لئے ایک، جھاڑو پونچھا کے لئے دوسری، برتن دھونے کے لئے تیسری اور پھر ناشتے کی تیاری کے لئے ایک اور کا انتظام کرنا ضروری بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر کام کے لئے یا تو الگ میڈ یا ہر کام کے لئے الگ تنخواہ کا اہتمام ضروری ہے۔ مانو کام کی تقسیم یا معاوضے کی تقسیم ضروری ہے۔ جب میڈ کو کام پر لگانے کا پروگرام پہلے دن بنتا ہے، اسی وقت شرطیں طے ہوتی ہیں کہ کام کس انداز میں مکمل کیا جائے۔ اس ایگریمنٹ کے وقت ماحول دلچسپ بن جاتا ہے کہ ممکنہ میڈ اپنی شرطیں میدان میں اتار دیتی ہیں کہ مانو شرط نہیں بلکہ جوہری میزائل ہوں یا ہدف سیریز کے ہتھیار ہوں کہ اپنے سامنے والے کو مرعوب اس حد تک کیا

جائے کہ وہ میڈ کی ہاں میں ہاں ملائے۔مثال کے طور پر یہ کہ دن بھر کام پر رہنے کے سبب کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کا قیلولہ ضروری ہے جس دوران کوئی انہیں ڈسٹرب نہ کرے۔جھاڑو چلاتے وقت ایک مخصوص لیول تک ہی وہ جھک جائے گی کیونکہ ہڈیوں کے ماہر ڈاکٹر نے اسے زیادہ جھکنے سے منع کیا ہے۔لطف کی بات یہ کہ یہ جھکاؤ ڈاکٹر کا دیا کم لیکن EGO کا عطا کردہ زیادہ ہوتا ہے۔ظاہر ہے ایسی حالت میں وہ چارپائیوں کے نیچے سے دھول وغیرہ ہٹانے کی متحمل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے برقی جھاڑو یعنی ویکیوم کلینر خریدنے کی ضرورت ہے۔اس کے ساتھ اونچی چھت تک اس کا پہنچنا مشکل ہے اس لیے ایک نئی سی سیڑھی گھر لانے کی ضرورت ہے جسے جالے وغیرہ اتارنے کے کام لایا جا سکتا ہے۔اس قسم کی سیڑھی کے سبب وہ ممکنہ خطرے سے محفوظ رہے گی کیونکہ بصورت دیگر اس کے دھڑام سے گر جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔نئی بالٹی، نیا پونچھا، نئے دستانے اور فرش دھونے کے لئے نیا پاؤڈر یا سیال صابن گھر پہنچے تو وہ کام شروع کرے کیونکہ پرانی انفکشن زدہ چیزوں کے ساتھ وہ کام شروع نہیں کر سکتی۔ایک اہم بات یہاں کہ یہ چیزیں خرید کر گھر کا کوئی فرد ڈھکے چھپے انداز میں طعنہ نہیں دے سکتا کہ نئی چیزوں پر خرچ کر کے مہینے بھر کا بجٹ میری وجہ سے الٹ پھیر ہو گیا۔

پھر ہفتے بھر کام کرنے کے بعد تو کم از کم ایک دن ستانے کا موقع ضرور ملنا چاہیے اور اس کے لئے عالمی سطح پر اتوار کا دن زیادہ مقبول ہے۔یہ منواتے منواتے وہ گھر کے افراد پر یہ کہہ کر احسان ضرور جتاتی ہے کہ میں اتوار کا انتخاب اس لیے کرتی ہوں کہ اس دن گھر کے سب افراد دیر تک سونے کے عادی ہوتے ہیں اس لئے ان کے آرام میں خلل نہ پڑ جائے۔

میڈ کا تلفظ ادا کرتے ہوئے کئی لوگ اسے انگریزی لفظ Mad کہتے

ہیں۔ گوکہ تلفظ ایک طرف مگر کئی ایک بار یہ تلفظ زیادہ جچتا ہے کہ میڈ خود ہو نہ ہو اپنے مطالبات منواتے منواتے صاحب خانہ اور منسلک افراد کو پورا نہ سہی لیکن نیم پاگل تو بنا ہی دیتی ہے اور اگر اوقات کار اور دوسری باتیں زیر بحث لاتے وقت میڈ ہونے سے معجزاتی طور بچ بھی پائیں لیکن بہت جلد اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بھلا کیوں کہ یہ بچے کے سُوسُو پر اس قدر حقوق ملازمان پر ڈسکس شروع کرتی ہے کہ ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں اور فیصلہ نہیں کر پاتے کہ بچے کی پیدایش کے وقت ان سے بڑا جرم سرزد ہوا یا میڈ کو نوکری پر رکھتے وقت۔ بزرگ والدین کی طرف سے کسی کام کو ٹھیک طرح انجام دینے پر اصرار کرتے یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کہیں میڈ کا تقاضا یہ تو نہیں کہ بزرگان کو فوراً الوداعی پارٹی دی جائے۔ تب تو حالت بہت زیادہ گھمبیر بلکہ تشدد آمیز ہو جاتی ہے جب بزرگ والدین میڈ کے کانوں میں گانے سننے اور باقی باتیں اَن سنی کرنے کا عمل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی پابندیوں پر میڈ کچھ زیادہ ہی بھڑک جاتی ہے کیونکہ بقول میڈ عمل بامشقت (قید بامشقت) کا مشکل کام میوزک کی تا تھیا سے ہی انجام پا سکتا ہے۔

اگرچہ میڈ کو کام پر رکھتے وقت آپ خلیل خان اور ان کی فاختاؤں سے کوئی مدد نہیں لیتے لیکن وہ دن بھی کب کے گزر گئے جب اعلیٰ حضرت خلیل خان فاختاؤں کے ساتھ دن بتاتے اور انہیں اڑایا کرتے تھے۔ یقین نہ ہو تو الیکٹرانک فاختاؤں پر غور کریں جنہیں عرف عام میں موبائل فون کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ موبائل کی ایجاد کے بعد کسی ایک میڈ کو آپ سارے کاموں کے لئے مجبور نہیں کر سکتے اور ہر کام کے لئے الگ الگ میڈ کا انتظام ضروری بن گیا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ کام کرتے کرتے میڈ زیادہ وقت فون پر گزارتی ہیں اور ایک گھر سے دوسرے گھر جاتے ہوئے انہیں ملاقات اور بات چیت کا موقع میسر رہتا ہے۔ ان حالات

میں میڈ موبائل کا بھر پور استعمال کرتی ہے۔ایک تو یہ کہ کسی گھرانے میں میڈ پر کام چوری کا الزام لگا تو موبائل کے ذریعے دھرنے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ تفصیل بھی موبائل کے ذریعے پوری یونین کو پہنچانا اشد ضروری ہے کہ کس میڈ کی مالکن انسانی حقوق کا پاس نہیں کرتی اور ملازمہ کو کھانے پینے کی کمی، کام کاج کی زیادتی اور لعن طعن کا شکار بناتی ہے۔ظاہر ہے کہ ان حالات میں مطلوبہ کارروائی کے لئے اقدامات اٹھانے کے لئے کمر کسی جائے۔

مسائل تو ہر گھر میں ہوتے ہیں لیکن اگر ان میں ایک فریق میڈ ہو تو مسائل زیادہ گھمبیر بن جاتے ہیں بلکہ مسائل کے دو رخ ہونے سے مزید سر درد بن جاتا ہے۔میڈ کو کام کرتے ہوئے کتنے گھنٹے رکھ رکھاؤ اور سج دھج کے لئے کتنی آزادی اور وقت میسر رہتا ہے یہ بڑا رونے رلانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔اگر اس میں چند منٹوں کی کمی پائی گئی تو میڈ ہڑتال پر اتر آتی ہے اور ہڑتال بھی ایسی کہ چکہ جام سے بھی بڑھ کر ہو جاتی ہے۔یوں گھر میں کسی بھی قسم کی اشیائے خوردنی کی قلت بڑھ جاتی ہے۔ مطلب بیٹھے بیٹھے قحط سالی کا ماحول بن جاتا ہے۔

تازہ ترین کرونا وائرس نے میڈ رکھنے کے نئے تجربات سے ہمکنار کیا اور جو مختلف تجربات سے گزر ہوا وہ بجائے خود دلچسپ بھی ہے اور طنز و مزاح سے بھر پور بھی۔کسی گھر کی میڈ نے کرونا کے بارے میں تفصیلات جمع ہوتے ہی فوراً فون ملا کر کچھ اس طرح بات کی۔دیکھئے میڈم میں آپ کے ساتھ کافی وقت سے گھر سنبھالے ہوں لیکن جان کی فکر تو ہر کسی کو ہوتی ہے،اس لئے پہلی فرصت میں پورے خاندان کا کووڈ ٹیسٹ کر لیں ۔یہاں ڈیجیٹل سرگرمیوں پر زور ہے اس لئے میں بھی کام انٹرنیٹ کی وساطت سے کروں گی۔اس سوال کے جواب میں کہ تم کیسے ڈیجیٹل کام کرو گی جواب کچھ اس طرح آیا کہ میں نیٹ سے دکھاؤں گی کہ کہاں کہاں جھاڑو چلانا

ہے اور آپ میں سے کوئی ویکیوم کلینز چلاتا رہے گا اور ہاں ایک ضروری بات، تنخواہ آپ میرے اکاونٹ میں ضرور ڈال دینا۔

میڈ کی خدمات اگر آپ لینے کے متمنی ہیں تو سب سے اہم دستاویز از بر ہونا ضروری ہے۔ جس میں میڈ کی ابتدائی تنخواہ اور ایجنٹ کی فیس وغیرہ پر کسی بھی صورت کوئی اعتراض نہ اٹھائیں۔ میڈ کے لئے مخصوص ایک عدد اسکوٹی کا اہتمام کر لیں تبھی تو میڈ بازار میں کچن کے لئے ضروری خریداری کر پائے گی۔ ناشتے میں آپ خود کیا کھائیں لیکن میڈ کے لئے Balanced diet کے بارے میں کوئی آنا کانی کرنے کی گنجایش نہیں۔ میڈ کے لئے نئے فیشن کے کپڑے خریدنے سے یہ پتہ چلے گا کہ آپ کس قدر ان دوسرے لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں جن کے بغیر زندگی اجیرن بن جاتی ہے کیونکہ ذائقہ دار سالن اور میٹھے پکوان پانی، ہوا اور غذا کی مانند اشد ضرورت ہوتی ہے۔

الختصر اگر میڈ کی خدمات لینے کا کیڑا آپ کے دماغ میں سرسر کر رہا ہے تو اپنے مزاج میں فوراً متوازن وطیرہ اپنانے کی کوشش جاری رکھیں، نہیں تو وقت مقررہ پر لین دین سے متعلق نکات پر غور وخوض دھرا رہ جائے گا اور یوں ہوسکتا ہے کہ جھاڑو پونچھا کا کام آپ کے سر منڈ دیا جائے جو آپ کے لئے سر پر لٹکتی ہوئی دوہری تلوار ثابت ہو!!

●●●

☆......ڈاکٹر الطاف شاہین

چائے

انسانی سماج کی ترقی پر نظر دوڑائی جائے تو ایسی ان گنت دریافتیں نظر آئیں گی جو اس کی تہذیب اور زندگی کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ رفتہ رفتہ انسان ترقی کرتا گیا مگر چونکہ کچھ چیزیں انسانی سماج اور کلچر میں اس طرح پیوست ہو گئیں کہ ان سے ہاتھ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ چائے آج سے صدیوں پہلے چین میں دریافت ہوئی مگر آج تک دنیا کے سبھی ممالک میں مختلف ناموں سے اس کا استعمال ہو رہا ہے۔ خصوصاً برصغیر کے لوگ اس مشروب کے اتنے دلدادہ ہیں کہ اس کے بغیر گزر ا ممکن نہیں۔ گھر میں مہمان آ جائے تو مختلف انواع واقسام کی لذیذ ضیافتیں تیار کی جاتی ہیں - اگر چائے کا انتظام نہ کیا جائے تو مہمان نوازی کا حق ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ چائے مختلف رنگوں اور لذتوں کی بنائی جاتی ہے مثلاً میٹھی چائے، دودھ والی چائے، بغیر دودھ والی چائے وغیرہ مگر چائے میانہ روی سے ہر رنگ ونسل کے انسانوں کی بلا تفریق رنگ و مذہب ذہنی تشفی کا کام انجام دیتی آ رہی ہے۔ ہمارے یہاں میٹھی چائے کے ساتھ ساتھ نمکین چائے بھی بڑے شوق سے نوش فرمائی جاتی ہے۔ بہر حال چائے انسان کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی ہے۔ کوئی کام میں مصروف ہو تو چائے، بیکار ہو تو چائے، نیند آ رہی ہو تو چائے، نیند نہ آئے تو چائے، کام پر جانا ہو تو چائے، کام سے آ رہے ہوں تو چائے، موڈ mood خراب ہو تو چائے، موڈ ٹھیک کرنا ہو تو چائے، کام نکالنا ہو تو چائے، کام کروانا ہی تو چائے۔ الغرض ہر رنگ میں چائے پہلے یا بعد میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی

ہی رہتی ہے۔سرکاری دفاتر اور نجی اداروں اور اسپتالوں میں بھی چائے پیش پیش رہتی ہے۔مگر یہاں کے ملازم، افسران اور عہدہ داران میٹھی اور نمکین چائے کے علاوہ ایک انوکھی قسم کی چائے خاص طور پر نوش فرماتے ہیں جس کو پینے والا اور پلانے والا دونوں خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

"تم نے ہماری چائے کی دعوت کو رد کیا تم کو ہماری چائے کا مطلب نہیں پتا"

فائل ایک ٹیبل سے دوسرے ٹیبل تک پہنچانی ہو، بچے کا ایڈمشن کروانا ہو یا پھر مریض کے لئے بیڈ کا انتظام کروانا ہو، کسی سرکاری یا نجی نوکری کے لئے انٹرویو دینا ہو، الغرض ان دفاتر اور اداروں کی مشینوں کا انجن اسی انوکھی چائے سے چلتا ہے۔ یہ چائے کسی خاص وقت کی محتاج نہیں ہوتی، دن ہو یا رات دفتر ہو یا سڑک کا چوراہا، غرض اس کو لینے کا کوئی سیاق وسباق متعین نہیں ہے۔افسران سے لے کر چپراسی زیادہ تر ٹیبل کے نیچے، کوٹ میں ہاتھ ڈال کر یا فائل میں چھپا کر لینا پسند کرتے ہیں۔آج کل آن لائن لینے کا رواج بھی سرگرمی سے جاری ہے۔چائے ہماری تہذیب میں پہلے ہی سرایت کر چکی تھی مگر اب اخلاقی بنیادوں پر بھی ہمارے سماجی ڈھانچے میں اسٹیل کا رول ادا کر رہی ہے۔

غیر یقینی طور پر چائے پلانے والا اپنی کٹتی ہوئی جیب کو دیکھ کر تذبذب کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اپنے کندھوں سے ایک عجیب سا سماجی اخلاقی بوجھ اتارتا ہوا محسوس کرتا ہے اور چائے لینے والا بھی فخر کی سی کیفیت میں من ہی من میں اپنی پیٹھ تھپتھپاتا ہے۔ اپنی بھری ہوئی جیب کو گرم پا کر ٹھنڈی مشروب منگواتا ہے اور اس کے بعد گرم چائے کی چسکیاں لئے کر کھلی آنکھوں سے جنت کے دیدار کرتا ہے۔

چائے کو آپ بالکل ہلکا نہیں آنک سکتے۔چائے کے لامحدود طلسماتی کرشمے ہیں۔آپ چائے پلا کر پژمردہ آدمی کو بھی حیاتِ جاودانی عطا کروا سکتے ہیں اور راشن

کارڈ پر اس کا اندراج کروا کر ماہانہ بنیاد پر راشن بھی لے سکتے ہیں یا پھر لاوارث پڑی زمین کو چائے دے کر اپنی پشتنی وراثت ثابت کروا سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

چائے کے بہت سارے طبی فوائد ہیں۔ یہ جسمانی تھکان کو دور کرتی ہے اور دماغ کی آرام پہنچاتی ہے، اچھی چائے بنانا بھی ایک ہنر ہے۔اس میں ہر ایک چیز کا واجب مقدار میں ہونا ضروری ہے۔عجب ہے یہ لفظ چائے۔اس میں چاہ بھی ہی اور وائے بھی۔اگر چائے میں غلطی سے بھی کوئی چیز کم یا زیادہ مقدار میں پڑ جائے تو چاے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ چائے کے عاشق اچھی چائے بنانے والے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔بقول شاعر:-

لمس کی آنچ پر جذبوں نے اُبالی چائے
عشق پیتا ہے کڑک چاہتوں والی چائے

جہاں چائے کے بہت سارے فوائد ہیں وہیں کچھ طبی نقصانات بھی ہیں۔ زیادہ چائے ہاضمہ کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔زیادہ کڑک چائے پینے سے پیٹ میں گیس جیسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اور چہرے کا رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا ہے۔ بہرحال چائے ہماری تہذیب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ چائے کے عجائبات گنواتے گنواتے سائل کا من بھی آدھی کپ چائے پینے کے لیے ہچکولے کھا رہا ہے۔تو چلیئے کیوں نہ آدھا کپ چائے نوش فرمائی جائے۔

●●●

☆......ڈاکٹر الطاف شاہین

آن لائن سبک دوشی

موجودہ دور میں جہاں انٹرنیٹ نے انسانی زندگی کے دیگر شعبوں میں سہولیات پیدا کی وہیں تعلیم کے شعبے میں بھی انقلاب برپا کر دیا۔ جہاں تعلیم کی ترسیل آن لائن ہوگئی ہے وہیں تعلیم سے فراغت حاصل کر کے تعلیمی اسناد بھی اب آن لائن فراہم کی جاتی ہیں۔اس کے بعد نوکری بھی اب آن لائن ہی ملتی ہے لیکن سرکاری نوکری سے سبک دوشی جو کہ ایک قدرتی عمل جیسا ہے،اب بھی offline ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔جیسا کہ ہم سبھی بہ خوبی واقف ہیں کہ سبک دوشی سرکاری ملازموں کے لئے ایک مشکل ترین وقت ہوتا ہے اور زندگی میں ہر ملازم کو اس وقت کا سامنا صرف ایک ہی بار کرنا پڑتا ہے۔ریٹائرمنٹ کے وقت سبک دوشی کا" گارڈ آف آنر" دیا جاتا ہے اور اس شخصیت پر محکمہ کے آلۂ کار دلفریب قصائد پڑتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف سبک دوشی کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کل تک جو افسر روزانہ کی بنیاد پر واسوخت سناتے تھے آج یکسر قصائد کیسے کہنے لگے۔خیر سبک دوشی کے اس سانحہ سے نکل کر چند لمحوں کے لئے دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے کہ جن اوصاف کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ آج تک اس کی اپنی نظر سے کیسے چھپے رہے اور خیالوں ہی میں اپنی پیٹھ تھپتھپاتا ہے۔مذکورہ دن میں سبک دوشی اپنے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ چند الفاظ میں کرتا ہے اور سامعین نہ چاہتے ہوئے بھی اداکاری کے ساتھ مسکراتے ہوئے تالیاں بجا کر اس کو معاف کر دیتے

ہیں۔ بہرحال، سبک دوشی کو محکمے کی طرف سے تحائف، الہامی صحائف، شال، تسبیح وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ یہ اشیا سبک دوشی کے بعد اپنے محلے میں پارسائی ثابت کرنے کی اسناد ہوتی ہیں اور محلّہ کی مسجد کمیٹی میں اعلیٰ عہدہ ملنے کی دلیل بھی۔

غور طلب بات ہے کہ ہمارے سماج میں ایک ایسا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ہے جسے کنٹریکچول لیکچرار کی حیثیت سے منتخب کیا جاتا ہے اور عارضی بنیادوں پر یہ کالج کا حصہ تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ہر سال فروری میں ان کی تقرری عمل میں لائی جاتی ہے اور دسمبر میں یہ اپنے برقی ریٹائرمنٹ کے لئے تیار رہتے ہیں کیوں کہ کسی بھی وقت ان کی سبک دوشی کا پیغام اپلوڈ ہوسکتا ہے۔ مگر ان کی ریٹائرمنٹ پر نہ کوئی قصیدہ پڑھا جاتا ہے، نہ ہی ان کو تحائف دیئے جاتے ہیں اور نہ ہی محلّہ میں پارسائی ثابت کرنے کی کوئی سند دی جاتی ہے۔

بر مزارِ ما غریباں، نے چراغے، نے گُلے
نے پرِ پروانہ یابی، نے سراید بلبلے

●●●

☆......ڈاکٹر الطاف شاہین

لولی پاپ

انسانی سماج میں میلوں ٹھیلوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف مذاہب کے پیروکار رہتے ہیں اور ہر مذہب اور سماج میں کئی تہوار منائے جاتے ہیں۔ تقریباً سال کے بارہ مہینوں میں کسی نہ کسی مناسبت سے تہوار منائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہاں پر مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں اس لئے ان تہواروں میں سبھی لوگ شامل ہو جاتے ہیں اور خوشیوں کی پھلجڑیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ ان تہواروں میں قسم قسم کی ضیافتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور کئی طرح کی مٹھایاں بھی تقسیم ہوتی ہیں جن سے انسانی رشتوں کی مٹھاس اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ مٹھائیوں میں برفی، کلاند، لڈو وغیرہ خاص طور پر شامل ہوتے ہیں۔ ہر دور میں مٹھائیوں کی ساخت، بناوٹ اور لذت میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور کئی انواع کی خشک و تر مٹھائیاں وجود میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور قسم "لولی پوپ" ہے۔ لولی پاپ کو پکڑنے کے لئے نیچے ایک ڈنڈی ہوتی ہے جس کو پکڑ کر اس کا سر منہ میں ڈال کر چوسا جاتا ہے۔ لولی پاپ کا سر بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ گول، لمبا، سیٹی بجانے والا وغیرہ۔ غرض شریر بچے کو اگر دیر تک خاموش رکھنا ہو تو اس کے ہاتھ میں لولی پاپ تھما دیتے ہیں جس سے اس کا منہ اور ہاتھ دونوں دیر تک محو لذت مصروف رہتے ہیں۔ مان لو ایک لولی پاپ بچے کو hypnotize کر دیتا ہے اور اس کے سوالات اور شرارتوں سے دیر تک نجات کا سبب بنتا ہے۔

ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے اور ہر پانچ سال کے بعد حکومت سازی کے لئے الیکشن کروائے جاتے ہیں اور بیچ میں بلدیاتی اور میونسپل الیکشن بھی کروائے جاتے ہیں۔ یہاں الیکشن کسی تہوار سے کم نہیں ہوتے۔ الیکشن کے لئے مختلف پارٹیاں جو میدان میں ہوتی ہیں، ان کے نامزد امیدوار کامیاب ہونے کے لئے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہیں اور حسبِ دستور اُن علاقوں میں جھنڈے لگائے جاتے ہیں، گڑھوں میں سے سڑک کو کھنگال کر اس کی صفائی کروائی جاتی ہے اور امیدوار کے چناوی نشان کی مالائیں بے حس پڑی بجلی تاروں پر لٹکائی جاتی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکروں سے اعلان کروائے جاتے ہیں اور بے روزگار لوگ تفریح کے خیال سے گھروں سے باہر آجاتے ہیں۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

بہر حال امیدوار لوگوں میں خیالی لولی پاپ بڑی مہارت سے بانٹتا ہے۔ پھر کیا، لوگوں کے ہاتھ لولی پاپ کی ڈنڈی کو تھامے رہتے ہیں اور وہ سارے گلے شکوے جو اُن کی زبان پر سیلاب بن کر اُمڈ آئے تھے، ہوا ہو جاتے ہیں۔ زباں اب صرف لولی پاپ چوسنے کے کام آتی ہے اور ایک اچھا خاصا آدمی hypnotize ہو کر چناوی وعدوں کی گٹھری باندھتا نظر آتا ہے۔

چناوی امیدوار کسی جادوگر سے کم نہیں ہوتا۔ آپ نے سڑک کنارے کبھی نہ کبھی کسی جادوگر کو کرتب دکھاتے ہوئے ضرور دیکھ ہوگا جو اپنے ہنر سے بندر اور جمورے کو گلاٹیاں مرواتا ہے اور لوگ بھی دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ چناوی امیدوار میں بھی یہی ساری خوبیاں ہونا از بس ضروری ہے۔

بے روزگاروں کے لئے نوکری بنانے والی مشینوں کی بیرون ملک سے

درآمد کا اعلان، گھڑوں میں سے سڑک کھوجنے والے آلات کا استعمال، تعلیم کے لئے Stainless steel ڈھانچہ، الغرض ایسے بلند بانگ وعدوں کے لولی پاپ نچھاور کئے جاتے ہیں کہ ہر طرف لوگوں کے منہ سے لپ لپ کی آوازیں دور سے سنی جاسکتی ہیں اور مدہوشی کے عالم میں لوگ اپنا ووٹ دے کر اُمیدوار کی مستقل پانچ سالہ نوکری پر خوشیاں مناتے ہیں اور مٹھایاں بانٹتے ہیں۔۔۔اور خود اگلے پانچ سال کے لئے مفت کا لولی پاپ ہاتھ میں لئے جمورے کی طرح گلاٹیاں مارتے نظر آتے ہیں۔

●●●

☆۔۔۔محمد شفیع ایاز

رئیس الحجام

ایک بار ایک بادشاہ اپنے حجام کی حجامت سے خوش ہوا اور اُس سے کہا کہ اب وہ رئیس الحجام ہے۔ حجام پھولے نہ سمایا اور جب گھر پہنچا تو اپنی بیوی پر رعب جمانے لگا۔

''میں اب عام حجام نہیں ہوں، میں اب رئیس الحجام ہوں''

حجام کی بیوی بڑی عقل مند تھی۔ اس نے اپنے خاوند سے پوچھا کہ وہ کیسے رئیس الحجام بن گیا۔ حجام نے فخریہ انداز میں جواب دیا کہ بادشاہِ وقت نے اس کو ''رئیس الحجام'' بنایا۔ حجام کی بیوی ہنس پڑی اور بولی کہ بادشاہ کے کہنے سے وہ تھوڑا رئیس الحجام ہو گیا، وہ تو رئیس الحجام تبھی کہلائے گا جب ملک کے سبھی حجام اُسے اپنا رئیس مانیں گے۔

یہ بات ہمارے ان تمام لیڈروں، علما، ادبا، شعرا اور ایسے ہی دوسرے لوگوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ایسے ہی جب بہت سارے حجاموں کو رئیس الحجام کے خطابات اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی یا اخبار میں جب یہ بات آجاتی ہے تو ایسے افراد کے تیور بدل جاتے ہیں۔ اُن کا طرز کلام، اٹھنا بیٹھنا، لباس سب کچھ بدل جاتا ہے۔ انہیں اپنے سِوا کچھ نظر آتا نہیں۔ بس وہی اپنے میدان کے رستم زمانہ ہیں اور باقی سب طفل۔ اپنے ہمسایوں سے اس طرح پیش آتے ہیں جیسے کہ ان کی پہچان اُسی کے نام سے ہے۔ زبان سے نہیں ہاتھ ہلا کر سلام کا جواب دیتے ہیں۔

ہمارے یہ رئیس الحجام پانی کے بُلبُلے ہیں۔ کاش یہ خود کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھ پاتے۔ ابھی حال ہی میں میرے ایک دوست نے مجھے اپنی تحریر کردہ ایک کتاب دی تھی۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میرے ایک ساتھی نے کتاب دیکھی اور فرمانے لگا۔ ''بھئی۔ میں ایسی کتابیں نہیں پڑھتا۔ بیرون ملک کے رائٹرس کی بات کچھ اور ہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ ان کا معیار کتنا اونچا ہے۔ ہمارے یہ رائٹرس کیا واہیات لکھتے ہیں! میں بھی تو ایک قلم کار ہوں لیکن میں مقامی اخباروں یا رسالوں کیلئے نہیں لکھتا ہوں۔'' اس کی باتیں سن کر مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ اِس سے پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ ساتھی بھی رائٹر ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا بھئی وہ کس غیر ملکی اخبار یا رسالے کیلئے لکھتا ہے تو وہ مسکراتے ہوئے بولا ''تمہیں کیا بتاؤں یار'' مجھے تو بہت سے ایوارڈ بھی ملے ہیں، یہ اور بات ہے کہ میں اپنے منہ سے اپنی تعریفیں کرنا نہیں چاہتا''۔ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور دفتر سے باہر نکلا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ لکھتا کیا ہے اور کس اخبار یا رسالے کے لئے لکھتا ہے اور کس زبان میں لکھتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک اس کی تعلیم کا تعلق ہے اس نے کالج گیٹ پر آویزان کالج کے بورڈ کو صرف پڑھا ہے کالج کے اندر قدم نہیں رکھا ہے لیکن تیور ایسے ہیں جیسے کہ اس نے بار ایٹ لا کیا ہے اور اس غلط فہمی میں ہے کہ وہ یہاں کا رئیس الحجام ہے۔

●●●

☆......محمد شفیع ایاز

اُستادِ گوسفندان

کچھ برس پہلے میں نے دو ہمسایوں کو جھگڑتے دیکھا، دونوں پیشے سے استاد تھے۔ جب میں نے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انہیں یہ زیب نہیں دیتا تو وہ اور بھڑک اُٹھے اور جبھی ایک ساتھی نے کہا یہ معمار نہیں استاد گوسفندان ہیں۔ نام کے یہ استاد قوم کی تعمیر میں کون سا رول ادا کر سکتے ہیں جو خود اپنے منصب سے ناواقف ہیں۔

ہمارے یہاں کا عالم ہی عجیب ہے۔ استاد کا پیشہ اب سائیڈ جاب بن کے رہ گیا ہے۔ یہ لوگ یا تو پرائیوٹ ٹیوشن سینٹر چلاتے ہیں یا کوئی دوسرا کاروبار کرتے ہیں۔ سکولوں میں حاضری اور پڑھانے کا کام برائے نام ہے۔ حد تو یہ ہے کہ رہبر تعلیم اساتذہ بھی پیچھے نہیں۔ ایک رہبر تعلیم استاد اپنے بدلے اپنے بھائی کو اپنی جگہ سکول بھیجتا ہے جو دسویں میں فیل ہوا ہے۔ خود وہ کوئی کاروبار کرتا ہے۔ کنٹریکٹ کا یہ تماشا بھی عجیب ہے۔

ہمارے ایک محترم ساتھی نے بیس سال محکمہ تعلیم میں بحیثیت مدرس کام کیا اور پھر مستعفی ہوئے۔ یہ پوچھنے پر کہ انہوں نے یہ نوکری کیوں چھوڑی تو ان کا جواب سن کر ہم بھی سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اس کا کہنا تھا کہ دوران ملازمت وہ ایک بار ایک آٹو موبائیل ورکشاپ کے سامنے کھڑے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک، کہیں سے آواز آئی ''ماسٹر جی، اسلام علیکم'' اِدھر اُدھر دیکھا تو زیر مرمت ایک میٹاڈور کے نیچے

کام کرر ہے مستری پرنظر پڑی۔ گردآلودلباس اور چہرے پر کالک لگے ایک لڑکا میٹاڈور کے نیچے سے باہرآ گیااور کہنے لگا۔ ''ماسٹر جی، آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ آپ نے مجھے پڑھایا ہےاورآپ کی بدولت یہ کام کرر ہاہوں'' ماسٹر جی نے خیریت اسی میں سمجھی کہ وہ وہاں سے چل پڑا۔ چند دن بعد وہ ایک ٹانگے پرسوار ہوکرکہیں گیا۔ ٹانگے سے اُتر کر ٹانگے بان کوجوں ہی کرایہ دینے لگےتو نوجوان ٹانگے بان نے یہ کہہ کرکرایہ لینے سے انکارکیا کہ وہ ماسٹر جی کا شاگرد رہاہےاورتیسری تک ماسٹر جی نے اُسے پڑھایا ہے۔ وہ کرایہ کیسے لے سکتا ہے۔ ماسٹر جی نے کچھ کہے بغیر ہی اپنا راستہ لیا۔ علاقے کے پولیس سٹیشن میں ماسٹر جی کو تھانے کے منشی سے یارانہ تھا۔ اتوار کا دن تھا تو ماسٹر جی اپنے منشی سے ملنے تھانے گیا۔ دونوں چائے پی رہے تھےتو تھانے کے لاک اَپ سے ایک آواز آئی ''ماسٹر جی سلام'' ماسٹر نے دیکھا تو لاک اَپ میں سے ایک لڑکا اس کی طرف مخاطب تھا۔ ماسٹر جی نے لڑکے سے پوچھا کہ وہ کون ہےاور یہاں کیوں بند ہےتو لڑکے نے نہایت حلیمانہ انداز میں کہا'' ماسٹر جی آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ آپ نے مجھے پڑھایا ہے میں آپ کا شاگرد رہاہوں۔ ابھی اس نے بات پوری نہیں کی تھی کہ منشی نے کہا کہ یہ ایک نمبر کا جیب کترا ہے۔ اِسے پہلے بھی ہم نے کئی بار پکڑا ہے لیکن یہ بازنہیں آتا۔ ماسٹر جی نے جب اپنے شاگردوں کےاحوال دیکھےتو سوچا اگر وہ بدستور پیشہ استاد سے وابستہ رہےتو آگے ان کے شاگردوں کا حال کیا ہوگا اور یہی سوچ کر مستعفی ہوئے۔ خیر، ان صاحب کوقوم پرترس آیا مگروہ جوابھی تک خودناخواندہ ہیں خواندگی مہم کوکہاں تک آگے لے جاسکتے ہیں خداہی جانے۔

ایک اور واقعہ قابل ذکر ہےاوراس کے راوی ایک معزز اور قابل استاد ہیں۔ بتارہے ہیں کہ ایک استاد اپنے کلاس روم میں اردو کا مضمون پڑھارہے تھےتو کسی شریر لڑکے نے ماسٹر جی سے'' آیئے بہارکوہم بانٹ لیں'' کا مطلب پوچھا۔ ماسٹر جی نے

اپنے والد کے ساتھ 1990ء میں میٹرک کا امتحان بیرونی امداد کے بل پر فسٹ کلاس میں پاس کیا تھا اور کسی کی سفارش پر محکمہ تعلیم میں مدرس مقرر ہوا تھا۔ اپنا نام لکھنے کے سوا اس کو کچھ آتا بھی نہیں تھا۔ خیر لڑکے نے جو پوچھا تو جواب دینا تو تھا فوراً دوسرے استاد سے مدد طلب کی۔ وہ بھی غضب کے استاد تھے اور سمجھایا کہ اصل میں یہ شعر ''آیئے بہار(Bahar) کو ہم بانٹ لیں''نہیں بلکہ آیئے بہار(Bihar) کو ہم بانٹ لیں'' ہے۔ یہ ان دنوں کا شعر ہے جب بہار صوبہ کو دو حصوں یعنی بہار اور جھارکھنڈ میں باٹنے کی تحریک چل رہی تھی۔ یہ اسی ضمن میں کہا گیا ہے۔ ماسٹر جی کچھ نہیں سمجھے اور ہو بہو یہی مطلب اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔ اب آگے جا کر یہ لڑکے یا شاگرد کون سا راستہ اختیار کریں گے، آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔

ایسے استاد گو سفندان کو قوم کی تعمیر کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ یہ سب کیسے ہوگا، اس کی کیا صورت ہوگی خدا جانے! ان اشخاص کا محکمۂ تعلیم کے ساتھ عقد ہی نہیں ہے ۔ بقول شاعر:

مُرغیاں کب نکاح کرتی ہیں
سارے انڈے حرام ہیں پیارے

●●●

☆......محمد شفیع ایاز

بازار سجتے ہی لٹیرے آ گئے

سُنی سنائی بات ہے، حقیقت رب جانے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار کسی گاؤں میں پانی کی شدید قلت تھی۔ لوگوں نے بار ہا یہ مطالبہ کیا کہ گاؤں میں ایک ٹیوب ویل کی سہولیت میسر کی جائے۔ آخر ایک انجینئر صاحب نے اپنے ترقیاتی منصوبہ میں گاؤں میں ٹیوب ویل کھودنے کیلئے ایک لاکھ روپیہ مشخص رکھوالیا۔ سال بھر گزر گیا، خزانہ عامرہ سے مطلوبہ رقم بھی نکالی گئی مگر ٹیوب ویل نہیں کھودا گیا۔ جب انجینئر صاحب کا اس علاقے سے تبادلہ ہوا تو نئے انجینئر صاحب نے اپنا چارج سنبھالا۔ چارج لینے دینے کے وقت پُرانے انجینئر نے نئے انجینئر سے کہا کہ پورے کاغذات اور کام مکمل ہیں ماسوائے ایک ٹیوب ویل کے، اس کی کھدائی کی رقم تو نکالی گئی ہے لیکن ٹیوب ویل کھودنا باقی رہ گیا۔ لہٰذا اس بات کو ذرا طریقے سے ہی نپٹانا۔ نئے انجینئر نے کہا کہ یہ تو معمولی سی بات ہے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نئے سال کا جب ورکس پروگرام بنا تو نئے انجینئر نے اپنے اعلیٰ افیسران کو لکھا کہ چونکہ اس سے پہلے انجینئر نے فلاں گاؤں میں ایک ٹیوب ویل کھدوایا تھا لیکن 25 فٹ گہرائی پر بھی وہاں پانی نہیں ملا لہٰذا اُسے اور گہرا کھودنے کے لئے مزید ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ فنڈس منظور ہو گئے، لیکن زمینی سطح پر ٹیوب ویل کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔

جب اس انجینئر کا بھی تبادلہ ہوا تو تیسرے انجینئر نے چارج سنبھالا۔ جانے والے انجینئر نے جاتے جاتے نئے انجینئر کو بتایا کہ ٹیوب ویل والا معاملہ ذرا

احتیاط سے سنبھالے کیونکہ دوبارہ اس کی کھدائی کیلئے رقم نکالی گئی ہے۔لیکن ٹیوب ویل کہیں نہیں ہے۔ نیا انجینئر تو سابقہ دو انجینئروں کا اُستاد نکلا۔اس نے محکمہ کے اعلیٰ حکام کو ایک خط لکھا جس میں یہ بتایا کہ چونکہ گاؤں میں دوبارہ ٹیوب ویل کی کھدائی کی گئی ہے لیکن پانی بہت گہرائی تک بھی نہیں ملا اور اب ٹیوب ویل کی جگہ گہرا کھڈا ہے جس میں انسانوں اور حیوانوں کے گرنے کا خطرہ ہے۔لہٰذا اس کو بند کرنے کے لئے اس میں مٹی کی بھرائی کرنی مطلوب ہے جس کے لیے فنڈس واگزار کئے جائیں۔ فنڈس وگزار کئے گئے اور انجینئر کے ہاتھ بھی گرم ہوگئے اور اس طرح تین بار ایک ہی ٹیوب ویل کے لئے رقومات نکالی گئیں جبکہ ٹیوب ویل کا کہیں نام نشان تک نہ تھا۔اس طرح قتل بھی ہوا اور لاش بھی غائب۔

یہی حال ہمارے یہاں ان ترقیاتی کاموں کا ہو رہا ہے جن کے لئے رقم کثیر واگزار ہوتی ہے۔مگر کام کا کہیں وجود نہیں ہوتا اور یہ لوٹ اب عیاں ہے۔گویا بازار سجتے ہی لُٹیرے آجاتے ہیں۔

●●●

☆......محمد سلیم سالک

ابلیس: فن اور شخصیت

آپ لوگ ''ریسرچ اسکالر'' لفظ سن کر ہی جان گئے ہوں گے کہ بات کسی ''تحقیقی مقالہ'' پر ہوگی۔ یقیناً آپ کو کسی مغالطہ میں ڈالے بغیر بات ''تحقیقی مقالہ'' پر ہی ہوگی کیوں کہ آج کل جس شخص کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا وہ ''ریسرچ اسکالر'' بن کر تاریخ میں اپنا نام درج کرنے کے منصوبے باندھتا ہے۔ ویسے موضوعات تو آج کل ریڈی میڈ کپڑوں کی طرح تیار بہ تیار ملتے ہیں۔ تحقیقی کام میں اس قدر دھکم پیل ہے کہ ایک شخص پر دو دو تین تین آدمی پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اسی تحریک پر میں نے بھی ریسرچ اسکالر بننے کی ٹھان لی۔ میں ایک منفرد موضوع پر کام کرنا چاہتا تھا لیکن مناسب موضوع نہ ملنے پر رات دن حیران و پریشان ہو کر آوارہ گردی میں مصروف عمل تھا کہ ایک دن اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کیوں نہ ''ابلیس کی شخصیت اور فن'' کے بارے میں کوئی ضخیم سی تھیسس تیار کی جائے۔ اس کی مجھے دوہری وجہ نظر آئی ایک یہ کہ ہم نسل در نسل ننگے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چل بلکہ دوڑ رہے ہیں اور وہ راندۂ درگاہ ہونے کے دن سے ہی اپنے کام میں اتنا مصروف ہوگیا ہے کہ اس کو اس بات کا احساس بھی نہ رہا کہ ناقدانِ فن کی طرف رجوع کر کے اپنے کارناموں کی ایک توضیحی فہرست ہی مرتب کرواتا۔ بہرحال یہ موضوع شاید میرے ہی قلم کی زینت بننے کے لئے بچا تھا۔ سو میں نے بھی اس پر مواد اکٹھا کرنے کی شروعات کی۔

آپ کوتو معلوم ہوگا کہ تحقیقی مقالہ لکھنے سے پہلے Synopsis ترتیب دیناضروری ہوتا ہےتو میں نے اپنی استعداد کو بروئے کار لا کر مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ایک خاکہ تیار کیا۔

باب اوّل: عزازیل سے ابلیس تک: اس میں حیاتِ ابلیس کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ مثلاً عزازیل ابلیس کیوں بنا؟ جنت میں کس طرح حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو ورغلایا۔ ابلیس نے ہر زمانے میں کس طرح اپنی شناخت بنائے رکھی۔

باب دوم: ابلیسی زبان کے لسانیاتی پہلو: جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ابلیس نے کون کون سی اصطلاحات اختراع کی ہیں اور اس میں کس نوعیت کی نمکین گالیاں، غیبت کے ترشول تراشے اور تعریفوں کے کون سے ایسے زاویئے ہیں جو انسان کو تکبر کی مملکت میں لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تراکیب اور محاوروں پر بھی گفتگو ہوگی جیسے شیطان سر پر چڑھنا، شیطان کی خالہ، شیطان کی آنت وغیرہ وغیرہ۔

باب سوم: ابلیسی جمالیات: مثلاً کس طرح وہ انسان کی ''جمالیاتی حس'' کو بیدار کر کے زندگی کو رنگین بنانے کی تحریک دیتا ہے اور فیشن شوز، عریاں رقص اور مقابلہ حسن اور دیگر ایسی ہی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی صلاحیت بخشتا ہے۔

باب چہارم: ابلیس کے کارنامے: مثلاً کس طرح میاں بیوی کے درمیان دراڑ پیدا کرتا ہے اور دوست کو دشمن بناتا ہے۔ بھائی کو بھائی سے لڑاتا ہے اور زن، زر، زمین کے معاملے متنازعہ بنا کر طویل معرکوں کو جنم دیتا ہے۔

باب پنجم: ابلیسی خصائل: تکبر، تعصب، ضد، حسد، کینہ، بغض، ناامیدی، فضول خرچی، فریب دہی، تعریف کی مسکہ بازی اور گدھے کو باپ بنانے کے فن کا

تفصیلی جائزہ پیش ہوگا۔

بابِ ششم: ابلیس کے اقوال زریں اور ملفوظات کی فہرست جس کے جستہ جستہ نمونے سیاست دانوں اور دوغلہ پن کے حامل ادیبوں کی تقاریر اور اقوال سے حاصل کئے جائیں گے۔

بابِ ہفتم: ابلیس:۔ ماہرین ابلیسیات کی نظر میں: اس میں ابلیس پر نقد و انتقاد کے ابلیسی کام کا جائزہ لیا جائے گا اور آخری باب میں ابلیس کے من پسند شاگردوں کا اجمالی تعارف اور انٹرویو پیش کیا جائے گا۔

جوں ہی میں نے مندرجہ بالا عنوانات کے مطابق مواد اکٹھا کرنے کے لئے لائبریری کا رخ کیا تو وہاں پر تلاش بسیار کے باوجود کوئی بھی مقالہ یا کتاب نظر سے نہیں گزری، الماریوں کی الماریاں کھنگالیں مگر کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہا کہ ایسی ہمہ جہت شخصیت کو ناقدانِ فن نے فراموش کر کے اپنی نا اہلی کا پختہ ثبوت فراہم کیا ہے۔ پھر کسی غیبی آواز نے مجھے رسائل کی طرف متوجہ کیا۔ چوں کہ اکثر رسائل مختلف اور متضاد شخصیات پر 'خصوصی نمبر' شائع کرتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ کسی دور کے رشتہ دار یا غائبانہ مرید نے ایسی نابغہ روزگار ہستی کے کارناموں کو نسخۂ کیمیا سمجھ کر قلم بند کر کے جمع کیا ہو۔ لیکن وہاں بھی ناامیدی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔

پھر میں نے حسب دستور اخبار میں جلی حروف میں ایک اشتہار شائع کروایا کہ جن اصحاب نے بھی ذاتی طور پر ابلیس پر کوئی کام کیا ہو یا کوئی ابلیسی کام کیا ہو وہ برائے مہربانی یا تو کوئی مواد مجھ تک پہنچائیں یا بہ نفسِ نفیس مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ ایک طرف وقت کی کمی تو دوسری طرف مواد کا فقدان۔ مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہوا کہ ابلیس جیسی شخصیت کے بارے میں آج تک اتنی بے رخی کیوں برتی گئی۔ یہ سارا معاملہ دیکھ کر مجھے ابلیس پر ترس آنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو کے چند قطرے رخساروں

کوچھوتے ہوئے دامن کوتر کرنے میں کامیاب ہوئے کیوں کہ میں حیران ہوا کہ اس کے تمام شاگردوں نے پارسائی کے چغے اتارنے سے انکار کردیا ہے۔آخر جوں توں میں نے اپنا تحقیقی مقالہ سمیٹ لیا اور اس کو ایک کتابی شکل دینے میں کامیاب ہوا۔ کیوں کہ اکثر ''ریسرچ اسکالر'' اپنی تھیسس چھاپنے سے گھبراتے ہیں کہ کہیں مالِ مسروقہ کو پہچان نہ لیا جائے۔بہر حال جب میری کتاب ''ابلیس۔فن اور شخصیت'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئی تو ایک غیر معمولی تقریب کا انعقاد ہوا۔مگر حیرت اس بات پر ہے کہ اس میں وہی لوگ شامل ہوئے جو ابلیس پر رات دن شب وشتم کرتے رہتے ہیں اور وہ بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا ہے۔ناچیز نے بھی موضوع کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ساتھ ہی تین قراردادیں بھی پیش کیں،جن کا لب لباب یوں تھا:

(۱) حکومت سے اپیل کی جائے کہ وہ ابلیس کے نام پر ایک Institute قائم کرے۔

(۲) ابلیسیات کا Subject تعلیمی اداروں میں متعارف کرایا جائے تاکہ ابلیس کی حق ادائیگی ہو جائے۔

(۳) ابلیس کے نام پر ایک اکیڈمی کی بنیاد ڈالی جائے اور وہاں سے ماہنامہ ''ابلیس'' کی اشاعت پر بھی غور کیا جائے۔

میری قرارداد کو سامعین نے بہ غور سن کر حکومت وقت کو یاد دہانی کرنے کے لئے کچھ ''ماہرین ابلیسیات'' کو بصورتِ وفد روانہ کیا۔مگر یہ جماعت اپنے محسن کو بھول کر حکومت کے ساتھ مل کر اپنے کام کروانے میں مصروف ہوئی اور محقق کی محنت کا فائدہ اٹھا کر اس کو اپنا تحقیقی مقالہ چاٹنے کے لئے وہیں رکھا۔

یہ تھی مختصر بات میرے شائع ہوئے تحقیقی مقالہ کے بارے میں،جو میں نے نہایت ہی عرق ریزی سے لکھا۔سامعین سے گزارش ہے کہ میری کتاب ضرور خرید کر

پڑھیں تا کہ یہ کتاب آپ کی لائبریری (Library) کی زینت بن سکے۔ باقی اگر میری کتاب میں کسی کا مالِ مسروقہ دانستہ طور پر در آیا ہو تو یہ سمجھ کر معاف کریں کہ ابلیس پر کام کرتے کرتے وہ مجھ سے اتنا خوش ہوا کہ بنا کسی معاوضہ کے کچھ اوصافِ بد مجھے ہدیہ میں دے کر اپنی کتاب کو ضخیم اور جامع بنانے میں مجھے ہمیشہ بے چین و بے قرار رکھا۔

●●●

☆......محمد سلیم سالک

پوسٹ کرونا ادب

یہ ادبی دنیا کا پہلا حادثہ ہوگا جب کسی ادبی اصطلاح کی اختراع کے لئے ماہر لسانیات اور ناقدان ادب کی بجائے سیدھے چین سے مدد لینا پڑی ہے۔آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ چینی اگر چہ ناٹے قد وقامت کے مالک ہیں لیکن پوری دنیا کو پریشانیوں میں مبتلا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔چاہے وہ اقتصادیات ہوں یا سیاسیات زندگی کے تمام شعبہ جات پر حکمرانی کرنا ان کی فطرت میں ہے۔شاید اسی لئے ''پوسٹ کرونا ادب'' کی اصطلاح کو رائج کرنے کے لئے چینی قوم پوری شد و مد سے ''وُہان'' کے دہان سے نکلی اور پوری دنیا میں اس طرح پھیل گئی، جیسے ایک زمانے میں ڈائینسور دندناتے پھرتے تھے۔

ادب کے طالب علموں کو اس بات کا غائر مطالعہ ہوتا ہے کہ ہر تحریک یا رجحان کا ایک مینوفسٹو ہوتا ہے، جس کے تحت با قاعدہ ادب تخلیق کیا جاتا ہے اور اس کے لئے مخصوص اصطلاحات کا گورکھ دھندہ جاری رہتا ہے۔اس لحاظ سے پوسٹ کرونا ادب کسی بھی طرح کم مائیگی کا شکار نہیں۔اس کی تخلیق میں کووڈ 19، لاک ڈاون، ماسک، Sanitizer، ویکسین، Immunity، سوشل ڈسٹنس، ایڈوائزری، ریڈ زون، Pandemic اور اسی قبیلے سے جڑی بیماریاں جیسے نزلہ، کھانسی، بخار، وغیرہ کے موضوعات ہوں یا خالی خولی یہ لفظ ہی ہوں، ان کو''پوسٹ کرونا ادب'' میں داخلہ مل جائے گا۔آپ سوچ رہے ہوں گے کہ Quarantine کا ذکر خیر کیوں

نہیں کیا گیا۔وہ شاید اس لئے کہ جب میں نے Quarantine کا اردو ترجمہ قرنطینہ پڑھا تو میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ایک زمانے میں جب میرا عارضی لیکچرار کی اسامی کے لئے انٹرویو لیا گیا تو کالج کے پرنسپل نے انٹریو کے آخر میں مجھ سے اردو کا ایک لفظ لکھنے کے لیے کہا۔شومئی قسمت اس لفظ میں Quarantine (قرنطینہ) سے ملتا جلتا لفظ قسطنطینیہ لکھنے کے لیے کہا گیا۔میں حواس باختہ سوچتا رہا اس لفظ میں کتنے ''ط'' ہیں اور یوں میرا تقرر ہوتے ہوتے رہ گیا۔اس لئے اپنی خفت مٹانے کے لئے میں نے ادبی دنیا سے ہی قرنطینہ لے لیا۔

پوسٹ کرونا ادب میں ادب برئے ادب اور ادب برائے زندگی کی آمیزش سے تیار کردہ نیا نسخہ معرض وجود میں آیا یعنی Stay Home ,Stay Safe۔اس نعرے کی تخلیق باقاعدہ سنی ٹائزر ملنے کے بعد ہی کی گئی ہے۔اگر چہ بنیادی طور پر ''جیو اور جینے دو'' کے مترادف یہ نعرہ ان لوگوں کے لئے بہت ہی تکلیف دہ ہے، جنہوں نے پوری زندگی دوسروں کی زندگیوں کو اجیرن بنانے میں گزاری ہو۔چچازاد بھائی دوست محمد خان کاشمیری کا نظریہ اس سے تھوڑا مختلف ہے۔ وہ Stay Away, Stay Safe کے پرستاروں میں ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے، اس لئے بازار میں تڑکے والی چیزوں کو بھی منہ لگانا چاہیے۔ مبادا کہ کبھی کبھار منہ کالا ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔

پوسٹ کرونا ادب کا فی الحال تو کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا ہے لیکن اس بات سے بھی مفر نہیں کہ متشاعروں کی بے تکی شاعری سے سامعین اتنے تنگ آگئے تھے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی گلے ملنا اور بوس وکنار اور لذت گریہ کا شکار ہونا پڑتا تھا لیکن اب پوسٹ کرونا دور میں اس بدعت سے خلاصی مل گئی ہے، کیوں کہ اب باقاعدہ سوشل ڈسٹنس رکھنا ضروری ہے۔ساتھ ہی ماسک پہننے سے ان فتنہ پرور حسینوں کے چہروں

سے بھی نجات مل گئی جن کو دیکھنے سے ایمان میں خلل پڑنے کا اندیشہ رہتا تھا۔اسی لئے تو ترقی پسند تحریک کو سمجھانے کے لیے مجاؔز کا یہ شعر پڑھا جاتا ہے:

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

میری استعداد کے مطابق یہ شعر ترقی پسندوں نے قطعاً نہیں سمجھا ہے۔ محبوب کے آنچل کا پرچم بنانا کون سی عقل مندی ہے۔اب اگر اس شعر کی تفہیم پوسٹ کرونا ادب کے نظریئے سے کی جائے تو ایک آنچل کے درجن بھر ماسک بنائے جاسکتے ہیں،جس سے یہ فائدہ ہوگا کہ محبوب کے نامراد عاشقوں کے چہروں کو بہ آسانی ڈھانپا جاسکے گا۔کم از کم ان بدنصیبوں کو محبوب کے بالوں کو سونگھنے کا موقع تو نصیب ہوگا۔یاد رہے محبوب کا آنچل زبردستی چھینا گیا ہے اور اس چھینا جھپٹی میں محبوب کے سر کے بال بھی اکھڑ گئے ہیں۔

مستقبل قریب میں جب طلبا کو ناول کے بارے میں پڑھایا جائے گا تو ''ناول کرونا وائرس'' کے مصنف سے،معافی چاہتا ہوں کہ یہ دنیا کا پہلا ناول ہے، جس کو کسی شخص نے تخلیق نہیں کیا بلکہ پوری چینی قوم نے دنیا کو یہ تحفہ صرف اس شرط پر دیا ہے کہ جس شخص کو یہ کرونا ناول لاحق ہوجائے اس کی زندگی میں پھر کسی اور ناول کے پڑھنے کا کم ہی موقع ملنے کی امید ہے۔جو ادب ماسک پہن کر پڑھایا لکھا جائے اس کو بھی پوسٹ کرونا ادب ہی کا حصہ تصور کیا جائے گا۔اس لئے محققین اور ناقدین پر لازمی ہے کہ وہ ماسک پہن کر سرقے کی روایت کو قائم ودائم رکھیں۔اب اگر خدانا خواستہ گرد آلود کتابوں کی سرقہ گردانی کے دوران کھانسی یا بخار محسوس ہو تو یقین کریں کہ اس میں پوسٹ کرونا ادب کے بیش بہا خزانے پوشیدہ ہیں۔

آپ یہ سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ کرونا وائرس کا باقاعدہ ایک

خاندان ہے لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس خاندان کے دیگر سرداران کو دیکھنے کے لئے ہماری عمریں کافی نہیں ہیں۔ان کے بابائے آدم حضرت پلیگ (Plague) نے 1720 میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی پھر اس نسل کو پروان چڑھانے کے لئے حضرت کالرا (Cholera) نے 1820 میں جنم لیا۔جب بات آگے بڑھی تو سائنسدانوں کو مزید چیلنج دینے کے لئے محترمہ فِلیو صاحبہ 1920 میں قدم رنجہ ہوئیں۔اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے جب رکاوٹیں کھڑی کی گئیں تو فلیو صاحبہ نے اپنی مادرِشفیق کو بروئے کار لاکر اپنی اولادِ نرینہ کرونا کو ''وُہان'' میں 2019ء میں جنم دیا۔

کورنا کے ماہرین Immunity پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔اس لئے وہ پیاز کا استعمال مفید سمجھتے ہیں۔شاید اسی لئے چچازاد بھائی دوست محمد خان کاشمیری اپنے سرہانے فکر تونسوی کی ''پیاز کے چھلکے'' رکھتے ہیں تا کہ Immunity میں بہتری آسکے۔کاش فکر صاحب زندہ ہوتے تو آج پوسٹ کرونا دور میں ان کو ضرور کوئی بڑا ادبی ایوارڈ مل جاتا ورنہ جن لوگوں کو یہ ایوارڈ ملتے ہیں ان کی تحریروں سے Immunity بگڑنے کا زیادہ احتمال رہتا ہے۔ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوارڈ دینے والوں اور لینے والوں کی بینک بیلینس کی Immunity ضرور بڑھ جاتی ہے۔

●●●

☆.....محمد سلیم سالک

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

پیش نوشت: ''خبر دار شعر کا وزن ٹوٹ رہا ہے''، یہ کہتے ہوئے اساتذہ کے من میں لڈو پھوٹتے ہیں اور بعد میں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اساتذہ کے شعر خود بحر و وزن سے خارج ہیں تو چچا غالبؔ کا یہ شعر برجستہ زبان پر وارد ہوتا ہے۔ ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

سسرال سے ملنے والے جہیز کے سامان کی طویل فہرست کے بعد بھی کسی چیز کی خواہش ہونا عجیب سا لگتا ہے۔ پھر بھی دوستوں سے گپ شپ کے دوران پتہ چلتا ہے کہ کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جن سے ہمیں محروم رکھا گیا ہے۔ جدید دور کی تمام سہولیات میسر ہونے کے باوجود کسی کمی کا احساس روز بروز بڑھتا رہتا ہے جو اس تذبذب کو جنم دیتا ہے کہ پہلے کون سا کارنامہ انجام دیا جائے اور بعد میں کس کام کا گلے میں پھندہ ڈالا جائے۔

مختلف الخیال لوگ اپنے اپنے شوق پالنے کے لئے عجیب طرح کے ڈھنگ نکالتے ہیں۔ اسی روش کو ہم نے بھی برقرار رکھنے کا عہد کیا۔ کافی غور وخوض کے بعد اپنے کسی نامکمل خاندانی شوق کو پورا کرنے کے لئے پسینے کی ایک ایک بوند بہانے کی قسم کھائی لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جب سے ہم نے یہ قسم کھائی تب سے جیسے بدن میں پسینہ ہی خشک ہو گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ محنت ڈبل کرنا پڑے گی۔

بہرحال ہم اس تلاش میں نکلے کہ ہمارے خاندان کا وہ کون سا شوق ہے جو آج تک پورا نہیں ہوا جسے پورا کرنے کے لئے ہم جان کی بازی لگا سکیں۔ جوں ہی ہم نے CID ڈرامے کے اے۔سی۔پی پریدومن کی طرح تحقیقات شروع کی تو معلوم ہوا کہ دادا جان مرحوم کو شعروادب سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ رہا تھا۔ آپ لفظ مرحوم سے نہ چونکیے دراصل مرحومؔ ان کا تخلص ہے ورنہ وہ ابھی بقیدِ حیات ہیں اور روزانہ پانچ میل چل کر اپنے مرحومین کو ایصالِ ثواب کی خاطر آبائی مقبرہ جاتے ہیں۔ وہ اگرچہ شاعر نہیں ہیں لیکن کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر جوانی میں شعروشاعری بھی کرتے تھے مگر شاعری بے وزن ہونے کی وجہ سے لوگ انہیں دیکھ کر راستہ بدل لیتے تھے۔ چونکہ غیرت مند ہیں لہٰذا شاعری کی اس توہین کو نہ سہنے کی وجہ سے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر شاعری ترک کردی اور اب صرف سرقہ پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ وہ بھی ان شعرا کا سرقہ کرتے ہیں جو مرحومین کے زمرے میں آتے ہیں اسی لئے ''مرحومؔ'' تخلص اختیار کیا ہوا ہے۔

یہاں سے مایوس ہوکر ہم اپنے والد صاحب کے حالات معلوم کرنے نکلے تو یہ انکشاف ہوا کہ انہوں نے اپنے والد یعنی میرے دادا جان مرحوم کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کمر کس لی تھی لیکن عین جوانی میں وہ کمر درد میں مبتلا ہوکر رہ گئے اور اب ڈاکٹروں کے پاس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس کے باوجود ایک جاں نثار فرزند کا حق ادا کرتے ہوئے انہوں نے باضابطہ شاعری شروع کردی، پہلے پہل لفظوں کے الٹ پھیر کو ہی شاعری سمجھتے رہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ شاعری میں وزن، قافیہ، ردیف جیسی مصیبتیں بھی ہوتی ہیں، تو ارادہ ترک کیا۔ اگر ان کی نظر نثری نظم پر ہوتی تو شاید اپنا رخ افسانے کی جانب نہیں موڑتے۔ بہرحال جب وہ افسانے لکھنے بیٹھتے تو وہ ناول بن جاتا اور جب ناول لکھنے کا قصد کرتے تو کرداروں کا بارہ جڑی بوٹیوں والا چورن

بنتا بالکل ویسے ہی جیسے آج کل ہمارے سیاستدانوں نے ہمارا بنایا ہوا ہے۔

ساری صورت حال کا بغور جائزہ لے کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں اپنی موروثی روایت سے انحراف کر کے غزل لکھنی چاہئے کیونکہ برص کا جو سفید داغ ہمارے خاندان کے ماتھے پر لگا ہے اسے ٹھیک کرنے کا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ دادا جان مرحوم کی وفات کے بعد ان کی روح کو غول بیابانی بننے سے بچانے کے لئے اور والد صاحب کی جھکی ہوئی گردن کو سیدھا کرنے کا اور کوئی طریقہ کارگر نہیں ہوسکتا۔

اب ہم نے باضابطہ شاعری سے متعلق ڈیڑھ درجن کتابیں یونیورسٹی کی اقبال لابریری سے منگوائی۔ کتابوں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ان کو کبھی کھولنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی ہے جس سے یک گونہ طمانیت ہوئی کہ یہ اَن چھوئی کتابیں ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی کہ میں نے استفادہ کرتے ہوئے کن کن تحریروں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ جب میں نے کتابوں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ شروع کر دیا تو ورق گردانی کے دوران ہی حواس باختہ ہوگیا اور یہ انکشاف ہوا کہ شاعری کی اوقات کیا ہے۔ شاعری میں موضوعات اگرچہ بغیر ٹیکس ادا کئے منتقل کئے جاسکتے ہیں لیکن ردیف و قافیہ اور بحر و وزن پسینے کی بجائے خون کا تقاضہ کرتے ہیں۔، بہر حال، اس کا حل ہم نے ایسے نکالا کہ طرح طرح کی ڈکشنریاں خریدی، جن میں ردیف وقافیہ کے ہم وزن لفظ ریڈی میڈ ملتے ہیں، ڈکشنری کے مطالعہ سے راتوں کی نینداور دن کا آرام حرام ہوکر رہ گیا۔ اب تو میں لفظوں کے گورکھ دھندے میں ایسا الجھ کر رہ گیا کہ لوگ مجھے ڈکشنری کے Nick Name سے پکارنے لگے۔ جہاں بھی جاؤں صرف لفظوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہتی ہیں جیسے لفظ رٹتے رٹتے منہ سے زبان بھی غائب ہوگئی ہو۔

جب باقاعدہ غزل لکھنے کا موقع آیا تو پہلے ڈکشنری سے قافیہ اور ردیف

نکالنے کا کام کیا تا کہ غزل لکھنے میں آسانی محسوس ہو۔اب صرف وزن کا معاملہ درپیش تھا۔وزن سے مجھے اپنا وزن یاد آیا کہ اس وادئ خارزار میں قدم رکھنے کے صرف سے چند ماہ کے اندر یہ وزن 45 کلوتک پہنچ گیا حالانکہ ابھی میں نے کوئی غزل مکمل نہیں لکھی تھی بلکہ صرف تک بندیاں کی تھیں۔اگر ہمارے وزن گھٹانے کی ترکیب ہماری خواتین کے پلے پڑ جائے تو ہزاروں روپیوں کی بچت ہوگی جو وہ ڈاکٹروں کے چکر لگا کر ناحق شوہروں کی جیبیں ہلکی کرتی رہی ہیں۔

اب جوں ہی ہم وزن سیکھنے کے لئے کسی لائق استاد کی تلاش میں نکلے تو کوئی وزن دار استاد نہ مل سکا۔اب جو ملے تو انہوں نے اپنے گھر کی وزنی چیزیں ڈھونے کے کام پر مامور کر دیا جس طرح ہماری دانش گاہوں میں پروفیسر صاحبان ریسرچ اسکالروں کو سبزی ترکاری خریدنے کے کام پر لگا دیتے ہیں۔بہرحال چارو ناچار اس تجربے سے بھی گزرنا پڑا۔تبھی جا کر انہوں نے فاعلاتن فاعلاتن کی گردان کروانا شروع کیا۔گردان شروع کرتے ہی میرے دانت بجنے لگے اور گلے میں خراش سی پیدا ہونے لگی۔اس کے باوجود ہم نے ہمت نہیں ہاری اور وزن کا وزن ڈھوتے رہے۔اس طرح وزن سیکھتے سیکھتے ''و'' غائب ہو کر ہم خود میں ''زن'' کی کیفیت محسوس کرنے لگے۔بدن تو چھریرا ہو ہی گیا تھا اب آواز میں بھی لچک پیدا ہونے لگی اور کمر کے بند ڈھیلے پڑنے کی وجہ سے چال ڈھال میں نسوانی پن آنے لگا۔اب یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ ناقدانِ ادب ''غزل'' کو عورتوں سے باتیں کرنے کے معنی میں کیوں لیتے ہیں۔

بہرحال، جب یہ کٹھن مرحلہ طے کر کے بھی ہم وزن سیکھتے سیکھتے رہ گئے تو ہماری زبان پر بے ساختہ یہ شعر وارد ہوا۔۔۔۔

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات
شعر می گویم بہ از قند و نبات

''شیرازہ اردو''

کی بعض اہم خصوصی اشاعتیں

- سمپوزیم نمبر
- پنڈت جواہر لال نہرو نمبر
- مورخ حسن نمبر
- منشی پریم چند نمبر
- غالب نمبر
- شیخ العالم نمبر
- شاہ ہمدان نمبر
- صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر
- غلام محمد صادق نمبر
- نوجوان نمبر
- فخر کشمیر نمبر
- عبدالاحد آزاد نمبر
- غلام رسول نازکی نمبر
- میکش نمبر
- عمر مجید نمبر
- شمیم احمد شمیم نمبر
- ثقافت نمبر
- محی الدین قادری زورؔ نمبر
- محمد الدین فوق نمبر
- ڈاکٹر سر محمد اقبال نمبر
- عجائبات نمبر
- لل دید نمبر
- سمینار نمبر
- شیر کشمیر نمبر
- افسانہ نمبر
- شاعر کشمیر مہجور نمبر
- مغل اور کشمیر نمبر
- حامدی کاشمیری نمبر
- غلام رسول سنتوش نمبر
- عرش صہبائی نمبر
- بخشی غلام محمد نمبر
- محمد یوسف ٹینگ نمبر

- پشکر ناتھ نمبر
- محمد یاسین بیگ نمبر
- جموں وکشمیر، لداخ نمبر (۱۱ جلدیں)
- حکیم منظور نمبر
- تاجران کتب نمبر
- ظہورالدین نمبر
- رفیق راز نمبر
- غلام نبی خیال نمبر
- فرید پربتی نمبر
- عبدالرحمان مخلص نمبر
- پی۔این۔کے بامزئی نمبر
- ترنم ریاض نمبر
- نور شاہ نمبر
- سفرنامہ نمبر (۲ جلدیں)
- عبدالغنی شیخ نمبر
- رحمان راہی نمبر

●●●

سالنامہ ''ہمارا ادب''

کی بعض خصوصی اشاعتیں

☆......لوک ادب نمبر

☆......مشاہیر کشمیر نمبر (۲ جلدیں)

☆......شیرازہ انتخاب نمبر

☆......شخصیات نمبر (۵جلدیں)

☆......اولیاء نمبر (۵جلدیں)

☆......ڈوڈہ نمبر

☆......مولانا رومی نمبر

☆......ہمعصر تھیٹر نمبر

☆......فیض احمد فیض نمبر

☆......سعادت حسن منٹو نمبر

☆......کرشن چندر نمبر

☆......تنقید نمبر

☆......فن افسانہ نگاری نمبر (۲ جلدیں)

☆......فن ترجمہ نگاری نمبر

☆......فن نظم نگاری نمبر (۲ جلدیں)

●●●